اردو

جلد ۹ جنوری سنہ ۱۹۲۹ع حصہ ۳۳

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

یادگارِ مولانا شرر مرحوم

دو سالانہ انعام

زبانِ اردو کے محسن مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم کی یادگار میں جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے، سکرٹری انجمن ترقیِ اردو، اور جناب مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ نے حسبِ ذیل دو سالانہ انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے —

(۱) "عطیۂ عبدالحق"

رسالۂ اردو کے سال بھر کے مضامین نثر میں اول درجے کے سب سے اچھے مضمون پر ۱۲۵ روپیہ کلدار کا انعام جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے عطا فرمائیں گے —

(۲) "عطیۂ ہاشمی"

کے نام سے دوسرا انعام ۱۰۰ روپیہ کلدار کا، مولوی سید ہاشمی صاحب اُن صاحب کی نذر کریں گے جن کی نظم رسالۂ اردو کے سال بھر کی نظموں میں سب سے اچھی اور اعلیٰ درجے کی ہوگی —

ہر سال کے اخیر مہینے میں جو حضرات اہل سمجھے جائیں گے اُن کی خدمت میں رقم ارسال کر کے رسالے میں اس کا اعلان ہوتا رہے گا۔ انعام کی اہلیت کا فیصلہ صرف معطیان کی متفقہ رائے پر منحصر ہو گا —

المعلن

مدیر رسالۂ اردو اورنگ آباد دکن

سائنس

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے ۔ دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہونگے ' ان کو کسی قدر تفصل سے بیان کیا جائے - ان تمام مسائل کو حتی‌الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی - اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے سائنس دانوں کے علاوہ یورپ کے فضلا نے بھی اس رسالے میں مضمون لکھنا منظور فرمایا ہے - اس رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوا کریں گے —

سالانہ چندہ آٹھ روپے سکۂ انگریزی (نو روپیہ چار آنے سکۂ عثمانیہ) —

امید ہے کہ اردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

خواجہ حافظ شیرازی

از

(جناب بشیر احمد ڈار صاحب ' بی اے کلاس ' اسلامیہ کالج لاہور)

خواجہ حافظ کے حالات باوجود ان کی بے انتہا شہرت کے پردۂ تاریکی میں چھپے ہوے ہیں - ہمیں ان کی زندگی کے کئی ایک پہلوؤں سے بالکل ناواقفیت ہے ' چنانچہ میں مندرجۂ ذیل صفحات میں ان میں سے چند ایک پہلوؤں پر اپنی وسعت کے مطابق روشنی ڈالتا ہوں —

خواجہ حافظ کے متعلق آج تک جتنی کتابیں نکل چکی ہیں ' ان میں سے سب سے زیادہ اچھی حافظ اسلم کی کتاب " حیات حافظ " ہے - اس کتاب میں مصنف نے نہایت محنت سے تمام مواد کو یکجا جمع کر دیا ہے ' لیکن باوجود اس محنت و کاوش کے اس میں چند ایک غلطیاں موجود ہیں —

پھر اس کے بعد مولانا شبلی مرحوم نے خواجہ حافظ کے حالات شعرالعجم جلد دوم میں لکھے ہیں - اگرچہ " شعرالعجم " " حیات حافظ " سے پہلے کی تصنیف ہے لیکن چونکہ مؤخرالذکر میں شعرالعجم سے زیادہ وضاحت سے حالات لکھے گئے ہیں ' اس لئے میں نے اسے مقدم سمجھا —

انگریزی میں مسٹر براؤن نے اپنی تاریخ ادب ایران کی تیسری جلد میں " حافظ " کی زندگی کے حالات درج کئے ہیں لیکن ہماری موجودہ معلومات میں کچھہ زیادہ اضافہ نہیں ہوتا . بلکہ وہ تمام کا تمام شعرالعجم سے ماخوذ ہے ' جیسا کہ خود مصنف نے تصریحاً بیان کر دیا ہے —

ان کتابوں کے علاوہ چند اور کتابیں یا رسالے موجود ہیں جو زیادہ قابل ذکر نہیں —

(۱) خواجہ حافظ کی تاریخ پیدایش و عمر

خواجہ حافظ کی ولادت کے متعلق ہمارے پاس کوئی مسلم رائے موجود نہیں، اگرچہ یہ ابھی مانا جاچکا ہے کہ ان کی وفات سنہ ۷۹۱ ھ میں ہوئی • —

• ان کی وفات کے متعلق دو قول مشہور ہیں - (۱) ایک گروہ سنہ ۷۹۱ ھ کہتا ہے اس میں دیباچۂ محمد گلندام سب سے زیادہ قابل ذکر ہے (۲) دوسرا گروہ سنہ ۷۹۲ ھ قرار دیتا ہے اس میں حبیب السیر، نفحات الانس وغیرہ شامل ہیں - اگرچہ ایک سال کے فرق سے کچھ زیادہ نقصان نہیں، لیکن کوشش کرنی چاہئے کہ کونسی تاریخ زیادہ اصح ہے۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق ہمیں دیباچۂ محمد گلندام میں دونوں تاریخیں ملتی ہیں —

(۱) چراغ اہل معنی خواجہ حافظ — کہ شمعے بود از نور تجلی
چو در خاک مصلی یافت منزل — بجو تاریخش از خاک مصلی

حساب ابجد کے لحاظ سے مصلی کی یا تو ے گنی جائیگی یا الف۔ اگر الف گنا جائے تو سنہ ۷۸۲ ھ ہوتے ہیں جو ٹھیک نہیں کیونکہ 'حافظ' منصور کی تخت نشینی کے وقت جو سنہ ۷۸۹ ھ میں ہوئی ہے، موجود تھا - اگر ے گنی جائے تو سنہ ۷۹۱ ھ نکلتے ہیں —

(۲) بہ سال باو صاد و ذال ابجد — ز دور ہجرت میمون احمد
بہ سوے جنت اعلی رواں شد — فرید عہد شمس الدین محمد

اس حساب سے اس کی تاریخ وفات سنہ ۷۹۲ ھ نکلتی ہے —

لیکن کیا یہ امر قابل غور نہیں کہ ایک ہی شخص جس نے خود اپنی آنکھوں سے خواجہ حافظ کا جنازہ نکلتے دیکھا ہو وہ ہمیں دو مختلف تاریخیں بتائے - اس لئے ہمیں یقین ہے کہ دوسرا قطعۂ تاریخ غلط ہے اور بعد میں دیباچے میں داخل ہوگیا ہے - اس بیان کے لئے ہمارے پاس تین شہادتیں موجود ہیں —

(۱) ایک تو خود صاحب دیباچہ کی، جس نے ان دونوں قطعات تاریخ سے پہلے صاف طورپر عبارت میں لکھا ہے کہ "......تاور تاریخ احدی و تسعین و سبعمائۃ، ہجری در یمن حیات بہ موکلان قضا و قدر سپرد" اب اس سے خود اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ قطعۂ

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

(۱) میرزا فرصت شیرازی اپنی کتاب تاریخ ایران مسمی آثار عجم میں رقمطراز ہیں کہ حافظ نے چھیالیس برس کی عمر پائی-اس حساب سے ان کی تاریخ پیدائش سنہ ۷۴۵ ھ ہوتی ہے —

لیکن یہ تاریخ کسی طرح بھی قابل تسلیم نہیں - ہمیں دیوان میں ایک قطعہ ملتا ہے :—

سرور اہل غنائم ' شمع جمع انجمن' صاحب صاحبقران حاجی قوام الدین حسن

هفصد وپنجاہ وچار ازهجرت خیرالبشر مہر را جوزا مکان و ماہ راخوشہ وطن ●

یہ قطعہ جیسا کہ اس سے ظاہر ہے ' سنہ ۷۵۴ ھ کی تصنیف ہے' جب کہ حاجی قوام الدین حسن' وزیر ابواسحق ' عین لڑائی کے موقع پر فوت ہوا تھا —

پس مرزا صاحب کے خیال کے مطابق خواجہ حافظ نے یہ قطعہ نو برس کی عمر میں تصنیف کیا ' جو بالکل خلاف قیاس ہے - اس کے علاوہ دیوان میں کئی ایک غزلیں سنہ ۷۵۴ ھ سے پہلے کی موجود ہیں - جن کا ذکر بعد میں آئیگا —

(۲) حافظ محمد اسلم ' خواجہ صاحب کی تاریخ پیدائش سنہ ۷۱۵ ھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵۴)

تاریخ زیادہ اہمیت رکھتا ہے یا اسی مصنف کی یہ عبارت (ب) -ہمیں اسی تاریخ کی گواہی دو اور کتابوں سے بھی ملتی ہے - دونوں کتابیں' روایت کے لحاظ سے صحیح کا درجہ رکھتی ہیں- ان میں سے پہلی کتاب میخانہ ہے' جس میں صاف طور پر تاریخ وفات " خاک مصلی " درج ہے' دوسری کتاب ہفت اقلیم امین رازی ہے' جس کا ایک صاف اور صحیح نسخہ پروفیسر شیرانی صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے- اس میں بھی حافظ کی تاریخ وفات سنہ ۷۹۱ ھ موجود ہے —

● دیکھو دیوان حافظ مطبعہ نامی پریس کانپور سنہ ۱۹۲۰ ھ - صفحہ ۴۴۸ —

تحریر فرماتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :—

"ان کی زندگی کے حالات پر نظر ڈالتے ہوئے یہ تخمینہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی ولادت سنہ ۷۱۵ ھ میں ہوئی ہوگی۔ کیونکہ جس وقت وہ تعلیم سے فارغ ہوئے اور شیراز میں ان کی علمی لیاقت کا شہرہ ہوا تو حاجی قوام الدین حسن وزیر نے ایک مدرسہ خاص انہیں کے لئے قائم کیا تا کہ اس میں وہ طلبا کو فقہ و تفسیر پڑھائیں۔ یہ مدرسہ سنہ ۷۴۵ ھ میں قائم ہوا تھا۔ اس لئے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ایسی لیاقت اور شہرت کے لئے جو ایک مدرسہ بنا نے کی سفارش کرے کم سے کم تیس برس کی عمر چاہئے" —

حیات حافظ با رسوم مطبوعۂ فیض عام علیگڈھ۔ صفحہ ۷ و ۸ —

اس بیان میں تاریخ ولادت کی غلطی کے علاوہ ایک اور غلطی بھی موجود ہے۔ یہ واقعی مشہور ہے کہ حاجی قوام نے خواجہ صاحب کے لئے ایک مدرسہ شیراز میں بنایا تھا۔ لیکن یہ غلط محض ہے۔ روضۃ الصفا اور حبیب السیر میں سنہ ۷۴۵ ھ کے واقعات کے تحت میں کوئی بات ایسی نہیں ملتی۔ دونوں مصنف خواجہ صاحب سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ روضۃ الصفا میں کئی جگہ حافظ کے شعر ان کے نام سے درج ہیں' اور حبیب السیر میں باقاعدہ حافظ کا حال لکھا ہے —

اس مدرسے کا حال البتہ دیباچۂ محمد گلندام میں ضرور ملتا ہے۔ صاحب دیباچہ لکھتا ہے: —

"ولے محافظت درس قرآن و ملازمت شغل سلطان و تحشیۂ کشاف و مصباح و مطالعۂ مطالع و مفتاح و تحصیل قوانین ادب و تجسس دواوین عرب از جمع

ابیات و غزلیاتش سانع آمدے .... مسود ایں اوراق عفی اللہ عنہ ما سبق اقل انام محمد گلندام در درس گاہ مولانا و سید نا استاد البشر قوام الملۃ و الدین عبداللہ اعلی اللہ تعالی در جاتہ فی اعلی علیین بکرات و مرات کہ بمذاکرہ رفتے'در اثناے محاورہ (بہ حافظ) گفتے کہ ایں فوائد فرائد را همہ در یک عقد می باید کشید ...... "

اس بیان سے معلوم ہو تا ہے کہ خواجہ حافظ کا تعلق واقعی ایک مدرسہ سے تھا - لیکن وہ مدرسہ حاجی قوام کا بنایا ہوا نہ تھا - حاجی قوام الدین حسن اور مولانا قوام الدین عبداللہ دو مختلف اشخاص ہیں - پہلا شخص شاہ ابواسحق (سنہ ۷۴۲ ھ - سنہ ۷۵۴ ھ) کا وزیر تھا' جو سنہ ۷۵۴ ھ میں فوت ہو جاتا ہے - یہ خواجہ صاحب کے پہلے مربی تھے - اور خواجہ صاحب نے ان کی وفات پر ایک قطعہ تصنیف کیا تھا جس کا ذکر اوپر ہوچکا ہے —

مولانا قوام الدین عبداللہ شاہ شجاع (سنہ ۷۶۰ھ سنہ ۷۸۶ ھ) پسر مبارزالدین مظفر کے عہد میں تھے' جن کو شاہ شجاع نے شیراز میں اس متذکرۂ بالا مدرسے کی باگ عنایت فرمائی تھی - اور محمد گلندام اسی مدرسے میں حافظ کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں —

روضۃالصفا میں سنہ ۷۷۰ ھ کے واقعات کے تحت میں لکھا ہے :—

" ... و(شجاع) پیش °° استاد البشر مولانا قوام الدین عبداللہ ' فقیہ شرح مختصر ابن حاجب افتتاح کرد " —

اس بیان سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مولانا قوام الدین عبداللہ جن کا ذکر صاحب دیباچہ کر رہا ہے ' وہی شخص ہے جس کا ذکر صاحب روضۃالصفا نے سنہ۷۷۰ھ کے واقعات میں کیا ہے - کیونکہ دونوں ' استاد البشر ' کا لقب استعمال کرتے ہیں ٭—

اب ہمیں اصل واقعے کی طرف رجوع کرنا چاہئے —

٭ نیز دیکھو حبیب السیر صفحہ ۳۷ بعد از وفات شاہ شجاع —

جیسا کہ مولانا "اسلم" کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، ان کی تاریخ ولادت محض ایک قیاس پر مبنی ہے - اور تاریخ میں قیاس کا کچھ کام نہیں —

اب ہمیں تاریخ اور دیوان دونوں سے مدد لینی چاہئے —

جیسا کہ تواریخ مثلاً روضۃ الصفا - فارس نامۂ ناصری - شیراز نامہ • وغیرہ) سے معلوم ہوتا ہے، شیراز میں سنہ ۷۳۲ ھ ، یا بقول بعضے سنہ ۷۴۳ ھ) سے پہلے وہ ہنگام اور شور و شر تھا کہ خدا کی امان- خاندان "اِنجو" کے شہزادے آپس میں لڑ رہے تھے - حتی کہ سنہ ۷۴۲ ھ میں میر حسین "جوینانی" اور ملک اشرف (بن تیمور تاش بن امیر چوپان) کا فتنہ بر پا ہوتا ہے اور آخر کار شیخ ابواسحق پسر محمود اِنجو شیراز پر مکمل طور سے حکمراں ہو جاتا ہے - اور پھر سنہ ۷۵۴ ھ تک شیراز میں پورا امن رہتا ہے - یہ تمام فسادات سلطان "ابوسعید" کی وفات کے بعد جو سنہ ۷۳۶ ھ میں ہوتی ہے، واقع ہوتے ہیں —

اب اگر ہم جیسا کہ "حافظ اسلم" کا خیال ہے، حافظ کی پیدائش سنہ ۷۱۵ ھ تسلیم کرلیں تو ہمیں ایک دقت پیش آتی ہے - سنہ ۷۳۵ ھ میں اس لحاظ سے حافظ کی عمر بیس برس کی ہوگی - اور تمام دنیا کے جوان آدمی بیس برس کی عمر میں بخوبی سمجھ دار ہوتے ہیں اور خاص کر حافظ جیسا شخص جو قدرت سے شاعر بنا یا گیا تھا - اس لئے ضروری ہے کہ "حافظ" ان واقعات کی طرف اشارہ کرتے - پھر سنہ ۷۳۵ ھ سے لے کر ۷۴۲ ھ تک سات سال کا وقفہ ہوتا ہے - اس عرصے میں بھی شیراز میں بے انتہا شور و شر موجود تھا - لیکن دیوانِ حافظ میں ہمیں ان واقعات کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے، اس لئے صاف ظاہر ہے کہ "حافظ" کی پیدائش سنہ ۷۱۵ ھ کے بہت عرصے بعد ہوئی ہوگی —

اب ہم دیوان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں - دیوان میں دو غزلیں ہیں —

• بہ حوالۂ انسا ئکلو پیڈیا اسلام —

(۱) دیدم بخواب دوش که بدستم پیاله بود | تعبیر رفت و کار بدولت حواله بود
چل سال رنج و غصه کشیدیم و عاقبت | تدبیر ما بدست شراب دو ساله بود
آں شاہ تند حملہ که خورشید شیر گیر | پیشش بروز معرکه کمتر غزاله بود
دیدم که شعر دلکش 'حافظ' به مدح شاہ | هر بیت زاں سفینه به از صد رساله بود

(دیوان حافظ صفحه ۱۵۳)

(۲) چل سال رفت و بیش که من لاف می زنم | کز چاکران پیر مغاں کمترین منم
در شان من به دُرد کشی ظن بد مبر | کالوده گشت خرقه ولے پاک دامنم
آب و هوائے پارس عجب سفله پرورست | کو همرهے ؟ که خیمه ازیں خاک بر کنم
توران شہ خجسته که در من مزید فضل | شد منت مواهب او طوق گردنم

(دیوان حافظ صفحه ۲۸۳)

اں دونوں غزلوں کی تصنیف میں چند سال کا فرق ہے' کیونکہ ایک میں وہ اپنی عمر چالیس سال بتارہے ہیں اور دوسری میں چالیس سے کچھ زیادہ —

جلال الدین توران شاہ' شاہ شجاع (۷۶۰ - ۷۸۶ھ) کے وزیر تھے —

خواجه قوام الدین المتوفی سنه ۷۶۴ھ شاہ شجاع کے پہلے وزیر کی وفات کے بعد خواجه کمال الدین وزیر ہوتے ہیں اور خواجه کمال الدین کے بعد جلال الدین کی وزارت شروع ہوتی ہے' ان کا زمانۂ وزارت • سنه ۷۷۰ھ سے لے کر ۷۸۹ھ تک ہے اور سنه ۷۸۷ھ میں فوت ہوتے ہیں' جیسا که خود خواجه حافظ کہتے ہیں:-

آصف عہد زماں' جاں جہاں توران شاہ
آنکه میلش سوے حق بینی و حق گوئی بود | سال تاریخ وفاتش طلب از "میل بہشت" ۷۴۸ھ

(دیکھو دیوان حافظ صفحه ۴۴۸)

• دیکھو فارس نامۂ ناصری —

اس احاطہ سے صاف ظاہر ہے کہ دوسری غزل جس میں توران شاہ کا ذکر ملتا ہے سنہ ۷۷۰ھ کے بعد کی تصنیف ہے —

لیکن اگر مولانا اسلم کے بیان کو ٹھیک سمجھا جائے تو اس غزل کی تاریخ ۱۱۵ + ۴۰ (یا ۴۴ چونکہ "چل سال بیش" سے یہی مراد ہوسکتی ہے) یعنی سنہ ۷۰۰ھ نکلتی ہے' جو بلحاظ تاریخ بالکل غلط ہے —

لیکن ہم پورے طور سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ غزل سنہ ۷۷۰ھ اور سنہ ۷۸۷ھ کے درمیانی عرصے میں کسی خاص سن میں لکھی گئی ہے - اگر فرض کرلیا جائے کہ یہ غزل کم از کم ۷۷۷۰ ہی کی ہے تو پینتالیس منہا کرلے سے ۷۲۵ھ کا سن نکلتا ہے - بس اس سے صاف ظاہر ہے کہ حافظ کسی طرح بھی سنہ ۷۲۵ھ سے پہلے پیدا نہیں ہوے —

دوسری طرف جیسا کہ پہلے دکھایا جاچکا ہے سنہ ۷۲۵ ان کی تاریخ پیدائش قائم کرنا غلط ہے - اسی طرح اگر ۷۴۰ھ مانا جاے تو وہ قطعہ جو حافظ نے حاجی قوام کی وفات پر لکھا ہے چودہ برس کی عمر کا ہوگا' اس کو بھی ہم مان نہیں سکتے ' کیونکہ ہمیں دیوان میں دو تین غزلیں ایسی ملتی ہیں جو انھوں نے حاجی قوام کی زندگی ہی میں لکھیں اور پھر ان غزلوں کی زبان صاف بتاے دیتی ہے کہ یہ کسی مبتدی کی نہیں - میں ان دونوں غزلوں کو ذیل میں درج کرتا ہوں :-

(۱) ساقی بہ نور بادہ بر افروز جام ما — مطرب بگو کہ کار جہاں شد بہ کام ما
ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم — اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما
ترسم کہ صرفۂ نبرد روز باز خواست — نان حلال شیخ ز آب حرام ما
اے باد اگر بہ گلشن احباب بگذری — زنہار عرضہ دہ بر جاناں پیام ما
دریاے اخضر فلک و کشتی ہلال — ہستند غرق نعمت "حاجی قوام" ما

(دیکھو دیوان حافظ صفحہ ۳۸ - ۳۹)

(۲) عشق بازي و جوانی و شراب لعل فام — مجلس انس و حریف ہمدم و شرب مدام

ساقی شکر دہان و مطرب شیریں سخن — ہم نشیں نیک کردار و ندیم نیکنام
شاہدے در لطف پاکی ہمچو آب زندگی — دلبرے در حسن و خوبی غیرت ماہ تمام
بادہا گلرنگ وتلخ وتر وخوشخوار و سبک — نقلی از لعل نگار و نقلی از یاقوت جام
بزمگاہ دل نشیں چون قصر فردوس بریں — گلشنے پیرامنش چون روضۂ دارالسلام
غمزۂ ساقی بہ یغماے خرد آہختہ تیغ — زلف دلبر از براے صید دل گستردہ دام
ہر کہ این صحبت بجوید خوشدلی بروے حلال — وانکہ این عشرت نخواہد زندگی بروے حرام
نکتہ دانی بذلہ گو چون 'حافظ' شیریں سخن — بخشش آموزے جہان افروز چون 'حاجی قوام'

(دیکھو دیوان صفحہ ۳۰۱' ۳۰۲)

یہ غزلیں دیکھتے ہوے کوئی شخص یہ قیاس نہیں کرسکتا کہ یہ دس یا بارہ برس کی عمر کی تصنیف ہوں گی - کیونکہ ان کی تصنیف کا زمانہ سنہ ۷۵۰ھ کے لگ بھگ ہونا چاہیے- لیکن اگر ہم دس برس اور پیچھے ہوجائیں اور خیال کریں کہ ان کی تاریخ ولادت سنہ ۷۳۰ ھ کو ہوئی تو اس لحاظ سے ان دونوں غزلوں کی تصنیف کا زمانہ وہ وقت ہوگا جب کہ حافظ کی عمر بیس برس کے لگ بھگ ہوگی - کیونکہ ہم ان غزلوں کو حافظ کی ابتدائی مشقوں سے بھی نہیں کہہ سکتے- اور جب ہم ان کا مقابلہ ان کی پہلی ابتدائی غزل سے' جو اتفاق سے ہمیں ان کے دیوان میں ملتی ہے • کرتے ہیں تو فوراً معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزلیں اچھی عمر میں یعنی بیس یا پچیس سال کی عمر میں لکھی گئی ہوں گی—

چنانچہ اب ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حافظ کی تاریخ ولادت سنہ ۷۲۵ ھ اور سنہ ۷۳۰ ھ کے درمیان کسی سال میں ہوی ہوگی —

اس نتیجے کی شہادت کے لئے ہمارے پاس سب سے زیادہ زور آور تائید میخانہ کی ہے اس میں حافظ کی عمر پینسٹھ برس کی لکھی ہے' یعنی اس لحاظ

• دیکھو صفحہ ۳۵ دیوان حافظ

سے حافظ کی تاریخ ولادت سنہ ۷۲۶ ھ نکلتی ھے - جو میرے خیال میں بالکل ٹھیک ھے --

(۲) خواجہ حافظ اور شاخ نبات

تعجب یہ ھے کہ ایشیاکے لوگ خواجہ صاحب کو مقدس بزرگ سمجھتے ھیں اور پھر ان کے نام وہ وہ قصے مشہور کئے ھیں کہ توبہ - ان سے معلوم ھوتا ھے کہ خواجہ صاحب شاید رند دامن آلودہ تھے --

منجملہ ان قصص کے ایک قصہ شاخ نبات کا ھے - یہ قصہ اتنا مشہور ھوا ھے کہ تمام لغت کی کتابوں میں شاخ نبات کو شیرازی معشوقہ قرار دیا گیا ھے - ایک دفعہ رسالۂ مخزن میں کسی شخص نے شاخ نبات کے متعلق مضمون لکھا تھا جسے میں مختصر کر کے ذیل میں لکھتا ھوں :--

خواجہ صاحب کی اصل ' سرکان ' سے ھے جو ' نہاوند ' کے قریب ایک مشہور قصبہ ھے• - ان کے جد امجد سرکان سے آکر شیراز میں بسے - ان کا پوتا شمس الدین محمد جنوری سنہ ۱۳۰۰ عیسوی میں پیدا ھوا - ان کے باپ دادا شیراز کے قاضی تھے - اس لئے بچپن ھی میں عربی علوم و فنون اور قرآن مجید کے حفظ کرنے میں جان لڑادی اور ابھی اچھی طرح جوان بھی نہ ھوے تھے کہ سب علمی مدارج طے کرلیے - ان کے والد بہت خوش ھوے اور انھیں اجازت دی کہ چند دن کے لئے سیر و تفریح کرلیں - اسی اثنا میں ان کی نظر ایک رنگتی شاخ نبات پر جا پڑی

• قوے اور سرکان اُس وقت ایک مختصر آبادی کا نام تھا جو شہر نہاوند سے شمال کی جانب واقع تھی' نہاوند حدود ھمدان میں اس وقت تک موجود ھے --

جس کو دیکھتے ھی ان کا دل قابو سے جاتا رھا، پہلے تو کچھ دن تک خاموش رھے لیکن تا کے ؟ آخر ایک دن رندوں کی طرح اوپر چڑھ گئے اور اپنا عشق جتا نے لگے —

ش ن - میاں ھم تو بازار کی مٹھائی ھیں جو پیسہ ڈالے گا مزہ پائے گا —

حافظ - پھر آپ کی قیمت کیا ھے ؟ —

ش - ن دیکھئے - شہر کے دروازے کے سامنے جو بڑی ساری چار فرلانگ کے پھیر میں ڈگی ھے - اس کو اشرفیوں سے بھردیجئے، بس پھر میں آپ کی لونڈی ھوں —

حافظ بہت بہتر کہہ کر نیچے اُتر آئے - اور اب ان کو اشرفیوں کے جمع کرنے کی فکر لگی - شیراز کی گلیوں میں بھیک مانگنے لگے - جو کچھ حاصل ھوتا تھا اس میں آ کر ڈال دیتے تھے - لوگ کف افسوس ملتے کہ ایسے شریف خاندان کا لڑکا ایک رنڈی کے ناپاک حسن پر فریفتہ ھوگیا ھے - ھوتے ھوتے وہ قیس عامری کی طرح لاغر ھوگئے -

ایک دن وہ اسی ڈگی کے کنارے پر بیٹھے رو رھے تھے کہ ایک پیر مرد آئے اور کہا : - اے حافظ ! تو دیوانہ ھوگیا ھے، جو اس ڈگی کو سونے سے پر کرنا چاھتا ھے - یہ کبھی پر نہ ھوگی کیونکہ اس کا پردہ پھٹا ھوا اور گہرائی کی کوئی تھاہ نہیں -

حافظ : - حضور کا ارشاد بجا ھے - مگر یار کے کہنے کو نیچے ڈالنا عاشقوں کا کام نہیں —

بزرگ - - اچھا - لیکن اگر بغیر کسی شرط کے تمہیں شاخ نبات مل جائے تو پھر کیا ؟

حافظ : - بس میں آپ کا غلام ھوجاؤں گا —

بزرگ :- اچھا تم بابا کوھی * کے ٹیلے پر جو شہر سے چار میل کے فاصلے پر ھے، جاؤ

---

* بابا کوھی : شیخ علی بابا متخلص بہ "کوھی" شیخ ابوعبداللہ محمد خفیف شیرازی (الملقب بہ شیخ کبیر المتوفی سنہ ۳۷۱ ھ) کے مرید تھے - اور سنہ ۴۴۲ ھ میں فوت اور شیراز میں دفن ھوئے - ان کا دیوان برٹش میوزیم میں ھے - دیکھو حواشی میخانہ صفحہ ۱۶ -

اور متواتر اکتالیس رات تک وہاں چراغ جلاتے رہو —

حافظ : ۔ بہت اچھا —

غرضکہ وہ اسی طرح چالیس دن تک با با کوھی کے ٹیلے پر جا تے رھے ۔ اکتالیسویں دن شاخ نبات دوڑتی ھوی آئی اور اُنھیں اپنے گھر لے گئی ۔ ان کی بھی یہی تمنا تھی ' لیکن ابھی زیادہ بڑھے نہیں تھے کہ انھوں نے دیکھا وھی بزرگ کھڑے ھیں ۔ انھوں نے حافظ کو اکتالیس روز یاد کروائے ۔ حافظ فوراً بھاگ گئے ۔ اس رات بھی معمول کے مطابق وھاں بیٹھے رھے ۔ آدھی رات کو آپ نے دیکھا کہ آسمان سے دروازہ کھلا اور پہاڑ پر مسند آرائی ھوی ۔ پھر ایک سواری آئی اور اس میں حضور پر نور حضرت محمد صلعم بر آمد ھو کر آفتاب جہاں آرا کی طرح اس تخت پر جلوہ افروز ھوے اور حافظ کو بلا کر مبارک باد دی —

جب آپ نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ شاخ نبات آپ کے پہلو میں بیٹھی ھے ۔ خواجہ صاحب نے بیتاب ھو کر گلے میں ھاتھ ڈال دئے مگر خدا جا نے اس ھم آغوشی میں کیا اثر تھا کہ آن واحد میں شاخ نبات اور خواجہ کے حواس ٹھکا نے نہ رھے۔ شراب پینے کا شوق زیادہ بڑھ گیا ۔ پھر اسی ھم آغوشی کی حالت میں شراب خانوں میں جا کر شراب پیتے رھے—

اسی حال میں آپ ایک دن کسی مرغزار میں بیٹھے شاخ نبات کے ساتھ صبوحی اُڑا رھے تھے ' کہ سامنے سے ایک بزرگ تشریف لائے ۔ جس کو دیکھنے کی خواجہ کو تاب نہ ھوی ۔ اور آپ بے قرار ھو کر کھڑے ھو گئے ۔ جب انھوں نے دیکھا کہ وہ بھی انھی کی طرف آ رھے ھیں تو خواجہ بھی استقبال کے لئے اٹھے۔ دونوں ھم آغوش ھوے جب علیحدہ ھوے تو دیکھا کہ وہ بزرگ رحلت کر چکے تھے ۔ ان کی وفات کے بعد ھی خواجہ صاحب کا اس آن واحد میں جذب سلب ھو گیا ۔ اور سلوک کے ٹھنڈے دائرے میں آ گئے ۔ ھوش و حواس ' عقل و خرد سب درست ھو گئے ۔ شاخ نبات کے اوسان بھی ٹھکانے لگے ۔ خواجہ صاحب نے مسجد کے حجرے میں بیٹھ کر یاد الٰہی

میں مشغول ہونا چاہتا تو شاخِ نبات نے ان کا دامن پکڑ لیا اور کہا کہ میں آپ کے قدموں کو چھوڑ کر کہاں جاسکتی ہوں - مجھے آپ نے نفسانی خواہشات سے پاک کر دیا، بس اب میری یہی آرزو ہے کہ جب تک جیوں، آپ کی خدمت بجا لاؤں —

اکتالیس دنوں میں جب وہ پہاڑ پر تمام رات جاگا کرتے تھے، حافظ ایک غزل پڑھا کرتے تھے جس کا مطلع یہ ہے :—

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند   وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

دیوانِ حافظ صفحہ ۱۴۶

لیکن اس تمام قصے کی حقیقت محض افسانہ ہی افسانہ ہے - کوئی تاریخی ثبوت اس کے لئے مہیا نہیں کیا جاسکتا - شاید یہ خیال اسی غزل کے اس شعر سے ماخوذ ہے —

این ہمہ شہد و شکر کز سخنم می ریزد   اجر صبر یست کزاں شاخ نباتم دادند

لیکن اس جگہ 'شاخِ نبات' سے کوئی عورت مراد نہیں بلکہ شیرینی مراد ہے جو 'حافظ' اپنے شعروں میں پاتے ہیں - اسی طرح 'حافظ' نے دو اور جگہوں پر بھی اس لفظ کا استعمال کیا ہے :—

کلک حافظ شکریں شاخ نبا تست بچیں   کہ دریں باغ نہ بینی ثمرے بہتر ازیں

دیگر :- 'حافظ' چہ طرفہ شاخ نبات ست کلک تو   کش میوہ دلپذیر تر از شہد و شکر ست

ان دونوں شعروں سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ حافظ کی مراد صرف 'شیرینیٔ قلم' ہے - ان شعروں کی روشنی میں ہم کسی طرح بھی 'شاخ نبات' کو عورت نہیں تسلیم کر سکتے —

اس کے علاوہ ہمیں یہ الفاظ دوسرے شاعروں کے ہاں بھی ملتے ہیں - مثلاً مولانا روم 'رح' فرماتے ہیں :—

بلبل از عشق ز گل بوسہ طمع کرد و بگفت   بشکن ایں شاخ نبات و دل ما را مشکن

گل بگفتا لب من در خود طفلان نبود   بهم را ابجد و هوّز به و حطی زکلمن

(۲) شاخ نبات کی طرح شاخ قند بھی استعمال ہوتا ہے - مثلاً امیر خسرو (المتوفی سنہ ۷۲۵) فرماتے ہیں :—

به هنگام لب ساغر مزیدن   نسیم خلق آید در دمیدن

به صحرائے شکرنے بند گردد   نبات زهر 'شاخ قند' گردد

(۳) میرزا محسن 'تاثیر' (سنہ ۱۱۳۰ ھ) :—

دل حویش رابه آں بت شیریں بهانه بست

بلبل مگر به 'شاخ نبات' آشیانه بست

دیگر :- سردر هوا مباش که خالیست از نبات   چوب برون شیشه ز شاخ نبا تها

(۴) میرزا عبدالغنی 'قبول' —

خط چرا از لب لعل تو دمید   گرنداره بت من شاخ نبات

(۵) 'زبور عجم' میں ہے :—

از محبت جذبه‌ها گردد بلند   ارج می گیرد از و نا ارجمند

اهل دل را سینۀ 'سینا' دهد   با هنر مندان ید بیضا دهد

پیش او بر ممکن و موجود مات   جمله عالم تلخ و او شاخ نبات

دیکھو صفحہ ۲۶۴ —

اب اگر ہم شاخ نبات کو صرف حافظ ہی کا معشوق ٹھہرائیں تو بڑی بے انصافی ہوگی- یہ وہ معشوقہ ہے جس کے عاشق مولانا روم ساتویں صدی میں، امیر خسرو اور حافظ آٹھویں صدی میں، 'محسن' تاثیر' بارھویں صدی میں اور 'اقبال' موجودہ زمانے میں ہیں —*

---

*دیکھو دیوان شمس تبریز لکھنؤ سنہ ۱۳۲۹ ھ ـ صفحہ ۲۸۳ —

(۳) حافظ اور تیمور

کہا جاتا ہے کہ جب 'تیمور' شیراز میں آیا تو اس نے خواجہ صاحب کو بلاکر پوچھا کہ میں نے تمام دنیا کو فتح کرنے کا عزم اس لئے کیا ہے کہ اپنے شہر سمر قند کو سنواروں اور تم اسے اپنے دوست کے ایک خال کے بدلے دئے ڈالتے ہو - چنانچہ تمھارا یہ شعر ہے :—

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
به خال هندوش بخشم سمر قند و بخارا را

اس کی کیا وجہ ہے ؟ خواجہ صاحب پکار اُٹھے کہ حضور اسی غلط بخشی کا تویہ نتیجہ ہے کہ میں اس غربت میں پھنسا ہوا ہوں - تیمور اس حاضر جوابی سے بہت خوش ہوا اور اُنھیں معاف کردیا - لیکن یہ واقعہ قابل غور ہے —

سب سے پہلے یہ واقعہ دولت شاہ کے تذکرے میں درج ہوا - اس کے بعد عموماً تمام تذکروں نے اسی کی پیروی کی - 'آتشکدے' میں بھی اسی طرح یہ قصہ ملتا ہے - لیکن کئی تذکروں میں کچھ اور اضافہ بھی کیا گیا ہے - نگارستان فارس میں لکھا ہے کہ امیر تیمور نے چاہا تھا کہ میرے وقائع تاریخ کو حافظ صاحب اپنے قلم فصاحت سے تحریر کریں لیکن اُن کی آزادی طبیعت نے گوارا نہ کیا * —

میخانے میں لکھا ہے :—

" دیگر به تحقیق پیوسته که بخدمت امیر کبیر امیر تیمور رسیده اند و امیر را با ایشاں التفات بے نهایت بوده † " —

قصے کی بابت کوئی اشارہ نہیں کیا گیا —

موجودہ زمانے میں صرف انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مؤلف نے اس قصے سے

---

* نگارستان فارس - صفحه ۷۶ ـ تذکرهٔ حافظ —
† میخانه صفحه ۸۳ - تذکرهٔ حافظ —

انکار کیا ھے ۔ لیکن اس کے انکار کی وجہ بالکل بے سروپا ھے - وہ کہتا ھے کہ تیمور نے شیراز پرسنہ ۷۹۵ ھ میں حملہ کیا' لیکن حافظ سنہ ۷۹۱ ھ میں فوت ہوچکے تھے ۔ لیکن تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ھے کہ تیمور نے سنہ ۷۸۹ ھ میں بھی شیراز پر حملہ کیا تھا —

چنانچہ حافظ اسلم نے اسی بنا پر اس قصے کو تسلیم کیا ھے —

لیکن اگر ذرا زیادہ غور کیا جائے تو اس قصے کی اصلیت ظاہر ہو جائے گی -

تیمور کے حالات معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس حبیب السیر' روضۃ الصفا' ظفر نامہ شرف‌الدین یزدی اور تزک تیموری ابو طالب * ہیں - ان تمام کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ھے کہ یہ قصہ محض یار لوگوں کی دل لگی کے لئے لکھا گیا ھے - سنہ ۷۸۹ ھ کے تحت میں نہ روضۃ الصفا اور نہ ظفر نامہ میں کسی قسم کی ملاقات کا ذکر ھے ۔ تزک تیموری کے واقعات کو اگرچہ ہم اچھی طرح تسلیم نہیں کرسکتے † ' لیکن اس میں بھی یہ واقعہ درج نہیں - اس لئے زیادہ صحیح یہی ہو گا کہ ہم اس واقعے کی اصلیت سے انکار کردیں --

اس کے علاوہ اگر امیر تیمور اور حافظ کے تعلقات جیسا کہ میخانے میں ھے ' خوش گوار ہوتے تو یقینی بات ھے کہ حافظ اس کا تذکرہ کرتے ۔ لیکن دیوان میں کہیں اس کا ذکر نہیں ملتا —

مولانا شبلی بھی اسی غلطی میں مبتلا ہو گئے - چنانچہ اُنہوں نے بھی شعرالعجم میں اس واقعے کو درج کیا ھے' لیکن اُن سے بڑی غلطی یہ واقع ہوئی ھے کہ اُنہوں نے اس واقعے کو منصور کی وفات کے بعد درج کیا - جو سنہ ۷۹۵ ھ میں ہوئی اور یہ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں —

---

* ان دونوں کتابوں کے قلمی نسخے پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں موجود ہیں —

† یہ کتاب ابو طالب نے تیمور کو شیعہ ثابت کرنے کے لئے لکھی تھی —

(۴) حافظ کا مذہب

"حافظ" کے مذہب کے متعلق بھی آج تک کسی نے تشفی آمیز فیصلہ نہیں کیا۔ ایران میں کسی شخص "محمد دارابی" نے ایک رسالہ "لطائف غیبیہ" میں لوگوں کے اعتراضات کو جو انہوں نے "حافظ" پر کئے تھے رد کیا ہے۔ لیکن یہ رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ صرف مسٹر "براؤن" نے اپنی تاریخ میں اس کا حوالہ دیا ہے —

مجالس المؤمنین مصنفۂ "قاضی نوراللہ شوستری" میں "حافظ" کو شیعہ لکھا گیا ہے۔

شیعوں کا فرقہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ "حضرت علی کرم اللہ وجہہ" اور "حضرت معاویہ" کے درمیان جنگ ہوئی۔ پہلے پہل تو یہ فرقہ کچھ نمایاں حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ تمام ایران میں صرف چند جگہیں تھیں جہاں "شیعہ" موجود تھے۔ چونکہ یہ اصحاب رسول میں سے "حضرت علی" کو برتر سمجھتے تھے" جو اسلام کے اصلی راستے سے دور تھا" اس لئے ان کے ساتھ لوگ بہت کم ملتے جلتے تھے —

بعد میں جب مغول حکمراں ہوئے تو انہوں نے شیعوں کو بالکل کمزوری کی حالت میں دیکھا۔ انہوں نے ایک مدبر حکمراں کی طرح سلطنت کے بڑے بڑے عہدے ان کو دیے۔ یہ شیعوں کی ترقی کا پہلا موقع ہے۔ بعد میں جب "غازان خاں" مسلماں ہوا تو وہ بھی شیعہ ہو گیا۔ جس کی وجہ سے شیعوں نے اور زور پکڑنا شروع کیا۔ اگرچہ وہ بعد میں اہل سنت و جماعت میں داخل ہو گیا تھا *۔ لیکن اس کے بعد "الجایتو" یقینی شیعہ تھا۔ چنانچہ "الجایتو" کے وہ سکے ہمارے پروفیسر "شیرانی صاحب" کے پاس موجود ہیں۔ ان پر صاف "علی ولی اللہ" کے لفظ لکھے ہوئے ہیں —

پھر صفوی خاندان نے شیعہ مذہب کو ایران میں اچھی طرح مضبوط کردیا —

"قاضی صاحب" لکھتے ہیں کہ جب "شاہ اسمعیل صفوی" (سنہ ۹۰۶ - ۹۳۰ ھ)

---

* دیکھو ترجمہ اردو سفرنامۂ ابن بطوطہ جلد اول صفحہ ۲۱۷ - ۸ —

تخت پر بیٹھا تو کسی ملا کے کہنے سے اس نے تمام سنیوں کو شیعہ بنانا شروع کیا۔ اس جوش کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس نے مشہور سنّیوں کی قبروں کو بھی اکھڑوا دیا۔ اسی ضمن میں ایک دن 'حافظ' کی بھی باری آگئی' لیکن کسی نے کہا کہ 'حافظ' سنی نہ تھے بلکہ شیعہ تھے' اور ثبوت میں یہ غزل پیش کی :—

(۱) جوزا سحر نہاد حمائل برابرم — یعنی غلام شاہم و سوگند می خورم
(۲) ساقی بیاکہ از مدد بخت کارساز — کامی کہ خواستم ز خدا شد میسرم
(۳) جامی بدہ کہ باز بشادی روی شاہ — پیرانہ سر ہوای جوانی ست در سرم
(۴) راہم مزن بہ وصف زلال خضر کہ من — از جام شاہ جرعہ کش حوض کوثرم
(۵) من جرعہ نوش بزم تو بودم ہزار سال — کی ترک آبخور کند این طبع خوگرم
(۶) گر باورت نمی شود از بندہ این حدیث — از گفتۂ کمال * دلیلی بیاورم
(۷) گر برکنم دل از تو و بردارم از تو مہر — آن مہر بر کہ افکنم آن دل کجا برم
(۸) نام محمد است و علی حرز جان من — وز این دو نام دیک بر اعدا مظفرم
(۹) عہد الست من ہمہ با مہر شاہ بود — در شاہراہ عمر از این عہد نگذرم
(۱۰) شاہین صفت چو طعمہ چشیدم ز دست شاہ — کی باشد التفات بصید کبوترم
(۱۱) ای شاہ شیرگیر چہ کم گردد ار شود — در سایۂ تو ملک فراغت میسرم
(۱۲) بال و پری ندارم و این طرفہ تر کہ نیست — غیر از ہوای منزل سیمرغ درسرم
(۱۳) شکر خدا کہ باز درین اوج بارگاہ — طاؤس عرش می شنود صیت شہپرم
(۱۴) نامم ز کارخانۂ عشاق محو باد — گر جز محبّت تو بود شغل دیگرم
(۱۵) ای عاشقان روی تو از ذرہ بیشتر — من کی رسم بہ وصل تو کز ذرہ کمترم
(۱۶) بنما بمن کہ منکر حسن رخ تو کیست — تا دیدہ اش بگزلک غیرت برآورم
(۱۷) حافظ ز جان محب رسول است و آل او — بر این سخن گواست خداوند اکبرم

---

* کمال اسمعیل اصفہانی المتوفی سنہ ۶۳۵ ھ دیکھو شعرالعجم جلد دوم —
† دیکھو مجالس المومنین ترجمہ حافظ ؛ زیر عنوان "صوفیاں" —

چنانچہ جب شاہ ' اسمعیل ' نے یہ غزل سنی تو اس نے ' حافظ ' کو شیعہ تسلیم کر لیا —

اس کے علاوہ ہمیں دیوان میں دو قصیدے اور دوغزلیں اور بھی ملتی ہیں جن سے ' حافظ ' کا شیعہ ہونا معلوم ہوتا ہے —

ایک قصیدہ یہ ہے :—

خدا یکی ز آثار صنع کرد اظہار — سپہر و مہر و مہ و سال و ماہ و لیل و نہار
مدار سیر کوا کب بامر کن فیکون — قرار داد برین طاق گنبد دوّار
نہ آسمان و ملائک بامر حق مشغول — بسجدہ درگہ تسبیح وذ کرو استغفار
چہار عنصر از و مختلف پدید آورد — مدار آتش و آب و غبار و خاک مدار

....

اگر نہ ذات نبی و ولی بدے مقصود — جہاں بہ کتم عدم رفتے ہمچو اوّل بار
نوشتہ بر در فردوس کا تبان قضا — نبی رسول و ولی عہد حیدر کرار
امام جن و انس علی بود کہ علی — زکل خلق فزون ست از صغار و کبار
علی امام و علی ایمن و علی ایمان — علی امین و علی سرور و علی سردار
علی علیم و علی عالم و علی اعلم — علی قسیم قصور و علی ست قاسم نار

....

بہ گاہ هفصد و هفتاد لہ کہ در شیراز — تمام گشت بیک روز جمع این اشعار
بہ دشمنان منشیں ' حافظا ' تو زنہار — نجات خویش طلب کن بجان هشت و چہار
حرام زادۂ بد فعل و شوم بے بنیاد — بمدح شاہ جہاں کے بجا کند اقرار

دوسرا قصیدہ بھی اسی قبیل کا ہے - میں اسے بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں • غزلوں میں سب سے زیادہ مشہور غزل یہ ہے :—

• اس قصیدے کا مطلع یہ ہے :
آں گلبن باغ وفا ' آں سرو بستان ولا - خورشید برج ارتضیٰ . اعلی علی مرتضیٰ

اے دل غلام شاہ نجف باش و شاد باش　　پیوستہ در حمایت لطف الٰہ باش
از خارجی ہزار بہ یک جو نمی خرند　　گو کوہ تا بکوہ منافق سپاہ باش
چوں احمدم شفیع بود روز رستخیز　　گو ایں تن بلاکش من پُر گناہ باش
آں را کہ دوستیء علی نیست کافر است　　گو زاہد زمانہ و گو شیخ راہ باش
امروز زندہ ام بہ ولاے تو یا علی　　فردا بہ روح پاک اماماں گواہ باش
قبر امام ہشتم سلطان دیں رضا ●　　از جاں ببوس و بر در آں بارگاہ باش
"حافظ" طریق بندگیء شاہ پیشہ کن　　وانگاہ در طریق چو مرداں راہ باش

اسی طرح تمام مطبوعہ دیوانوں میں غزلیات میں کئی جگہ ایسے شعر ملتے ہیں جن سے ان کا شیعہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک غزل میں یہ شعر ملتا ہے :-

"حافظ" اگر قدم زنی در رہ خاندانِ عشق　　بدرقۂ رہت شود ہمت شحنۂ نجف

وغیرہ وغیرہ

غرضکہ یہی وہ تمام چیزیں ہیں جن سے ہم "حافظ" کو شیعہ کہہ سکتے ہیں۔ اب ہمیں ان تمام چیزوں کو غور سے دیکھنا چاہئے —

(۱) مجالس المؤمنین کے قصے کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ قصیدہ جو قاضی صاحب نے "حافظ" کی طرف منسوب کیا ہے، واقعی اُن کا ہے یا نہیں —

یہ قصیدہ واقعی "دیوانِ حافظ" کے تمام مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے۔

● بعض قلمی نسخوں میں "حافظ" کے نام کا ایک مسدس بھی ملتا ہے جو انہوں نے امام رضا کی مدح میں لکھا ہے :—

دوش بودم در طواف روضۂ خیرالانام　　شاہ سلطان خراساں آں امام ابن امام
آں امامے کو شرف دارش بود مردم تمام　　نعمۂ اہل خراساں قبلۂ ہر خاص و عام
بودم اندر روضہ اش آمد بگوشم ایں پیام　　کالسلام اے شاہ سلطان خراساں السلام

یہ مسدس دراصل شاہ نعمت اللہ کے دیوان سے لیا گیا ہے (دیکھو ضمیمۂ فہرست)

' بروکهاس ' نے اسے غزلوں میں لکھا ہے ۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی مجالس المؤمنین میں اس قصیدے کو بہت کچھ تبدیل کیا گیا ہے — آٹھواں شعر یہ ہے :—

نام محمدست و علی حرز جان من   وز این دو نام ایک بر اعدا مظفرم

لیکن دیوان کے پرانے قلمی نسخوں میں یہ شعریوں درج ہے :—

منصور بن محمد غازیست حرز من   وز این خجسته نام بر اعدا مظفرم

اس شعر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ در حقیقت " حضرت علی " کی مدح میں نہیں لکھا گیا' بلکہ " منصور " کی تعریف میں لکھا گیا ہے —

" منصور ' شاہان آل مظفر کا آخری بادشاہ ہے - تیمور نے جب سنہ ۷۸۹ ھ میں شیراز پر حملہ کیا تو کسی وجہ سے وہ واپس چلاگیا اور جاتی دفعہ نصرالدین یحیی کو گورنر مقرر کر گیا —

شاہ " منصور " اس وقت شوستر کا حکمراں تھا اور شاہ " یحیی " کا حقیقی بھائی تھا - اس نے " تیمور " کے واپس جاتے ہی " شیراز " پر حملہ کیا۔ شاہ " یحیی" بھاگ گیا اور " منصور " نے شیراز پر قبضہ کر لیا —

" حافظ " نے شاہ " منصور " کی تمام بادشاہوں سے زیادہ تعریف کی ہے ' چنانچہ کہتے ہیں : —

بیا کہ رایت منصور بادشاہ رسید   نوید فتح وبشارت بہ مہر و ماہ رسید

ایک اور جگہہ کہتے ہیں : —

من غلام شاہ منصورم' نباشد دور اگر   از سر تمکین' تفاخر بر شہ خاورم کنم

چنانچہ ساقی نامے میں جو انہوں نے شاہ " منصور " کی تعریف کی ہے' وہ ان کے تعلقات کی خوشگواری پر دلالت کرتی ہے —

اسی طرح مصنف " مجالس " نے قصیدے کا مقطع بھی بدل دیا ہے - چنانچہ " حافظ " ز جان محب رسول ست و آل او   بر این سخن گواست خداوند اکبرم

کی جگہہ ایک بہت پُرانے قلمی نسخے میں یہ شعر درج ہے ۔ —

" حافظ " زدان دعائے تو گوید بہ صبح و شام   برای ین سخن گواست خدا وند اکبرم

ہو سکتا ہے کہ ساتھہ زیادہ مطابقت رکھتا ہے —

اس کے علاوہ ایک اور بات قابل غور ہے ۔ مجالس المؤمنین میں اس قصیدے کے وہ شعر درج ہیں جس میں بادشاہ وقت کی تعریف جو زندہ ہے پائی جاتی ہو ' آزادیے گئے ہیں دیوان حافظ میں ۔ ۔ بہت درفا نیہ کہ قصیدہ حضرت علی کی تعریف میں لکھا گیا ہے ۔ مثلاً : —

بعد ... از ... رسادم ... فضل   ... حنایم و مسکین ابن درم

چوتھے شعر کے بعد ۔ اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والا کسی ایسے بادشاہ کو مخاطب کر رہا ہے جو ابھی زندہ ہے چنانچہ اگلے شعر سے واضح ہے —

... ... بود ... ... نوک آبدورانند این طبع خو کرم

(... ... ... قرفی ... ... نظم خود چراغکام ار که ... رم

ساتویں شعر کے بعد

... مقصود ... ... بازار ... ...   ز ... فروشم و نہ ... خرم

بر ... ... خورشید سلطنت   ... فروغیست ز خورشید خاورم

... بہ ... ...   گوئی کہ تیغ تست زبان سخنورم

سولہویں شعر کے بعد

ان شعروں سے صاف ظاہر ہے کہ حافظ کسی زندہ بادشاہ کو مخاطب کرکے اس کی تعریف کر رہا ہے ۔

اس کے علاوہ مجالس المؤمنین ایک ایسی کتاب ہے ' جس میں بڑے بڑے سنیوں کو شیعہ بنانے کے لئے کبھی تو ان کے اپنے اشعار ہی کو توڑ مروڑ کر شیعیت کی طرف لے گئے ہیں اور کبھی بالکل الحاقی قصیدے اور غزلیں ان کی طرف

منسوب کردی گئی ہیں، جس نے شیخ سعدی* (المتوفی سنہ ۶۹۱ ھ)۔ مولانا روم (المتوفی سنہ ۶۷۲ھ) حکیم سنائی (سنہ ۵۲۵ ھ) اور عطار (سنہ ۶۲۷ ھ) کو نہیں چھوڑا تو ان کے نزدیک حافظ کس قطار میں تھے —

(ب) دوسرے قصیدے کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ صاف بتا رہا ہے کہ وہ حافظ کی طرز میں نہیں۔ وہ شخص جس کا یہ اصول ہو کہ :۔

آسایش دو گیتی تفسیر این دو حرف ست   با دوستان تلطف با دشمنان مدارا

کیا ایسے اشعار لکھ سکتا ہے کہ : —

حرام زادۂ بد فعل و شوم بے بنیاد   بہ مدح شاہ جہاں کے لجا کند اقرار

حافظ نے کبھی مذہبی جھگڑوں میں قدم نہیں رکھا۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے :۔

جنگ هفتاد و دو ملت همه را عذر بنه   چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ یہ قصیدہ کسی پرانے قلمی نسخے میں موجود نہیں۔ البتہ بعد کے نسخوں میں ان کی بہت بہتات ہے۔ کئی پرانے نسخوں میں یہ قصیدے متن کی بجائے کسی دوسرے خط میں حاشیے پر لکھے ہوے ہیں جو صاف بتلا رہا ہے کہ بعد کا اضافہ ہے —

---

* مثال کے طور پر میں شیخ سعدی کے وہ اشعار جن سے مصنف نے ان کو شیعہ قرار دیا ہے، درج کرتا ہوں —

غیر از علی که لائق پیغمبری بدے   گر خواجۂ رسل نہ بدے ختم انبیا
یارا که هر کسی به شفیعی زنند دست   دست من ست و دامن معصوم مرتضی

لیکن جب ہم کلیات سعدی کے قصائد میں دیکھتے ہیں تو یہ شعر اس طرح درج ہیں : —

دیگر عمر که لائق پیغمبری بدے   گر خواجۂ رسل نہ بدے ختم انبیا
دیکھو کلیات قصائد۔ صفحہ ۱۳ — ۱۴

اس سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ سعدی نے یہ شعر حضرت عمر کے متعلق لکھا اور مصنف نے حضرت علی کا نام لکھکر ان کو شیعہ ثابت کردیا —

اسی طرح تمام غزلیں جو اوپر لکھی جاچکی ہیں، سب کی سب 'الحاقی ہیں —

یہاں ایک اور بات قابل غور ہے - حافظ کے دیوان کا پہلا شعر یہ ہے :-

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا　　　که عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

اس شعر کا پہلا مصرع یزید کے اس شعر سے ماخوذ ہے :-

انا المسموم ماعندي بترياق ولاراقي　　　ادر کاساً و ناولها الا یا ایها الساقی

اور یہ وہی یزید ہے جس نے حضرت امام حسین کو قتل کروایا تھا - ظاہر ہے کہ شیعوں کے نزدیک یزید کی کیا عزت ہوسکتی ہے - لیکن جب انہوں نے حافظ کو شیعہ ثابت کیا تو وہ بہت حیران ہوئے کہ یہ کیا سبب ہے کہ حافظ نے اپنے دیوان میں یزید جیسے خبیث آدمی کے شعر کو سب سے پہلے جگہ دی - چنانچہ اہلی شیرازی* کہتا ہے :-

خواجه حافظ را شبی دیدم به خواب　　　گفتم اے در فضل و دانش بے مثال

از چه بستی بر خود این شعر یزید　　　باوجود این همه فضل و کمال

گفت واقف نیستی زاں مسئله　　　مال کافر هست بر مؤمن حلال

کاتبی نیشاپوری کہتا ہے -

عجب در حیرتم از خواجه حافظ　　　بنوعے کش خرد زاں عاجز آید

چه حکمت دید در شعر یزید او　　　که در دیواں نخست از وے سراید

اگرچه مال کافر بر مسلماں　　　حلالست و درو قولے نشاید

ولے از شیر عیبے بس بزرگ ست　　　که لقمه از دهان سگ رباید*

لیکن شاید ان لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ 'دیوان حافظ' حافظ نے مرتب نہیں

---

* اہلی شیرازی - شاہ اسمعیل صفوی کی ملازمت میں تھے - شیراز میں حافظ کے مزار کے پاس دفن ہیں - اُن کی مثنوی "سحر حلال" مشہور ہے - سنہ ۹۴۲ھ میں وفات پائی -

* یہ تمام بیان مولانا سودی شارح (ترکی) دیوان حافظ کی شرح سے لیا گیا ہے - جسے بروکہاس نے بھی اپنے نسخے میں نقل کیا ہے -

کیا تھا، بلکہ اُس کی وفات کے بعد اُس کے دوست گل‌اندام نے مرتب کیا تھا۔ جس طرح اس نے چاہا، ترتیب دے دی —

حافظ کا تسنن

ہمیں دیوان میں حافظ کے تسنن کا کوئی ظاہر ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ اندرونی شہادت جو مہیّا ہوسکتی ہے، لکھی جاتی ہے —

(۱) اشاعرہ قائل ہیں کہ قیامت کے دن ہم کو خدا کا دیدار ہوگا، اور حضرات شیعہ، معتزلہ کی طرح اس سے منکر ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب فرماتے ہیں :-

این جان عاریت کہ بہ حافظ سپرد دوست

روزے رخش بہ بینم و تسلیم وے کنم+

(۲) اشاعرہ اور معتزلہ کا ایک متنازعہ فیہ مسئلہ قرآن کی قدامت اور حداثت کے متعلق ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید حادث ہے۔ امام احمد بن حنبل رح (سنہ ۱۹۴ ھ - ۲۴۱ھ) کو صرف اسی وجہ سے کہ انھوں نے قرآن کو حادث نہیں مانا تھا، مامون الرشید (المتوفی ۲۱۸ ھ) نے قید کرنے کا حکم دیا تھا ‡۔ یہ مسئلہ بہت مدت تک زیر بحث رہا ہے۔ لیکن اشاعرہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید قدیم ہے۔ اب اشعری اور اہل سنت اکثر عقائد میں ملتے ہیں۔ اسی طرح معتزلی اور شیعہ —

چنانچہ جب ہم دیوان کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب قرآن مجید کو قدیم مانتے ہیں، جو شیعوں کے نقطۂ نظر کے خلاف ہے :-

برآرم بہ اخلاص دست دعا   کنم روے در حضرت کبریا

کہ یارب بہ آلائے و نعمائے تو   باسرار اسمائے حسنائے تو

بہ حق کلامت کہ آمد قدیم   بہ حق عظیم و بہ خلق کریم

+ لطائف غیبیہ بہ حوالۂ تاریخ براؤن —

‡ مذاہب الاسلام - صفحہ ۱۰۳، ۱۰۴ بار اول —

که شاه جهان باد فیروز بخت   به اقبالش آراسته تاج و تخت •

(۲) مسئلۂ جبر و قدر میں بھی اسی طرح اشاعرہ اور معتزلہ کا میدان گرم رہا ہے۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے سب خدا کی طرف سے ہے۔ انسان میں کچھ قدرت نہیں۔ لیکن معتزلہ کہتے ہیں کہ انسان اپنے افعال کا خود مختار ہے جو چاہے سو کرسکتا ہے۔ اور ہر ایک گروہ اپنی اپنی تائید میں قرآن مجید سے آیتیں پیش کرتا ہے۔

ایک فریق کہتا ہے — "لیس للانسان الا ما سعیٰ" یعنی خدا کہتا ہے کہ انسان کا ہر ایک کام سعی پہ منحصر ہے پھر فرماتا ہے — "ذالک بان اللہ لم یک مغیرا نعمۃ انعمہا علیٰ قوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم" (سورۃ انفال) وغیرہ —

مصنف حق الیقین کہتا ہے (۱):

"و بندگان در فعل خود مختارند۔ خود فاعل و فعل خود اند۔ خواہ اطاعت باشد خواہ معصیت۔ و اکثر امامیہ و معتزلہ باین قول قائل اند۔ اشاعرہ کہ اکثر اہل سنت اند می گویند فاعل ہمہ افعال بندہ خداست و بندگان مطلق در آنہا اختیار ندارند بلکہ خدا بدست ایشان افعال را جاری می کند و در آن فعل مجبور اند۔ اما بعضی از ایشان می گویند کہ ارادہ از بندہ مقرون آن فعل می باشد اما آن ارادہ مطلقا دخلے در وجود آن فعل ندارد و این مذہب باطل ست" —

اب جب حافظ کی طرف دیکھتے ہیں تو بخلاف معتزلہ اور امامیہ کے وہ اپنے آپ کو مجبور محض مانتا ہے۔ یہ ہماری تقدیر ہی میں نہیں کہ ہم یوں

• دیکھو سالی نامۂ حافظ سے حصۂ عبدالنبی صفحہ ۸۵ — ۸۶، دیوان حافظ مطبوعۂ نامی پریس سنہ ۱۹۲۱ء صفحہ ۴۲۸ وغیرہ —

(۱) اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ ہمارے پروفیسر شیرانی صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے اور انہوں نے اپنے مضمون "فردوسی کے مذہب" میں اسی کتاب سے اقتباسات لئے ہیں —

کرتے یا یوں نہ کرتے مثلاً :—

(۱) در کوے نیکنامی مارا گزر نہ دادند — گر تو نمی پسندی تغییر کن قضارا

(۲) در خرابات مغاں ما نیز هم منزل شویم — کیں چنیں رفت ست در روز ازل تقدیر ما

(۳) رضا بداده بده وز جبیں گره بکشا — که بر من و تو در اختیار نکشاده ست

(۴) برو اے زاهد و بر دردکشاں خرده مگیر — که ندادند جز یں تحفه بما روز الست

(۵) مکن به نامه سیاهی ملامت من مست — که آگه ست نه تقدیر بر سرش چه نوشت

(۶) آنچه سعی ست من اندر طلبت بنمودم — ایں قدر هست که تغییر قضا نتواں کرد

(۷) ساقیا مے ده که با حکم ازل تدبیر نیست — قابل تغییر نبود آنچه تعیین کرده اند

(۸) بارها گفته ام و بار دگر می گویم — که من دل شده ایں ره نه بخود می پویم

(۹) مرا روز ازل کارے بجز رندی نفرمودند — بر آں قسمت که آنجا شد کم و افزوں نخواهد شد

(۱۰) در پس آئینه طوطی صفتم داشته اند — آنچه استاد ازل گفت همان می گویم

(۱۱) برو اے زاهد و بر درد کشاں خورده مگیر — کار فرماے قدر می کند ایں من چه کنم

(۱۲) مرا مهر نکو رویاں ز سر بیروں نخواهد شد
قضاے آسمان ایں ست و دیگر گوں نخواهد شد

اس کے علاوہ تمام دیوان ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے —

(۳) معتزلہ اپنے آپ کو عدلی کہتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک برائی صرف انسان سے سرزد ہوتی ہے ، خدا کی ذات برائی کرنے سے منزہ ہے - جو کچھ برائی ہم پر آتی ہے ، ہمیں اسے خدا کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے ، لیکن برخلاف اس کے اشاعرہ برائی اور نیکی دونوں کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں - اور کہتے ہیں کہ برائی صرف ہمیں برائی لگتی ہے، لیکن در حقیقت اس میں کچھ خدا کا بھید مضمر ہوتا ہے اور اس سے بھی صرف ہماری بہتری منظور ہوتی ہے مصنف حق الیقین کہتا ہے :—

"حق تعالی حکیم ست و کارهاے او منوط به حکمت و مصلحت ست و فعل عبث

و بے فائدہ ازو صادر نمی شود - او را در افعال اغراض صحیح و حکمت ہائے عظیمہ ملحوظ می باشد ولیکن غرض در افعال الہی عائد به بندگان می گردد - غرض او تحصیل نفع از برائے خود نیست - و بریں قول اتفاق کردہ اند امامیہ و معتزلہ و حکماء و اشاعرہ گفتہ اند کہ افعال خدا معلل به اغراض نیست و آیت و احادیث بسیار بر بطلان ایں قول دلالت می کند - و اکثر امامیہ را اعتقاد آنست کہ انچہ اصلح باشد از برائے خلق و نظام عالم فعلش بر حق تعالیٰ واجب ست —

حافظ کہتا ہے :—

گر رنج پیشت آید و گر راحت اے حکیم
نسبت مکن به غیر کہ ایں ہا خدا کند

یہ شعر ایسا صاف ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید 'حافظ' نے صرف اسی مسئلے کے فیصلے کے لئے لکھا تھا —

گناہ اگرچہ نبود اختیار ما 'حافظ' تو در طریق ادب کوش و گو گناہ من ست

یعنی در حقیقت ہم مجبور محض ہیں اور جو کچھ گناہ یا ثواب ' نیکی یا برائی ہم سے سرزد ہوتی ہے وہ ہماری طاقت میں نہیں - لیکن پھر بھی ادب اس بات کا مقتضی ہے کہ اگرچہ یہ اسی خدائے مطلق کا کام ہے ' مگر ہم ان کو اس کی طرف منسوب نہ کریں —

بخور هر چه آید ز دست حبیب نہ بیمار دانا ترست از طبیب

دنیا میں انسان بسا اوقات اپنی تنگدستی ' شکستہ حالی اور دیگر مصائب کا شاکی رہتا ہے اور آرام کا خواہش مند ' مگر حکیم مطلق کا فعل خالی از حکمت نہیں ہوتا - وہ اپنے بندوں پر مہربان ہے اور جو کچھ کرتا ہے ' آدمی کے فائدے کے لئے کرتا ہے - انسان ناقص العقل ہونے کی وجہ سے نہیں سمجھتا ● —

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست
در صراط المستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

● لسان الغیب شرح دیوان حافظ جلد اول —

صوفیاے کرام کے نزدیک انسان کو دنیا میں جو کچھہ پیش آتا ہے اور جو افعال اس سے سرزد ہوتے ہیں ان سب میں حکمت الٰہی موجود ہے ۔ اور سب مصلحت ہیں پر مبنی ' گویا ان کے نزدیک تمام دنیا صراط المستقیم پر جاری ہے اور جو کچھہ ہو رہا ہے حکیم مطلق کی حکمت کے مطابق ہو رہا ہے —

(۴) مولانا اسلم نے اسی سلسلے میں ایک اور وجہ پیش کی ہے' جس سے اس بحث کا قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے —

حضرات شیعہ کو لفظ چار سے بہت نفرت ہے (بوجہ خلفاے اربعہ) اسی لئے بجاےچار تکبیروں کے وہ جنازے میں پانچ تکبیریں کہتے ہیں' لیکن خواجہ ' حافظ ' بر خلاف شیعوں کے چار تکبیریں کہتے ہیں —

من ہماں دم کہ وضو ساختم از چشمۂ عشق
چار تکبیر زدم یکسرہ بر ہر چہ کہ ہست

(۵) اہل تشیع تمام اماموں کو معصوم مانتے ہیں اور چونکہ نبیوں کا درجہ اماموں سے بر تر ہے اس لئے نبی بھی معصوم ہوے ۔ اور چونکہ فرشتے بھی اماموں سے بر تر ہیں اس لئے وہ بھی معصوم ہوے ۔ اسی بنا پر وہ ہاروت و ماروت کے قصے اور حضرت یوسف کے زلیخا کے دام میں آجانے کو نہیں مانتے ۔ لیکن ' حافظ ' نے ہاروت و ماروت کی تلمیح کو استعمال کیا ہے ۔ اگر وہ شیعہ ہوتے تو کبھی ایسی تلمیح استعمال نہ کرتے —

گر بیدم شدن سوے ہاروت بابلی
صد گونہ ساحری بکنم تا بیارمت *

---

* عام چھپے ہوے دیوان میں ایک اور غزل بھی ہے' جس میں حافظ نے یہ تلمیح استعمال کی ہے :—

ہمچو ہاروتیم دائم در بلاے عشق زار | کاش کہ ہرگز ندیدے دیدۂ ما روت را
کے شدے ہاروت درچاہ زنخدانش اسیر | گر نہ گفتے شمۂ از حسن او ما روت را

(۹) ان سب باتوں کے علاوہ صحبت اور سوسائٹی کا لحاظ بھی مد نظر رکھنا چاہئیے ' جس زمانے میں ' حافظ ' نے شیراز میں ہوش سنبھالا - اس وقت سے لے دم آخر تک تمام بادشاہ اہل سنت تھے - یعنی ' ابو اسحاق ' ' ابو مظفر ' ' شاہ شجاع ' اور ' شاہ منصور - تمام علماء سنی تھے - قاضی مولانا معظم مجد الدین ' اسمعیل ' اس زمانے میں سنیوں کی برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے اور سلطان محمد خدا بندہ ' جس نے سلطانی ہونے پر مذہب اختیار کر لیا تھا - انہیں کے ہاتھوں سے اہل سنت کے فرقے میں داخل ہوئے ٭

ان کی وفات سنہ ۷۵۹ ھ میں ہوئی ہے - حافظ نے ان کی وفات پر یہ قطعہ لکھا -

مجد دین سرور سلطان قضا اسمعیل　　که زدے کلک زبان آوری از شرع نطق
ناف هفته بد و از ماه رجب کاف و الف　　که بروں رفت ازیں خانہ بے ضبط و نسق
کنف رحمت حق منزل او داں و آنگه　　سال تاریخ وفاتش طلب از رحمت حق '

(دیکھو دیوان حافظ صفحہ ۴۴۸ - ۴۴۹)

کیا کوئی شیعہ ایسے پکے سنی عالم کی تعریف کر سکتا ہے ؟ —

پھر ان کے علاوہ ' بہاءالدین' شیراز کے قاضی تھے ' جب انہوں نے وفات پائی تو حافظ نے مندرجۂ ذیل قطعہ لکھا :—

بہاءالحق ' والدین ' طاب مثواہ　　امام سنت و شیخ جماعت
چو می رفت از جہاں ایں بیت می خواند　　بر اہل فضل و ارباب براعت
بطاعت قرب ایزدی تواں یافت　　قدم در نہ گرت ہست استطاعت

....

٭ دیکھو اردو ترجمہ سفر نامۂ ابن بطوطہ جلد اول صفحہ ۲۱۷ - ۱۸ —

ایک شیعہ ایسے لفظ کبھی نہیں کہہ سکتا ۔ " امام سنت و شیخ جماعت " کا مصرع اس بات کا صاف صاف فیصلہ کئے دیتا ہے —

مگر ان کا حافظ قرآن ہونا ہی سب سے بڑی دلیل ہے کہ وہ شیعہ نہیں تھے ۔ شیعوں کے نزدیک قرآن مجید کو حفظ کرنا ' قرآن مجید کی بے ادبی کرنا ہے ۔ دوسری یہ دلیل ہے کہ وہ صوفی تھے ۔ اگر چہ بعض لوگوں کے نزدیک انھوں نے جوانی کی عمر میں رنگ رلیاں منائی ہیں لیکن اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ کسی نہ کسی وقت تصوف کے دائرے میں ضرور داخل ہوے ہیں ۔ شیعوں کے نزدیک تصوف بالکل الحاد کا حکم رکھتا ہے ۔ سلطنت صفویہ میں یہ خیال کم ہو گیا تھا ' کیونکہ سلطنت صفویہ کے بانی کے اجداد صوفی ہی تھے ۔ تاہم اسی زمانے میں ایک شاعر نے یہ شعر لکھا ہے --

این کلام صوفیان شوم نیست   مثنوی مولوی روم نیست

لیکن ' حافظ ' صفوی خاندان سے ایک ڈیڑھ صدی پہلے ہوے تھے ۔ اس وقت تو صوفی اور ملحد ایک ہی سمجھے جاتے تھے ۔ اس لئے حافظ کسی طرح بھی شیعہ نہیں کہے جا سکتے —

———:o:———

مولانا وحید الدین "سلیم" مرحوم

مولانا سلیم کے انتقال سے اُردو ادب کی صف میں ایک ایسی جگہ خالی ہوگئی ہے جس کا پر کرنا آسان نہیں - جامعۂ عثمانیہ ہی کو اُن کا جانشین ملنا مشکل نہیں بلکہ اب اُن جیسا ادیب سارے ملک میں کوئی نظر نہیں آتا - وہ ایک جامع حیثیات شخص تھے - عربی اور فارسی کے جیّد عالم تھے ۔ اُردو زبان پر ان کی وسیع نظر تھی؛ خاص کر نئے الفاظ کے بنانے میں اُنہیں بہت بڑا ملکہ تھا - اُن کی کتاب "وضع اصطلاحات علمیہ" ایک حد تک ان کی وسعت نظر اور تبحر کی شاہد ہے - وہ اعلیٰ درجے کے نثار تھے اور شعر بھی خوب کہتے تھے - شاعری اُن کی زور طبیعت کا نتیجہ تھی؛ بعینہٖ جیسے مولوی نذیر احمد مرحوم کی شاعری لیکن "سلیم" مرحوم ان سے سبقت لے گئے تھے - ان کی قلم اور آواز میں بڑا زور تھا - اُن کے چہرے سے اُن کی طباعی اور ذہانت معلوم ہوتی تھی - یہ سب باتیں بھی مولوی نذیر احمد سے ملتی جلتی تھیں —

مرحوم نے عمر بھر یاتو طالب علمی کی یا علم و ادب کی خدمت - علاوہ ایک بلند پایہ ادیب ہونے کے وہ اعلیٰ درجے کے اخبار نویس بھی تھے - مسلم گزٹ کے پرچے جن صاحبوں نے بہ غور پڑھے ہیں ۔ انہیں معلوم ہے کہ ایسے زبردست مضامین معاملات وقت پر کسی دوسرے اخبار میں نہیں نکلے - علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

کو جب انھوں نے اپنے ہاتھہ میں لیا تو اُس کی کایاپلٹ دی ؛ یاتو وہ ایک مردہ اخبار تھا یا دفعۃً زندہ ہو گیا ۔ اُن کا رسالۂ معارف اُردو کے اُن چند رسالوں میں ہے جنھوں نے ملک میں علمی ذوق پیدا کر کے زبان کی حقیقی خدمت کی ہے ۔ وہ کسی رنگ میں ہوں ، تھے وہ ادیب ہی : سیاسیات کا انھیں کوئی ذوق نہ تھا ؛ البتہ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے —

مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف‌الطبع تھے ، یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے ۔ مگر بڑے سادہ طبیعت کے آدمی تھے ۔ مصلحت ، سلیقے اور صفائی کا داغ ان کے دامن پر نہ تھا ، جو جی میں آتا کہہ بیٹھتے تھے اور جو چاہتے کر گزرتے تھے ، جہاں کسی نے غلطی کی فوراً ٹوک دیتے تھے ۔ کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کا محل و موقع بھی ہے یا نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف نہ تھے ، اُن کی باتوں سے اکثر ناراض ہو جاتے تھے ۔ جس طرح باوجود زبردست اخبار نویس ہونے کے سیاسیات کا ذوق نہ تھا ، اسی طرح باوجود زبردست عالم وفاضل ہونے کے مذہب سے بیگانہ نہ تھے ۔ یہ ذوقی چیز ہے اُسے علم و فضل سے کوی واسطہ نہیں —

جس طرح اُنہیں طالب علمی میں مولانا فیض الحسن جیسے بے مثل ادیب اُستاد ملے ، اسی طرح اس کے بعد سرسید اور مولانا حالی جیسے عالی خیال پیشوا بھی نصیب ہوے ۔ ان بزرگوں نے اُن کے خیالات اور ادب پر بہت بڑا اثر ڈالا ۔ مگر وہ عمر بھر طالب علم ہی رہے ؛ مصلحت وقت اور زمانہ شناسی اُن کے نصیب میں نہ تھی اور جو کبھی بد نصیبی سے انھوں نے اس کوچے میں قدم رکھا تو پہلے ہی قدم میں لغزش کھای ۔ اس چیز کے لئے کچھہ تو فطری مناسبت ہونی چاہئے اور کچھہ صحبت اور تجربہ ۔ ان میں سے اُن کے پاس کچھہ بھی نہ تھا —

اُن کے دوست بہت کم تھے ' شاید دو چار ہی ہوں ' مگر جن کے دوست تھے ' دل سے تھے - لیکن ساتھ ہی بہت سرنج و سرنجاں تھے ' کسی کو حتی‌المقدور ناراض نہیں ہونے دیتے تھے - خود خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھنا چاہتے تھے - بہت بے تکلف تھے اور خوب باتیں کرتے تھے اور خوب ہنستے اور ہنساتے تھے —

• اس میں شک نہیں کہ جامعۂ عثمانیہ کو مولانا سے بہتر پروفیسر نہیں مل سکتا تھا - شاید قدرت کو یہ منظور تھا کہ جس یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہے وہاں اُردو کا پروفیسر بھی ایسا ہی ہونا چاہئے جو اس کی شان اور ضرورت کے مناسب ہو - انہوں نے اس جامعہ کے طلبہ میں جو علمی اور ادبی ذوق پیدا کیا ہے وہ انہیں کا کام تھا ' اور یہ بہت بڑا احسان ہے - تعلیم کا اصل منشا ذوق پیدا کرنا ہے اور پھر وہ اپنا رستہ خود نکال لیتا ہے —

مرحوم کی طالب علمی کا زمانہ بہت عسرت میں گزرا اورآخری زمانہ جوفارغ البالی کا تھا وہ بھی ' افسوس ہے کہ عسرت ہی میں بسر ہوا - اُنھیں اپنی فارغ البالی سے کچھ ملنا نہ تھا - گو ان کی عمر زیادہ تھی' شاید (اڑسٹھ - کے لگ بھگ) لیکن اُن کے قویٰ ایسے اچھے تھے کہ بہت دنوں اور جی سکتے تھے' لیکن انہوں نے کبھی صحت و صفائی کا خیال نہ رکھا اورنہ کبھی اپنے کھانے پینے کا کوئی معقول انتظام کیا - وہ ان چیزوں کو جانتے ہی نہ تھے - یہی اُن کی بیماری اور بالآخر ان کی موت کا باعث ہوا —

انجمن ترقی اُردو اور خاص کر رسالۂ اُردو سے انہیں خاص لگاؤ تھا - اُن کے بعض بہترین مضامین " اُردو " میں شائع ہوے ہیں - مولانا شرر مرحوم کے انتقال پر جب انجمن نے مرحوم کے نام سے " اُردو " کے بہترین مضامین کے لئے مستقل طور پر سالانہ تین انعامات کی تجویز کی تو سب سے پہلا انعام جو دوسو روپیے کا تھا' مولانا نے خود ہر سال دینا منظور فرمایا - وہ صرف ایک سال دینے پائے تھے کہ دوسرے سال

خود اس دنیا سے منہ موڑ کر چلے گئے - قطع نظر اس کے کہ وہ میرے مہربان اور شفیق دوست تھے اور مجھے ان کی موت کا بیحد رنج ہے ' میں اُن کی موت کو قومی حادثہ سمجھتا ہوں۔ اُن کے ہونے سے ہمیں بڑا سہارا تھا - ہر علمی اور ادبی کام میں ہم ان کا نام سب سے پہلے شریک کرتے تھے ' اب جو وہ نہیں ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوت کم ہوگئی ہے —

حقیقت یہ ہے کے مولانا جیسی طبیعت اور ذہانت اور جدت کے بہت کم لوگ ہوتے ہیں - اُن کی تحریر میں بڑی قوت تھی اور حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا ' بات کی تہ کو خوب پہنچتے تھے اور زبان کے تو استاد تھے -جدید تعلیم نہیں پائی تھی' مگر مغربی تعلیم کا جو منشا ہے اُس سے ایسے واقف تھے کہ بہت کم جدید تعلیم یافتہ واقف ہونگے - انگریزی نہیں جانتے تھے ' مگر جب انگریزی سے اردو میں اصطلاحات یا الفاظ ترجمہ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی تو انگریزی داں بھی اُن کی واقفیت کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے - وہ الفاظ کے کینڈوں اور اُن کی فطرت کو خوب سمجھتے تھے اور لفظوں کی تلاش یا نئے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے - اور لفظ ایسے موزوں اور جلد بناتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے دماغ میں سانچے بنے بنائے رکھے ہیں' جن میں سے الفاظ ڈھلتے چلے آرہے ہیں —

ہمیں ان کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہئیے - ہم میں سے کتنے ہیں جنھوں نے مرحوم کی طرح اپنی ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں وقف کردی ہو - اس راہ میں مخدوم بننا آسان ہے' مگر خادم ہونا بہت دشوار - انھوں نے محض اپنی محنت اور قابلیت سے یہ درجہ پایا - ایک غریب لڑکا جس کے پاس پڑھنے کو کتابیں اور بھر پیٹ کھانے کو روٹی نہ تھی' وہ اپنی ہمت اور شوق اوراپنے علم و فضل کے زور

ہے ایسا ہوا کہ آج اس کی موت پر ایک بڑے طبقے کو حقیقی رنج اور افسوس ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو علم ادب کا ایک ستون گر گیا۔ اُن کی زندگی صاف بتاتی ہے کہ شوق اور محنت عجیب چیز ہیں۔ جسے ہم کمال کہتے ہیں وہ انہیں دونوں کا خانہ زاد ہے —

آفتاب ادب کا غروب

از

(جناب مولوی سید سراج الحسن ترمذی صاحب)

باغ جہاں میں کھلتے ہیں گل کتنے جا بجا
بو بھی نہیں سنگھا تی ہے جن کی کبھی صبا
کتنے گہر ہیں گرد یتیمی میں مبتلا
آئینے خاک میں ہیں پڑے کتنے بے بہا
ہیں بے نشاں کتنے نگیں ہائے نام دار
حیراں جن کو دیکھ کے ہو عقل سادہ کار

(بشن نرائن در)

جنگل اور باغ کے درختوں کو قدرت خوبصورت پھولوں اور پھلوں سے مزین کرتی ہے۔ رنگ برنگ کے طیور شاخوں پر نغمہ خوانی کرتے ہیں۔ سیپیوں کے اندر سے بے بہا موتی اور پتھروں سے بیش قیمت جوا ہرات نکلتے ہیں۔ علم و فضل کے معدن سے بڑے بڑے عالم، فلسفی اور شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ کائنات نت نئے روپ میں نظر آتی ہے، لیکن یہ سب نظر کا تماشا ہے، اس سرائے فانی کی ہر شے آنی جانی ہے، بقا صرف اُس ایک ہستی کو ہے، جس کا ملک قدیم اور جس کی ذات بے پروا ہے —

اس میں شک نہیں کہ دنیا نے بے شمار لباس اس وقت تک اتارے اور معلوم نہیں یہ لیل و نہار کب تک رہے۔ لیکن اس زال کی آغوش میں جو واقعات دہ خاکی سرشت انسان کو پیش آتے اور آتے ہیں، اپنے ادراک و فہم کے لحاظ سے ان پر ہنستا اور روتا ہے اور یہ سلسلہ تا قیام ارض و سما یوں ہی رہے گا۔۔

تاریخ عالم پر اگر نظر ڈالی جائے اور اقوام دہر کی ساخت اور اُن کے عروج و زوال کا انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو رنج و الم، مسرت و انبساط کی تصویریں دوش بدوش نظر آئیں گی —

قوموں کی بیداری کو شاعری اور ادب سے گہرا تعلق رہا ہے یونان کی تاریخ اگر ملاحظہ فرما دیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ قوم کے رزم و بزم دونوں میں ادیبوں کی جلوہ گری رہی ہے۔ دور کیوں جائیے خود عربوں کو دیکھ لیجئے۔ زمانۂ جاہلیت اور نیز بعثت کے بعد سے عرب کے شعرا اور فصحا نے قوم کو اُبھار نے اور زندہ کرنے میں جو نمایاں کام کئے ہیں اگر ان پر فلسفیانہ نظر ڈالی جائے تو ایک مبسوط تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ ہر قوم اپنے فرزندان نامور کی مفارقت داغوں پر جس کا واسطہ در اصل اس کی حیات و ممات سے ہوتا ہے، اُن کے کارنامے یاد کرکے آنسو بہاتی اور یادگاریں قائم کرتی ہے۔ یہ رسم نئی نہیں ہے بلکہ قدیم الایام سے چلی آتی ہے --

ہم جس بزرگ ہستی کے متعلق یہ سطریں حوالۂ قلم کر رہے ہیں، اس کے احسانات ہندی لٹریچر یعنی ادب اُردو پر بہت ہیں۔ یہ ہماری قومی بد نصیبی ہے کہ اس قحط رجال کے دور میں مولانا سید وحید الدین صاحب "سلیم" پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ، جن کی ذات گرامیؐ سے تشنہ کام اُردو کو بہت تقویت تھی، ہم سے ایسے وقت جدا ہوئے جب کہ ہمیں ان کی سخت ضرورت تھی —

ہندوستان کے ادیب اور اُردو انجمنیں جس قدر اس قومی نقصان پر

ماتم کریں کم ہے - بزم اردو کا یہ صدر نشین جس کے قلم کی جنبش نے ملک میں ایک غلغلہ بلند کر رکھا تھا اعزا اور احباب سے رخصت ہو کر سلیم آباد کی وادی خموشاں میں آرام فرما ہے - سر سید، حالی، محسن الملک، شبلی اور نذیر احمد کی روحیں اس سے بغلگیر ہو رہی ہونگی - گو وہ بظاہر ہم میں نہیں لیکن اُس کی زندگی کا اٹل اور غیر فانی کارنامہ مرور ایام سے بے خطر ہے ——

ادب اردو سے ذوق رکھنے والوں میں کون ایسا ہے جو مولانا 'سلیم' کے نام نامی سے واقف نہ ہو - مولانا کی تاریخ ولادت تو ہمیں معلوم نہیں البتہ اتنا علم ہے کہ وہ پانی پت میں پیدا ہوئے تھے - غریب مگر شریف خاندان کے فرزند تھے - نسباً آپ سید تھے - آپ کے والد حاجی سید فریدالدین صاحب بڑے عابد و زاہد بزرگ تھے فقرا سے خاص عقیدت رکھتے تھے - حضرت بوعلی شاہ صاحب قلندر رحمۃاللہ علیہ کے مزار اقدس کی تولیت بھی آپ کے سپرد تھی، جب مولانا غوث علی شاہ صاحب بہاری وارد پانی پت ہوئے تو حاجی صاحب نے ان کو اپنا مہمان بنایا اور خوب خدمت کی - اسی نسبت سے حاجی صاحب کے انتقال کے بعد حضرت غوث علی شاہ رحمۃاللہ علیہ نے جناب 'سلیم' کو اپنے آغوش عاطفت میں لے لیا اور آپ کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ فرمائی ——

طفولیت ہی سے آپ کی پیشانی پر ستارۂ علم و فضل روشن تھا - قدرت نے وہ ذہانت و فراست عطا کی تھی کہ کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے - قدیم زمانے میں تعلیم و تربیت کا گہوارہ مکتب ہوا کرتے تھے، اور اُستاد و شاگرد کا تعلق باپ بیٹے کا سا ہوتا تھا - جتنے استاد اس جوہر قابل کو ملے سب نے اُسے آنکھوں میں جگہ دی - نہایت کم عمری میں قرآن حفظ کیا، شفیق اُستادوں سے مکتب میں اُردو فارسی پڑھی، بارہ برس کی عمر میں خدا داد ذہانت اور محنت شاقہ سے فارسی میں اتنی استعداد حاصل کرلی تھی کہ آج کل کے بی - اے اور ایم - اے کے طلبہ کو بھی کم نصیب ہوتی ہے - اُردو کی چھٹی جماعت میں اتنی قابلیت تھی کہ مڈل اورانٹرینس کے طالبعلم مکان پر آکر حضرت 'سلیم' سے فارسی میں درس لیتے تھے - درجہ بدرجہ ترقی

کرکے جب مڈل میں پہنچے تو یونیورسٹی کے امتحان میں سارے صوبے میں اول آئے۔

صغر سنی سے شعر و شاعری کے ساتھ فطری لگاؤ تھا اور گیارہ برس کی عمر میں خاصے شعر موزوں کر لیتے تھے۔ اُس زمانے میں پانی پت میں شعر و سخن کا چرچا گھر گھر تھا، آئے دن شہر میں مشاعرے ہوا کرتے تھے، سلیم صاحب کی دھوم مچی ہوئی تھی، اپنے ہم عمر لڑکوں کو غزلیں لکھ کر دے دیا کرتے تھے، خود بھی مشاعروں میں جاتے اور اپنی ٹولی والوں کو بھی لے جایا کرتے تھے، مشاعرے اچھے خاصے دنگل ہوا کرتے تھے، جہاں پہلوانان سخن اپنے اپنے زور دکھاتے تھے ––

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ بعض اوقات ایک ایک نشست میں سو سو دو دو سو شعر کہہ ڈالتے تھے، اور انھیں اشعار میں سے دوسروں کا تخلص ڈال کر غزلیں نکال کر دے دیتے تھے۔ تیرہ برس کی عمر میں عام شعرا میں ممتاز حیثیت پیدا کرلی تھی۔ ھنوز چودھواں سال تھا کہ ایک شب حضرت مولانا غوث علی شاہ صاحب قدس سرہ کی شان میں قصیدہ لکھنے بیٹھے، مگر کوئی شعر موزوں نہ ہوسکا، بالآخر چہارشنبے کی شب میں قصیدے کی پھر فکر کی اور واردات کا یہ عالم تھا کہ دو بجے رات تک ایک سو ایک شعر کا نہایت فصیح و بلیغ قصیدہ فارسی میں تصنیف کرلیا۔ صبح کو جب مریدین اور معتقدین دربار غوثیہ میں حاضر ہوئے، سلیم صاحب بھی اپنا قصیدہ جیب میں ڈال کر پہنچے، تقاضائے عمر کی وجہ سے جھجکنے لگے۔ حضرت نے فرمایا کہ "بھئی! تم اپنا قصیدہ کیوں نہیں پڑھتے۔ جیب میں کب تک رکھوگے؟ اس اشارے پر قصیدہ جیب سے نکالا، اور بہ آواز بلند پڑھنا شروع کیا۔

اس بزم میں بڑے بڑے ادیب اور علما موجود تھے، کبھی مولانا سلیم کا چہرہ دیکھتے اور کبھی اشعار کی بلاغت پر غور کرتے ان کی حیرت بھی بجا تھی، چودہ سال کی عمر کا لڑکا اور ایسے زبردست قصیدے کی تصنیف! حضرت نے مکاشفے سے دریافت فرمالیا کہ لوگوں کو اس کمسن لڑکے کی تصنیف میں شک ہے، اس قصیدے میں فلسفہ، ھیئت، اور دیگر علوم کی زبردست اصطلاحیں ھیں، حسب الارشاد

جناب سلیم نے جب اصطلاحوں کی تشریح ' اور نکات بلاغت بیان کرنا شروع کئے ' تو لوگوں کی زبان سے احسنت و مرحبا کی صدائیں بلند ہوئیں —

یہ قصیدہ تذکرۂ غوثیہ میں من و عن موجود ہے —

سایۂ پدری سر سے اُٹھ چکا تھا ' قصیدہ پڑھ کر آبدیدہ ہوے دل میں خیال آیا کہ باپ زندہ ہوتے تو آج دیکھ کر باغ باغ ہوتے ' حضرت پر یہ منکشف ہوگیا اور آپ نے فرمایا " بیٹا خدا تو نہیں مرا " دست شفقت سر پر پھیرا جس سے سکون ہوگیا ' ایک اشرفی ہتھیلی پر رکھ کر ' سلیم ' صاحب کو نذر دی ' اور ایک زرتار بنارسی چادر بھی عطا فرمائی - نیز مٹھائی کا ایک دونا اُن کے ساتھ کردیا -

خاندان پر مسرت کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں' شوق علم سینے میں موجزن تھا کچھ بندوبست کرکے گھر سے باہر قدم نکالے ' سیدھے لاہور پہنچے ' ایک مدرسے میں نام لکھا لیا ' دو روپے وظیفہ ملنے لگا ' ماں کی محبت غالب تھی ' ایک روپیہ ماں کو بھیج دیتے اور اپنے ہفتے بھر کی غذا کا یہ انتظام کرتے کہ تنور کی جلی ہوئی روٹیاں جو نان بائی بے کار سمجھ کر علحدہ رکھ دیتے ہیں' دو آنے میں خرید لاتے ' اور چاقو سے جلا ہوا حصہ کھرچ کھرچ کر پانی میں بھگو لیتے ' اور نمک ڈال کر صبر و شکر کے ساتھ کھا لیتے تھے - یہ کیفیت تقریباً سال ڈیڑھ سال تک رہی ' جماعت کے سالانہ امتحان میں اول آے ' پانچ روپےوظیفہ ملنے لگا ' دو روپے خود رکھ لیتے اور تین اپنی ماں کو بھیج دیتے تھے - ارزانی کا زمانہ تھا' دوپیسے کی روٹی ایک وقت اور دو پیسے کی دوسرے وقت نان بائی کی دکان سے خرید کر کھا لیتے تھے ' روٹی کے ساتھ اکثر دال اور کبھی کبھی کوئی اور سالن بھی مل جاتا تھا - کپڑے اپنے ہاتھ سے نہر پر جاکر دھو لیتے تھے ' طالب علمی کا ابتدائی دور حضرت ' سلیم ' نے اس طرح ختم کیا —

ذہانت و قابلیت قدرت نے ودیعت کی تھی ' حوصلہ بلند تھا ' "منشی فاضل" کا امتحان دیا ' تمام پنجاب میں اول آے - اُردو میں مضمون نگاری کا جو پرچہ

آیاتھا ۔ اس کا جواب نہایت بلیغ نظم میں لکھ دیا ، فاضل ممتحن بہت مسرور ہوا اور یہ نظم اس نے اخبار میں شائع کرادی ، اور لکھا کہ "دنیا میں اس قابلیت کے لوگ بھی موجود ھیں کہ " منشی فاضل " کے امتحان میں مضمون کے جواب میں ایسی پاکیزہ اور برجستہ نظم لکھ سکتے ھیں " —

درس نظامیہ کی تکمیل کا شوق ہوا تو مشہور علماء سے (جن میں مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری اور مولانا عبد الله صاحب ٹونکی کے نام نامی بھی شریک ھیں) مختلف علوم حاصل کئے ، اور پانی پت کے مشہور محدث مولانا راغب الله صاحب سے بھی حدیث کا درس لیا ، طب کی بھی تکمیل کی —

اس زمانے میں ڈاکٹری اردو میں پڑھائی جاتی تھی ، کچھ دنوں تک ڈاکٹری بھی پڑھی ۔ انہیں ایام میں آپ کے ماموں گورکھپور میں سب انسپکٹر ہو گئے تھے ، انہوں نے " قانون " کی طرف راغب کیا ، ذہن رسا تھا ، دماغ میں کسی شے کی کمی نہ تھی ، قانون بھی پڑھنے لگے ۔ ھنوز یہ شغل جاری تھا کہ ماموں کا سایۂ عاطفت بھی سر سے اٹھ گیا ، بالآخر وطن کی راہ لینی پڑی —

ایک دوست کی سعی و وساطت سے " ایجرٹن کالج " بھاولپور کے اسٹاف میں شریک ہو گئے اور کئی سال تک قابلیت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے ۔ جنرل عظیم الدین خاں نے جو مولانا کے بڑے قدر داں تھے ، انہیں رام پور بلا لیا ، اور ھائی سکول میں ھیڈ مولوی کی خدمت سپرد کی ۔ یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہ چلا ، اس لئے کہ جنرل صاحب کے دفعۃً قتل ہوجانے کے سبب سے جلد مراجعت کرنی پڑی ۔ گردش تقدیر سے یہاں سے جا کر مولانا تشنج کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور کئی سال فریش رہے ۔ بعد صحت مولانا حالی انھیں اپنے ھمراہ علی گڑھ لے آئے —

اُن ایام میں سر سید کو اپنی تفسیر اور دیگر قسم کے علمی کاموں کے لئے ایک قابل نوجوان کی ضرورت تھی ، مولانا 'حالی' نے سلک سید میں اس دُرِ بے بہا کا اضافہ کرادیا ۔ چھ سال تک شب و روز سید صاحب کی خدمت میں لائبریری اسسٹنٹ کی حیثیت

سے رہے اور تفسیر کے لکھنے میں اُنہیں خوب مدد دی - بزم سید میں خاص وقعت اور ممتاز نظروں سے دیکھے جاتے تھے —

تصنیف و تالیف کے سلسلے کے علاوہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی کو معراج پر پہنچانا ' سید صاحب کا خاص نصب العین تھا - ضرورت داعی ہوئی کہ اس مقصد کی اشاعت کی جائے ' غدر کے بعد سر سید نے تہذیب الاخلاق پھر جاری کیا - یوں تو اس رسالے میں لکھنے والے بہت سے تھے ' مگر سرگرم لکھنے والوں میں سر سید' محسن الملک ' اور چراغ علی' کے ساتھ حضرت 'سلیم' کا بھی نام نامی آتا ہے - تہذیب الاخلاق کے فائل آج بھی مولانا کے مضامین سے مزین ہیں —

تہذیب الاخلاق کی وفات کے بعد ' جس نے قوم کی سوتی ہوئی دماغی اور اخلاقی قابلیتوں میں ایک تحریک پیدا کردی تھی ' ایک ایسے رسالے کے وجود کی ضرورت تھی : جو زور اور صداقت ' آزادی اور متانت کے ساتھ قوم کی ترجمانی کرے - یہ معمولی کام نہ تھا ' اِس کے لئے ایک قابل ' تجربہ کار ' اور قوم پرست اڈیٹر کی ضرورت تھی ' چنانچہ اس کا قرعہ جناب ' سلیم ' کے نام پر پڑا ' اور اُفق علیگڈھ پر 'معارف' جلوہ گر ہوا ' جس نے اپنی قوت جاذبہ سے سارے ملک کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور سنہ ۱۸۹۸ ع سے لے کر کئی سال تک آب و تاب کے ساتھ ضو فشاں رہا —

'معارف' نے قوم کی اندرونی خرابیوں' اور بیماریوں کا بہترین طریقے پر علاج کیا' اُردو ادب ' اور شاعری سے صحیح طور پر روشناس کیا ' اور ملک میں ' ادب کا اعلیٰ مذاق پیدا کیا —

اگر سرسید نے ایک خاص 'انشا' کی بنا ڈالی تھی ' تو یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اُس پر عمارت حضرت ' سلیم ' نے تعمیر کی تھی - گُلشن اُردو کی کیاریاں سینچنے میں 'معارف' نے بڑی عرق‌ریزی کی ہے' آج جو ہم میں انشا پرداز اور شاعر نظر آتے ہیں ' یہ سب اسی شجر کہنہ کے شاخ و ثمر ہیں —

' معارف ' کا علم جب سرنگوں ہوا تو محسن الملک نے مولانا کی خدمت میں علی گڈھ گزٹ کی ادارت پیش کی اور یہ خدمت بھی قابلیت و مستعدی کے ساتھ سالہا سال تک مرحوم نے انجام دی ' کالج میں بھی کچھ دنوں تک فارسی کے اُستاد رہے - غرضکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں 'سلیم' نے نا موری حاصل کی ' اور ان کا شمار ہندوستان کی یگانۂ روز گار ہستیوں میں ہونے لگا —

'شبلی ' اور 'سلیم ' کالج میں تقریباً ایک ہی جگہ رہتے تھے اور 'حالی' بھی کبھی کبھی آ جاتے تھے ' آپس میں تعلقات بھی خوشگوار تھے - ' سلیم ' مرحوم مولوی شبلی کی مورخانہ تحقیقات پر اکثر نقد فرمایا کرتے تھے ' پہلے تو مولانا چیں بجبیں ہوتے مگر بحث و مباحثہ کے بعد جو بات سچ ہوتی ' اس کا اعتراف بھی فرما لیتے تھے ' حیف اب نہ وہ ساقی ہے نہ وہ مے نوش' اس بزم کی 'سلیم' آخری شمع تھے' افوس وہ بھی نہ رہے! --

حضرت ' سلیم ' بےشک وریب ادب کے آفتاب تھے' وہ اس زمانے کی یاد گار تھے جسے آسمان نے بہت سی گردشوں کے بعد پیدا کیا تھا ---

نثر و نظم دونوں پر انہیں ایک ہی سی قدرت حاصل تھی ' ایسے ایسے نادر مضامین ' اور پاکیزہ نظمیں مرحوم کی قلم سے نکلی ہیں جنہیں " روح ادب '' کہنازیبا ہے - مرحوم زبان اردو کے محقق ہی نہ تھے' بلکہ سیاسیات کے بھی زبردست معلم تھے - جب کبھی کسی سیاسی مسئلے میں ان سے گفتگو ہوتی تو ان کے تبحر علمی اور اصابت رائےکا صحیح حال معلوم ہوتا تھا —

" کان پور" کی مچھلی بازار والی مسجد کے واقعے کو ابھی بہت دن نہیں گزرے ' اُس پر آشوب زمانے میں بڑے بڑے لوگوں کا ایمان متزلزل ہوگیا تھا' مگر مولانا ' سلیم ' ایک سخت چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے ' —

سنہ ۱۹۱۳ ع میں جب مسلم گزٹ مرحوم کا قلمدان ادارت مولانا کو تفویض ہوا تو مسلمانوں کی پولیٹیکل روش کے متعلق کوئی انقلابی خیال اُن کے پیش نظر

نہ تھا' لیکن اُس وقت ایسے اسباب جمع ہوگئے تھے کہ مولانا کو رفتار زمانہ کے ساتھ اصلاح و تغیر کی صدا بلند کرنی پڑی' اور بالآخر مسلم گزٹ کے اسلحہ خانہ سے آزادی رائے اور حریت فکر کی ایسی خون آ شام تلواریں نکلیں' جنھوں نے باطل پرستوں کی صفوں کو اُلٹ دیا —

''مسلم گزٹ'' نے اپنی یک سالہ زندگی میں ایسی مقبولیت حاصل کرلی تھی کہ اس کی اشاعت برق کی طرح تمام اکناف ملک میں پھیل گئی تھی' اور اس کی آمد کے انتظار میں لوگ بے چین رہا کرتے تھے —

صداقت پرستی' اور قوم کی صحیح نمایندگی کی بدولت حکومت کے زبردست پنجوں نے ''مسلم گزٹ'' کی ادارت ان کے ہاتھ سے چھین لی تھی' لیکن جب تک عنان ادارت اُن کے ہاتھ میں رہی' ملک و ملت کی وہ ترجمانی کی' جس کی نظیر آسانی سے نہیں مل سکتی —

''مسلم گزٹ'' مرحوم اُن کے جذبات حریت اور انشاپردازی کا بہترین آئینہ ہے' جب کبھی اُردو کے اسالیب پر کسی محقق کا قلم اُٹھے گا تو 'سلیم' کی انشا اُسے بہت بلند نظر آئے گی —

''مسلم گزٹ'' سے تعلق منقطع ہونے کے تھوڑے دنوں بعد مولانا کی خدمت میں ''زمیندار'' کی چیف اڈیٹری پیش کی گئی' اور اُس کے ہاتھ میں لیتے ہی مولانا نے ''زمیندار'' کو چار چاند لگادیے! ۔ کلک سلیم نے وہ جولانیاں دکھائیں کہ چند ہی روز میں ''زمیندار'' کی اشاعت بیس ہزار روزانہ تک پہنچ گئی' اور اسٹیٹسمین کے بعد ''ہندوستان'' کے تمام اردو' ہندی' اور انگریزی' جرائد سے نمبر لے گیا' مگر گردش فلک کب چین لینے دیتی ہے' باد سموم کے جھونکے چلنے لگے' صداقت و حریت کے باغ پر خزاں حملہ آور ہوئی' ''زمیندار'' ''استبداد'' کے شکنجے میں کسا گیا' مطبع پر ضابطۂ تعزیرات قابض ہو گیا' مولانا نے لاہور کو الوداع کہا' اور پانی پت واپس تشریف لے آئے —

جناب "سلیم" نے اردو کی ٹکسال سے ایسے بے مثل سکے ڈھال کر چلائے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ یہ سکے دلی کے ہیں یا لکھنؤ کے؟ نئے الفاظ کا ذخیرہ جو اُردو کے روزمرہ میں شیر و شکر ہو رہا ہے اور جسے بے تکلف ہم استعمال کرتے ہیں، حضرت "سلیم" کا بہت کچھ رہین منت ہے! معلوم نہیں کتنے الفاظ انہوں نے وضع کئے اور چلا دیے —

وضع ' اصطلاحات علمیہ'' جو ''انجمن ترقی اُردو'' کی ملک ہے، مولانائے مرحوم کی پچاس سالہ کاوش دماغی کا نتیجہ ہے۔ جو زرین اصول اُس میں ثبت ہیں، ذوق ادب رکھنے والوں کے لئے مشعل ہدایت کا حکم رکھتے ہیں—

علم و فضل کا یہ گوہر شب چراغ اگر سر زمین یورپ میں ضیاگستر ہوتا تو آج اس کی حیات و ممات پر اخبارات کے سیکڑوں صفحات ماتم میں سیاہ کیے جاتے اور معلوم نہیں کس کس طرح سے یادگاریں قائم کی جاتیں مگر افسوس! "ہندوستان'' جہاں اہل ہنر کے مقد موتیوں سے بھرے جاتے تھے، آج ایسا بے حس ہوگیا ہے کہ اپنے لائق ترین فرزندوں کی بھی قدر نہیں جانتا! خدا بھلا کرے مولوی عبدالحق صاحب کا کہ ان کی توجہ سے مرحوم کی یہ بے مثل کتاب طبع ہوگئی، ورنہ صدہا نادر کتابوں کی طرح یہ بھی کیڑوں کی نذر ہوجاتی —

"سلیم" صاحب کی تمنا تھی کہ "فرہنگ آصفیہ'' کی از سر نو ترتیب دی جائے اور ہندوستان کے مشہور ادیب اس کام میں شریک ہوکر، اس کے رطب و یابس پر غور کریں اور حشو و زوائد سے پاک کرکے، کتاب کو جدید و قدیم الفاظ اور بہت سے محاورات سے جو نظر انداز ہوگئے ہیں، مزین کرکے از سر نو طبع کرایا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ تجویز خوب تھی، مگر وقت اور سرمایے کا سوال تھا، ''سرکار آصفیہ'' اگر سرپرستی نہ فرماتی تو یہ فرہنگ موجودہ خط و خال کے ساتھ منصۂ شہود ہی پر نہ آتی —

شاعری . مولانا ''سلیم'' کے لئے ذریعۂ عزت نہ تھی، اپنے نام کے ساتھ اُسے منسوب

کرنا فخر نہ سمجھتے تھے' در حقیقت وہ جامع حیثیت بزرگ تھے۔ ادب' فلسفہ' تاریخ' جغرافیۂ اسلام' اور دیگر علوم میں اُنھیں کامل دستگاہ تھی' اور یہی وجہ ہے کہ جب کبھی کسی علمی بحث پر تقریر فرماتے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بحر زخار اُمڈا چلا آرہا ہے —

بے شمار نظمیں "سلیم" نے لکھیں' اُن میں سے کے نام سے اکثر بے نام اور بعض اُن ہندوستان کے مشہور جرائد و رسائل میں شائع ہوچکی ہیں' اس دور ترقیات میں مولانا نے ایسی ایسی نظمیں لکھی ہیں' جو نہ محض ادب اردو کی زیب و زینت رہیں گی' بلکہ اُن میں وہ لطیف اشارے ہیں' جن سے سیاست حاضرہ پر ایک دفتر تیار ہوسکتا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ مرحوم کی نظموں کا مجموعہ اور "قلم نامہ" کا مسودہ "انجمن ترقی اُردو" کے روح رواں اور ہندوستان کے مشہور ادیب جناب مولانا عبدالحق صاحب کے قبضے میں آگیا ہے' یقین ہے کہ یہ جواہر ریزے "وضع اصطلاحات علمیہ" کی طرح پبلک کے ہاتوں میں جلد آجائیں گے —

چند سال سے بلدۂ حیدرآباد میں جناب باغ شاگرد حضرت داغ ایک مشاعرہ ترتیب دیتے ہیں' اس مشاعرے میں خاص احباب کے اصرار سے مولانا بھی شرکت فرمایا کرتے تھے' مولانا کی شاعری گل و بلبل سے بہت دور تھی' اس میں مناظر قدرت' اور معارت ملت کے نمونے بہت ہوتے تھے' بزم مشاعرہ میں جناب سلیم' مولانا علی حیدر طباطبائی' اور مرزا لبیب' خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں' گو اور خوشگو شعرا بھی مشاعرے کو اپنے کلام سے مزین فرماتے تھے' مگر سلیم صاحب کی شاعری اپنے اچھوتے خیال اور پاکیزہ جذبات کے لحاظ سے نہایت بلند پایہ ہوتی تھی —

مولانا زبردست سے زبردست قصائد اُردو' اور فارسی میں لکھکر لوگوں کو دے دیا کرتے تھے' سید علی اکبر بلگرامی مرحوم نے جو 'جشن' بلگرامی کے خلف اکبر تھے' جتنے فارسی کے قصائد حضور نظام (خلداللہ ملکہ) کی بارگاہ میں پیش کئے وہ سب مولانا 'سلیم' کے رشحات قلم کا نتیجہ تھے۔ معتبر ذریعے سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ

بندگانِ عالی بھی اُن قصائد کو پڑھ کر لطف اندوز ہوتے تھے' کسی کو کیا معلوم کہ پس پردہ ان قصائد کا کون مصنف ہے؟ مجھے مولانا کی خدمت میں تقرب حاصل تھا' میں اس راز سے واقف ہوں' انھیں قصائد کے طفیل میں مرحوم علی اکبر کو تحصیلداری کی مستقل خدمت ملی تھی - سچ یہ ہے کہ مولانا مرحوم بڑے قادرالکلام تھے - مولانا حالی مرحوم' اُن کے طرز بیان اور ندرت خیالات پر اکثر محو ہوجاتے تھے' اور اُنھیں شاعری کا دیوتا فرمایا کرتے تھے' افسوس ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے نہ تو مولانا کی کوئی بیاض ہے اور نہ اُن کے وہ جگر پارے ہیں' جنھیں ہم نے اپنے مخزن میں جمع کر رکھا تھا - ایک دوم فرمانے' جو ہماری کشکول عاریتاً لے گئے تھے' باوجود تقاضوں کے آج تک واپس نہیں کی - مجبوری ہے ورنہ ہم ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے مولانا کا کچھ کلام ھدیۃ پیش کرتے - انشاءالله مولانا عبدالحق صاحب کی توجہ سے حضرت 'سلیم' کا کلام جلد زیور طبع سے آراستہ ہوجاے گا —

جس طرح جناب "غالب" کا کلام مرنے کے بعد بلند ہوا' اُسی طرح "سلیم" کی شاعری بھی دلچسپی اور قدر سے دیکھی جاے گی' "قدر مردم بعد مردن" —

مولانا کی نثر اُن کی زندگی میں سند مانی جاتی تھی' ان کی شاعری کی کرنیں ہنوز کافی طور سے پھیلنے نہ پائی تھیں کہ ہم سے چھین لئے گئے' جو کچھ بھی اُنھوں نے کہا ہے وہ ادب اُردو کا لاثانی ذخیرہ ہے --

مولانا اپنے علم و فضل کے ساتھ' نہایت ہی بزلہ سنج واقع ہوے تھے - طبیعت میں بے ساختگی اور روانی تھی' کہیں رکتے ہی نہ تھے' برجستہ ایسے بلیغ اور تیز فقرے چست کرتے تھے کہ حریف منہ دیکھتا رہ جاتا تھا' ظرافت کس و ناکس کا حصہ نہیں' یہ بھی خدا کی دین ہے' معانی کا وہ خزانہ قدرت نے اُن کے سینے میں جمع کیا تھا کہ مضامین اور فقرات کا قلزم اُبلتا تھا - "جامعۂ عثمانیہ" کے احباب بالخصوص ڈاکٹر عبدالحکیم جن کی تواضع مولانا اکثر ظرافت سے فرمایا کرتے تھے - ہم سے زیادہ لذت آشنا ہیں - جاہ و شہرت کے طالب نہ تھے' مزاج میں سادگی اور

طبیعت میں استغنا تھا' کبھی کسی کے پاس اپنی حاجت نہیں لے گئے' عہدہ داروں کی دربار داری سے ہمیشہ دور رہے' اُن میں وہ جاذب قوت تھی کہ بڑے اور چھوٹے سب کھنچکر ان کے دروازے پر آجاتے تھے —

پان اور چاے سے مولانا کو بہت شوق تھا' جو آتا تھا اس کی تواضع انھیں دو چیزوں سے فرماتے تھے۔ پان کھانے کا یہ عالم تھا کہ دمبدم کتھے اور چونے کی چمچیاں چلتی رہتی تھیں' پان کھاتے جاتے تھے اور پیک ان کی قمیص اور اچکن کو رنگین بناتی رہتی تھی۔ بجاے دھونے کے' پان کے سرخ دھبوں پر اکثر چونہ لے کر انگلیوں سے قلعی کردیتے تھے' جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ قمیص اور اچکن میں سفید ٹکلیاں لگی ہوئی ہیں۔ جب کوئی ہندوستان جاتا تو لکھنؤ کے پان اور الہ‌آباد کے امرودوں کی فرمائش ضرور کردیا کرتے تھے —

چاے پینے کی شان یہ تھی کہ نمک کا ایک ڈلا چاے کی پیالی میں کئی بار گھولا جاتا تھا' اور جب اس میں نمک کی چاشنی آجاتی تو نکال لیتے اور اسی طرح کا جام بہ اصرار ہمنشینوں کو بھی عطا ہوتا تھا' الله ری سادگی' جس خلوص اور محبت سے یہ تحفے احباب کی نذر کئے جاتے تھے' اس کی قدر و قیمت کچھ محبت والے ہی جانتے ہیں —

"جامعۂ عثمانیہ" کی تعلیمی کونسل میں جب مسئلہ پیش ہوا کہ ادیب اُردو کی کرسی کس کو دی جاے؟ تو بالاتفاق یہ طے ہوا کہ بجز مولوی سلیم کے اور کوئی اس کا اہل نہیں ہے —

مولانا کی سعی اور درخواست بغیر' یہ ممتاز خدمت بارگاہ خسروی سے' انھیں کو عطا فرمائی گئی —

نواب سر حیدر نواز جنگ قدر شناس' اور علم دوست بزرگ ہیں' ان کی مساعی جمیلہ' اور مولانا عبدالحق صاحب کے قیمتی مشوروں سے عثمانیہ یونیورسٹی اس آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔حیدری صاحب جانتے تھے اور سمجھتے تھ

کہ حضرت سلیم کی ذات، نہ صرف اردو کے لئے مایۂ افتخار ہے، بلکہ وہ اپنی جامعیت کے لحاظ سے یورپ کے بڑے سے بڑے پروفیسر کے ہم پلّہ ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب "سیڈلر کمیشن" حیدرآباد میں آیا، اور اُس نے جامعۂ عثمانیہ کی تعلیم و تربیت کا معائنہ کیا تو مسٹر سیڈلر کی نظر انتخاب بھی مولانا ہی پر پڑی تھی، اور جب مولانا کلاس میں لیکچر دے رہے تھے، تو بے اختیار اُن کی زبان سے یہ جملہ نکلا تھا "اس شخص کا طریقۂ تعلیم نہایت سائنٹیفک ہے"۔ یہ معمولی ریمارک نہ تھا، حیدری صاحب یوں تو پہلے ہی سے مولانا کا لوہا مانے ہوئے تھے مگر اس تاریخ سے انھیں اور بھی زیادہ شیفتگی ہو گئی تھی —

"اصطلاحات علمیہ" پر مولانا "سلیم" کے زبردست لیکچر آج بھی "رسالۂ اردو" میں محفوظ ہیں، یہ وہ لیکچر ہیں جو فارمولوں اور اصطلاحات انگریزی کو زبان اردو کا قالب پہنانے سے متعلق ہیں۔ مولانا کے مسکت دلائل جو اس خصوص میں اُنھوں نے بیان فرمائے تھے، مخالفین کو بھی تسلیم کرنے پڑے —

"جامعۂ عثمانیہ" کے طلبہ میں قومیت، اور ادبیت، کی جو روح حضرت "سلیم" نے پھونکی ہے، ہمیں یقین ہے کہ اس کا نقش موجودہ اور آنے والے طالب علموں کی نسل میں زندہ رہے گا —

حقیقت یہ ہے کہ اُردو کا صحیح مذاق، دکن کے طالب علموں میں اس جامعہ اور اس کے پروفیسر مولانا وحیدالدین "سلیم" ہی نے پیدا کیا ہے۔ اُن کے بہت سے شاگرد اس وقت خوشگو شاعر اور اچھے انشا پرداز ہیں، جن کے مضامین ہندوستان کے جرائد میں اکثر و بیشتر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مولانا کے وہ نوٹس جو طلبہ کو کلاس میں لکھاتے تھے، معلومات کی انسائکلو پیڈیا ہیں، جن طلبہ نے اُنھیں احتیاط سے جمع کیا اور غور سے پڑھا، امتحان کی کامیابی اور ترقی استعداد میں اُن کے ممد و معاون ہوئے!

"جامعۂ عثمانیہ" کی بد قسمتی ہے کہ حلقۂ اساتذہ سے ایک زبردست حکیم

ادیب ' فلسفی ' اور شاعر اُٹھ گیا ' اُردو کا یہ قافلہ سالار آج آسودۂ خاک ہے '
اور ہندوستان اُس کے ماتم میں سوگوار —

مولانا کی ذات بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھی ' احباب انھیں یاد کریں گے '
اور روئیں گے' جو صدمۂ جانکاہ اِس سانحے سے ہمیں پہنچا ہے ' اُس کے بیان کی تاب
ہم میں نہیں ہے —

مرحوم کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی ' مگر اُن کے پہلو میں جوان دِل '
اور جوان ہمت تھی' اُن کی اُمنگیں زندہ تھیں ' سینے میں بہت سے ارادے اور
بہت سی قوتیں رکھتے تھے' سخت سے سخت آزمایش کے وقت بھی ہم نے اُنھیں ثابت
قدم پایا' مرحوم میں خاص خوبی تھی کہ وہ مرنج و مرنجاں تھے ' اُن میں اُس خلوص
و محبت کی بو آتی تھی' جس کے قصے ہم نے بزرگوں سے سنے ہیں —

مولانا مذھباً حنفی تھے ' مگر غیر متعصب اور آزاد منش مسلمان تھے ' بعض
مضامین اُن پر دھریت کا الزام لگاتے ھیں' مگر وہ پکّے موحد تھے اور سردار
دو جہاں (روحی فداہ) کے ذکر پاک پر اُن کی آنکھیں پر نم ھوجاتی تھیں- اُن میں
"قل اُعوذیت" نہ تھی' وہ نہایت سنجیدہ خیال مسلمان تھے' علی گڑھ والوں کے شیدائی
تھے ' اور " ھند سلم اتحاد " کے دل سے حامی تھے —

مولانا سلیم صاحب سے اُن کی تاریخ ورود حیدرآباد سے ' جب وہ اول اول یہاں
آکر العلام مولانا حمیدالدین صاحب فراھی کے ھاں مقیم ھوے ' ھمیں شرف ملازمت
حاصل تھا ' اُن کے چند ماہ کے قیام کے بعد ' جب میں معتمدی فوج میں منتظم تھا'
میرے ھمراہ دفتر کی عمارت کے اُس حصے میں' جو مجھے قیام کے لئے نواب نذیر
جنگ بہادر معتمد وقت نے مرحمت فرمایا تھا ' اور جہاں حیدرآباد میں جسٹس
محمود بھی مقیم رہے تھے'مولانا اُٹھ آے اور عمارت کےزیریں حصے میں قیام فرمایا'
چار سال تک شب و روز مولانا کی خدمت کا مجھے موقع ملا —

" جامعۂ عثمانیہ " کی داغ بیل پڑ چکی تھی ' مترجمین اور پروفیسروں

کی تلاش تھی ' مولانا عبدالحق صاحب جن کے ہاتھ میں سرشتۂ تالیف و ترجمہ کی اُس وقت باگ تھی' چیدہ آدمیوں کی جستجو کر رہے تھے - ہندوستان سے مراسلت جاری تھی ' مولانا سلیم اس سلسلے کی پہلی کڑی تھے' جو مولوی عبدالحق صاحب کی مساعی سے " جامعہ " کی سلک میں داخل کر لیے گئے - جامعہ کے ساتھ ساتھ سرشتۂ تالیف و ترجمہ بھی معرض وجود میں آیا ' اور وضع اصطلاحات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ' جس کے ارکان میں مولانا وحیدالدین صاحب ' سلیم ' خاص طور پر قابل ذکر ہیں حضرت ' سلیم ' نے اپنے ذہن رسا اور تبحر علمی سے اصطلاحات سازی میں وہ بیش بہا خدمات انجام دیں ' جو کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں- جملہ علوم و فنون کی اصطلاحات اس کمیٹی کے اراکین کے مشوروں سے بنائی جاتی ہیں ' اور غلبۂ آرا سے فیصلہ ہوتا ہے - یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اکثر و بیشتر مولانا سلیم ہی کے مشورے کو فوقیت حاصل ہوتی تھی —

وہ ہٹ دھرم نہ تھے ' اگر کسی کا مشورہ اُن سے بہتر ہوتا تو اُسے خوشی سے قبول فرمالیتے تھے - مولانا کی صحبت فیض اثر سے مستفید ہونے کا ہمیں دس سال تک موقع ملا ہے ' اس مضمون میں جو باتیں مولانا سے سنیں ' اور اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیں وہی لکھی گئی ہیں - اساتذۂ فارسی کی چند مشہور اور ممتاز تصانیف کے درس لینے کا شرف ہمیں بھی حاصل ہے ' ہمارے لیے مولانا کی صحبت آغوش ادب سے کم نہ تھی —

جامعۂ عثمانیہ کے اکثر پروفیسر مولانا کی وسیع معلومات علمی سے فائدہ اُٹھانے کے لئے آتے تھے اور بعض تو اُن سے پڑھ کر کالج میں درس دیتے تھے ' یہ ہمارے عینی مشاہدات ہیں —

ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی جو اُس وقت پرنسپل تھے ' اور جا ہوں پہلے سے مولانا کی خدمت میں نیاز حاصل تھا ' مولانا کی معلومات علمی کے سامنے دنگ رہ جاتے تھے' اور جس مضمون لسانیات (فلالوجی) میں اُنھوں نے جرمنی سے ڈگری

حاصل کی تھی، اُس کی نسبت مولانا سے جب کبھی تبادلۂ خیالات ہوتے تو یہ کہتے تھے کہ "مولوی صاحب ! یہی مطالب میرے جرمن استاد نے مجھے بتائے تھے"—

بعض الفاظ کے متعلق ڈاکٹر صاحب یہ کہتے تھے کہ "مولوی صاحب ! آپ کی نظر بہت وسیع ہے، جو میری تحقیقات ہے وہی آپ فرما رہے ہیں"۔ غور فرمائیے! جناب سلیم، جرمنی اور انگریزی زبان سے واقف نہ تھے، مگر اُن کے تبحر علمی کا یہ عالم تھا کہ تحقیقات لسانی میں بھی اُنھیں ید طولیٰ حاصل تھا—

بارہا علمی اور سیاسی مسائل پر ہم سے اور اُن سے گفتگو ہوتی تھی، مگر کبھی سطحی بات اُن کی زبان سے نہیں سنی۔ آہ! حضرت سلیم اب کہاں؟ اُن کے واقعات افسانہ ہیں—

اس محسن اور مربی اُردو کی ہندوستان بالخصوص "جامعۂ عثمانیہ" میں یادگار کا قائم ہونا ضروری ہے۔ امید ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے ارباب حل و عقد یونیورسٹی میں "سلیم چیر" قائم کر کے حضرت سلیم کی قدر اور اپنی علم دوستی کا ثبوت پیش کریں گے—

مولانا دانتوں کے مرض میں عرصے سے مبتلا تھے، ڈاکٹروں کے مشوروں سے دانت نکلوائے، بائیں جانب کی ڈاڑھ نے بہت ستایا، ڈاکٹر عثمان رکن دارالترجمہ اور ہم نے اُن کے علاج میں امکان بھر کوشش کی، مختلف ڈاکٹروں کے پاس اُنھیں لیکر گئے، علاج کرایا، ہر طرح کے علاج میں سہولت فراہم کی، مگر (ع) مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی —

سکندر آباد کے اسپتال میں ہم نے داخل کرایا، ایک ماہ تک وہاں رہے، مرض میں کبھی کمی اور کبھی زیادتی ہوتی رہی، بالآخر وہاں سے چلے آئے۔ ڈاکٹر خورشید حسن صاحب کے پاس جو افضل گنج اسپتال کے بہترین سرجن ہیں، اُنھیں لیکر گیا، اُنھوں نے دو چار دن علاج کے بعد یہ مشورہ دیا کہ "آپ مولانا کو رانچی بھیجدیجیے! وہاں اس مرض کا ریڈیم کے ذریعے سے علاج ہوتا ہے، اگر اچھے ہوئے؟ تو وہیں سے اچھے ہوسکیں گے"۔ ڈاکٹر صاحب کے مشورے کے بعد ہمارے دل میں ایک

خلش پیدا ہوگئی تھی کہ مرض سخت ہے ' خدا ہی ہے جو مولانا کو صحت ہو —

ڈاکٹر صاحب کے مشورے کے بعد مولانا رانچی گئے ' مگر وہاں ازالۂ مرض تو کجا اور زیادہ نحیف ہو گئے ۔ جب مولانا کے پاس سے عرصے تک کوئی خط نہیں آیا تو رانچی انسٹیٹیوٹ کے سرجن کو ہم نے ایک خط لکھا اور مولانا کی صحت دریافت کی ' مگر جو خط اُس کے پاس سے جواب میں آیا تھا ' وہ نہایت مایوس کُن تھا ' ہمیں معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنے عزیز دوست ڈاکٹر عبدالکریم صاحب کو لکھا تھا کہ اپنے پاس ' ملیح آباد ' کسی آدمی کو بھیجکر بلا لیں ۔ ڈاکٹر صاحب نے آدمی بھیجا ' ملیح آباد آئے ' علاج کیا ' کچھ فائدہ نہ ہوا ' میڈیکل کالج لکھنؤ میں علاج کے لئے گئے ' مگر قسمت نے وہاں بھی یاوری نہ کی ' حالت یوماً فیوماً زار ہوتی گئی ۔۔

مولانا کی آرزو تھی کہ یا تو ڈاکٹر عبدالکریم صاحب کے پاس ' یا ہمارے پاس ان کی آخری منزل ہو ۔ حیف ہماری قسمت میں یہ سعادت نہ تھی کہ ہم مولانا ــــے مرحوم کی آخری خدمت انجام دیتے ' یہ نصیب ڈاکٹر صاحب کا تھا —

دنیا کے بڑے بڑے ناموروں کی طرح حضرت سلیم ' کو بھی عشرۂ قتالہ میں سفر آخرت طے کرنے کا مرتبہ ملا ہے ۔ کئی ماہ کی علالت کے بعد گیارہ صفر سنہ ۱۳۴۷ ھ کو شب کے آخر حصے میں وہ آفتاب علم و فضل ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا ۔

" انا للہ و انا الیہ راجعون " —

ایک وصیت کی تعمیل

از

(جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی اے)

خدا بخشے مولوی وحیدالدین سلیم بھی ایک عجب چیز تھے - ایک نگینہ سمجھئے کہ برسوں ناتراشیدہ رہا - جب تراشا گیا - پہل نکلے - چمک بڑھی - اہل نظر میں قدر ہوئی - اُس وقت چٹ سے ٹوٹ گیا - شہرت بھی 'غالب' کے قصیدے کی طرح آج کل کسی کو راس نہیں آتی - اِدھر نام بڑھا اور اُدھر مرا - صف سے آگے نکلا اور تیر قضا کا نشانہ ہوا - چل چلاؤ کا زور ہے - آج یہ گیا - کل وہ گیا - مولوی نذیر احمد گئے ' شبلی گئے ' حالی گئے ' وحیدالدین گئے - اب بڑوں میں مولوی عبدالحق رہ گئے ہیں - ان کو بھی شہرت کی ریہ لگ گئی ہے' سوکھے چلے جا رہے ہیں - کسی دن یہ بھی خشک ہو کر رہ جاوینگے - یہ تو جو کچھ تھا سو تھا ' ایک نئی بات یہ ہے کہ آج کل کا مرنا بھی کچھ عجب مرنا ہوگیا ہے - پہلے زندگی کو چراغ سے تشبیہ دیتے تھے ' بتی جلتی' تیل خرچ ہوتا ' تیل ختم ہونے کے بعد چراغ جھلملاتا ' ٹمٹماتا ' او بیٹھنی شروع ہوتی اور آخر رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہو جاتا - اب چراغ کی جگہ زندگی بجلی کا لیمپ ہو گئی ہے - ادھر بٹن دبا اور ادھر اندھیرا گھپ - عظمت اللہ خاں' اسی طرح مرے' مولوی وحیدالدین اسی طرح رخصت ہوے ' اب دیکھیں کس کی باری ہے - اردو کی مجلس میں دوچار لیمپ جل رہے ہیں' وہ بھی کسی وقت کھٹ سے گل ہو جاوینگے' اس کے بعد بس اللہ ہی اللہ ہے-

میں مدت سے حیدرآباد میں ہوں - مولوی وحیدالدین بھی برسوں سے یہاں تھے ' لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا - انہیں ملنے سے فرصت نہ تھی ' مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی - آخر ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب مرنے کو تیار بیٹھے تھے - گزشتہ سال کالج کے جلسے میں مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا - روانہ ہونے کے لئے جو حیدرآباد کے اسٹیشن پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسٹیشن کا اسٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے - طالب علم بھی ہیں ماسٹر بھی ہیں کچھ ضرورت سے جارہے ہیں ' کچھ بے ضرورت چلے جارہے ہیں - کچھ واقعی مہمان ہیں ' کچھ بن بلائے مہمان ہیں - غرض یہ کہ آدھی ریل انہی اورنگ آباد کے مسافروں نے گھیر رکھی ہے - ریل کی روانگی میں دیر تھی - سب کے سب پلیٹ فارم پر کھڑے غپیں مار رہے تھے - میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کررہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے بڑے بڑے ڈگ بھرتے میری طرف چلے آرہے ہیں - متوسط قد ' بھاری گٹھیلا بدن ' بڑی سی توند ' کالی سیاہ فام رنگت ' اس پر سفید چھوٹی سی گول ڈاڑھی ' چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں ' شرعی سفید پاجامہ ' کتھئی رنگ کے کشمیرے کی شیروانی ' سر پر عنابی ترکی ٹوپی ' پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتہ - آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگالیا - حیران تھا کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے - کیا امیر حبیب اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے - جب ان کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چور ہوگئیں ' اس وقت انہوں نے فرمایا "میاں فرحت! مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا - جب سے تمہارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے ' کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آکر ملوں مگر موقعہ نہ ملا - قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا - بھئی! مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا ' مرنے کے بعد بھی اُن کا نام زندہ کردیا ' افسوس ہے ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا جو مرنے کے بعد اسی رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا "

میں پریشان تھا کہ یاالله یہ ہیں کون اور کیا کہہ رہے ہیں ۔ مگر میری زبان کب رکتی ہے میں نے کہا "مولوی صاحب! آپ گھبراتے کیوں ہیں، بسم الله کیجئے مرجائیے، مضمون میں لکھ دوں گا " ۔ کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مرجائیں گے اور مجھے ان کی وصیت کو پورا کرنا پڑے گا ۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحیدالدین 'سلیم' ہیں تو واقعی مجھے بہت پشیمانی ہوئی ۔ میں نے معذرت کی، وہ خود شگفتہ طبیعت لےکر آئے تھے ' رنج تو کجا بڑی دیر تک ہنستے اور اس جملے کے مزے لیتے رہے ۔ سر ہوگئے کہ جس گاڑی میں تو ہے ' میں بھی اسی میں بیٹھوں گا ۔ شاگردوں کی طرف دیکھا ' انھوں نے ان کا سامان لا میرے درجے میں رکھ دیا ۔ ادھر ریل چلی اور ادھر ان کی زبان چلی ۔ رات کے بارہ بجے ' ایک بجا ' دو بج گئے ' مولوی صاحب نہ خود سوتے ہیں اور نہ سونے دیتے ہیں ۔ درجۂ اول میں ہم تین آدمی تھے ۔ مولوی صاحب میں' اور رفیق بیگ' رفیق تو سوگئے' ہم دو نے باتوں میں صبح کردی ۔ اپنی زندگی کے حالات بیان کئے ' اپنے علمی کارناموں کا ذکر چھیڑا ' اصطلاحات زبان اُردو پر بحث ہوتی رہی ' شعر و شاعری ہوئی ؛ دوسروں کی خوب خوب برائیاں ہوئیں ' اپنی تعریفیں ہوئیں ۔ مولوی عبدالحق کو برا بھلا کہا کہ اس بیماری میں مجھے زبردستی کھینچ بلایا ۔ غرض چلد گھنٹے بڑے مزے سے گزر گئے ۔ صبح ہوتے ہوتے کہیں جاکر آنکھ لگی ۔ شاید ہی کوئی گھنٹہ بھر سوئے ہوں گے کہ ان کے شاگردوں اور ساتھیوں نے گاڑی پر یورش کردی ۔ پھر اٹھ بیٹھے اور پھر وہی علمی مباحث شروع ہوئے ۔ پھبتیاں اُڑیں ' اس کو بے وقوف بنایا ' اس کی تعریف کی ۔ ہنسی اور قہقہوں کا وہ زور تھا کہ درجے کی چھت اُڑی جاتی تھی ۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ کو تو نواب مسعود جنگ اپنے پاس لے گئے اور یہاں اورنگ آباد تک وہی غل غپاڑہ رہا —

میں شاعر نہیں ہوں ' ہاں بعض دفعہ دوستوں کی فرمائش سے زبردستی شعر کہتا ہوں ۔ مجھے بڑا تعجب ہوا' جب مولوی صاحب نے کہا " فرحت تو شاعر ہے'

کیوں اس جوہر کو خاک میں ملا رہا ہے، ہو سکے تو کچھ کہہ لیا کر" - میرے ایک قطعۂ تاریخ سے ایسے خوش ہوئے کہ اسی وقت اٹھ قلم دوات نکال وہ قطعہ لکھ لیا - آپ بھی سن لیجئے، کہتے ہیں کہ نئی طرز کی تاریخ ہے، ہوگی - ہم کو تو نہ اس کے لکھنے میں دماغ سوزی کرنی پڑی اور نہ اس کی کوئی قدر ہے، ہاں قطعے سے پہلے اس کی شانِ نزول سن لیجیے واقعہ یہ ہے کہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کے دماغ میں یورپ جانے کے خیالات ہمیشہ چکر لگاتے تھے، پیسہ پاس نہیں تھا، مگر چاہتے تھے کہ ساری دنیا میں پھریں اور وہ بھی اس طرح نہیں جس طرح امریکہ والے پھرتے ہیں، بلکہ اس طرح جیسے پہلے زمانے کے سیاح پھرتے تھے - ادھر کوشش کی ادھر کوشش کی، آخر سرکار سے منظوری ہو ہی گئی - ڈھائی تین برس میں سارا یورپ چھان مارا - شمالی افریقہ کے سب ملک دیکھ لئے - عراق، عرب، شام، ترکی غرض سینکڑوں ملکوں کی سیر کی - آئے اور بڑی دھوم دھام سے آئے - وہ نام پیدا کیا کہ خدا سب کو نصیب کرے - دوستوں نے مجھ سے تاریخ کہنے کا تقاضا کیا - مار مار کر شاعر بنایا - تاریخ ہوئی ہے : —

پھر پھرا کر جو اک دوست سفر سے آئے
بار تاریخ کا ڈالا گیا میرے سر پر

دوستوں کا ہے تقاضا کہ اٹھو جلد لکھو
میں بھی شاعر ہوا اللہ کی قدرت ہے مگر

میرے انکار سے احباب نہ رنجیدہ ہوں
اس لئے لکھتا ہوں تاریخ بہت تر تر کر

ایک طائر کو قفس میں تھا خیالِ گلشن
پر سمیٹے ہوئے بیٹھا تھا جھکائے ہوئے سر

رحم کچھ آگیا صیّاد کے دل میں شاید
ہٹ گیا سامنے سے ایک طرف کھول کے در

در کھلا پایا تو آہستہ سے طائر نکلا
پھر چلا تیر سا گلشن کی طرف مار کے پر

خوب دل بھر کے مزے زمزمہ سنجی کے لئے
خوب دل کھول کے باغوں میں لگائے چکر

پھٹتا وہ گردشِ افلاک سے آخر کب تک
ہوتا کب تک نہ زمانے کے تغیر کا اثر

آب و دانہ اسے پھر کھینچ کے لایا سوئے دام
باندھے صیاد نے پھر طائرِ آزاد کے پر

لکھی "فرحت" نے ہے کس زور سے فصلی تاریخ
پھر وہی کنجِ قفس پھر وہی صیّاد کا گھر

۲۱۳ ۱۱۲۰

• (س) اور

میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کوشش کی کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا اندازہ لگاؤں ۔ پہلے تو ذرا بند بند رہے - لیکن آخر میں بالکل کھل گئے - میں نے جو رائے ان کے متعلق قائم کی ہے وہ سن لیجئے - سب سے پہلے تو یہ ہے کہ اُن میں ظرافت کا مادہ بہت تھا - لیکن یہ ظرافت اکثر رکاکت کی صورت اختیار کر لیتی تھی - کسی کو برا بھلا بھی کہتے تو ایسے الفاظ میں کہتے کہ سننے سے تکلیف ہوتی - اور جب کہنے پر آتے تو پھر یہ نہ دیکھتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کس کے سامنے کہہ رہا ہوں - نتیجہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ لوگ ادھر سے اُدھر لگا دیتے اور مولوی صاحب کی کسی نہ کسی سے بگڑ جاتی - شاید ہی کوئی بھلا آدمی ہوگا جو سچے دل سے اُن کو چاہتا ہو - ان کے علم ' ان کی سمجھ ' ان کی زود فہمی اور ان کی طبع رسا کی سب تعریف کرتے ہیں ' لیکن ان کی طبیعت کے سب شاکی ہیں - اور وہ خود بھی اس سے بیزار ' اُس سے بیزار ' مجھ سے بیزار ' تم سے بیزار - غرض اپنے سوا ساری دنیا سے بیزار تھے - بات یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کی وہ وہ ٹھوکریں اُٹھائی تھیں کہ خدا کی پناہ - خاصا بھلا چنگا آدمی دیوانہ ہو جائے - اگر .... مولوی صاحب کی طبیعت پر ان مصیبتوں نے اتنا اثر کیا تو کیا تعجب ہے - جب کسی نا اہل کو بڑی خدمت پر دیکھتے تو ان کے آگ لگ جاتی - ریل میں دو ایک بڑے شخصوں کا ذکر آیا - انھوں نے ہر دفعہ یہی کہا " ارے میاں گدھا ہے ' ایک سطر صحیح نہیں لکھ سکتا - اور دیکھو تو کون ہیں کہ نواب صاحب' ہم کو دیکھو تمام عمر علم حاصل کرنے میں گذار دی ' اس اخبار کی اڈیٹری کی' اُس رسالے کے منیجر ہوئے ' سر سید کی خدمت میں سر گاڑی پاؤں پہیہ کیا' اب جو چند روپلی مل رہے ہیں تو فلاں صاحب جلے جاتے ہیں ' خبر نہیں کبھی ہوتے تو گلا ہی گھونٹ دیتے- میں نے کہا" مولوی صاحب! یہ دنیا ہے آخرت نہیں ہے کہ جیسے ہو گے ویسا پھل ملیگا - یہاں اہل کہاں ہمیشہ آشفتہ حال رہے ہیں - آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا دل جلاتے ہیں - جو اللہ نے دیا ہے بہت ہے " نہ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا " مزے کیجئے

بہت گئی ہے تھوڑی رہی ہے - ہنسی خوشی یہ بھی گذار دیجئے " وہ بولا میری باتوں کو کیا سننے والے تھے - اُن کے تو دل میں زخم تھے - تمام عمر مصیبت اٹھائی تھی، نا اہلوں کو آرام و آسایش میں دیکھہ کر وہ زخم ہرے ہو جاتے تھے - زبان اپنی تھی ' کسی کا دینا نہیں آتا تھا - بے نقط سنا کر دل ٹھنڈا کرتے تھے -

زمانے کے ہاتھوں ان کی طبیعت میں ایک دوسرا انقلاب یہ بھی ہو گیا تھا کہ جتنی ان کی نگاہ وسیع ہوئی ' اتنا ان کا دل تنگ ہوا ' جتنی ان قلم میں روانی ہوئی، اتنی ان کی مٹھی بند ہوئی - میں ان کے پیٹھ پیچھے نہیں کہتا - جب ان کے منہ پر لکھہ چکا ہوں کہ مولوی صاحب ' آپ کی کفایت شعاری نے بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کرلی ہے تو اب لکھتے کیوں ڈروں ' واقعی بڑے ہی کنجوس تھے - ہزار روپے کے گریڈ میں تھے، دارالترجمہ سے بہت کچھہ مل جاتا تھا ' مگر خرچ کی پوچھو تو صفر سے کچھہ ہی زیادہ ہوگا - اس کی صراحت میں آگے چلکر کرونگا - ہاں ان کا یہ عذر سب کو ماننا پڑے گا کہ مفلسی کے پے درپے حملوں نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں - ان کو یہ بھی یقین نہ تھا کہ وہ اس خدمت پر کب تک ہیں اور کب نکال دیے جائینگے - خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھتے بھرنے کی فکر میں رہے - خود چل بسے جمع پونجی دوسروں کے لئے چھوڑ گئے - اور چھوڑ بھی اتنا گئے کہ بعض لوگوں کو افسوس ہوا کہ میں ان کا بیٹا کیوں نہ ہوا —

بہرحال یونہی ہنستے بولتے دو بجے اورنگ آباد پہنچ گئے - بڑے زور کا استقبال ہوا موٹروں میں لدکر اورنگ آباد کالج پہنچے - کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں سے وہاں تک خیمے ہی خیمے لگے ہیں - خیموں کے سامنے جلسے کا منڈوا ہے - منڈوے کے سامنے جو خیمہ تھا ' اس میں مجھے اور مولوی صاحب کو جگہہ ملی - مولوی صاحب کی طبیعت پہلے سے بد مزہ تھی - راستے کی تکان اور رات بھر جاگنے سے اور خراب ہوگئی - بخار چڑھ آیا - دو وقت کھانا نہیں کھایا ' تیسرے وقت بڑے کہنے سننے سے تھوڑا سا دودھ پیا - دوسرے روز ان کا لکچر تھا - طبیعت صاف نہیں تھی ' پھر

بھی بڑے میاں کو جوش آگیا - ٹرنک میں سے نیا جوڑا نکالا ، ریشمی شیروانی نکالی ، نئی ترکی ٹوپی نکالی ، اپنا میلا کچیلا جوڑا پھینک نیا پہن اس ٹھاٹھ سے جلسے میں آئے کہ واہ واہ - کھڑے ہو کر لکچر دینے کا دم نہ تھا - اسٹیج پر کرسی بچھا دی گئی - انہوں نے جیب میں سے چھوٹے چھوٹے نیلے کاغذ کے پرچوں کی ایک گڈی نکالی اور لکچر پڑھنا شروع کیا - میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ اسپیچ کے پڑھنے میں الفاظ کا زور کم ہو جاتا ہے ، مگر مولوی صاحب کے طرز ادائے میرا خیال بالکل بدل دیا - ان کے پڑھنے میں بھی وہی بلکہ اس سے زیادہ زور تھا جتنا بولنے میں ہوتا ہے - معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے تقریباً دو ہزار آدمی کا مجمع تھا مگر سناٹے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو آواز سن لو - لفظوں کی نشست ، زبان کی روانی اور آواز کے اُتار چڑھاؤ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آرہا ہے ، یا ایک برقی رو ہے کہ کانوں سے گزر کر دل و دماغ پر اثر کررہی ہے - برس روز ہوچکا ہے مگر اب تک وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے - میں نے بڑے بڑے لکچر دینے والوں کو سنا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ لکچر پڑھ کر ایسا اثر پیدا کرنے والا میری نظر سے کوئی نہیں گزرا - کچھ تو بات تھی کہ آخر آخر زمانے میں سرسید مرحوم اپنے اکثر لکچر انہی سے پڑھوایا کرتے تھے یا تو لکچر پڑھتے پڑھتے یہ خود منجھ گئے تھے یا یہ ان کی خدا داد قابلیت تھی جس کو دیکھ کر سرسید مرحوم نے اس کام کے لئے ان کا انتخاب کیا تھا - غرض کچھ ہی ہو اس میدان میں ان کا مد مقابل نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے —

اسی روز ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ اُس کا خیال کر کے اب تک مجھے ہنسی آتی ہے - " ۱۲۶۱ ہجری میں دہلی کا ایک مشاعرہ " اس جلسے میں زندہ کیا گیا تھا - وہی ساز و سامان ، وہی کپڑے اور وہی لوگ ، سو برس کے بعد پھر سامنے لائے گئے تھے - اسٹیج کے انتظام ہی کے لئے مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے پکڑ بلایا تھا - پہلے بہروپ اور نقلیں ہوتی رہیں - آخر پردہ گرا اور مشاعرے کا نمبر آیا -

تھوڑی دیر میں اسٹیج کا رنگ بدلنا کچھ آسان کام نہ تھا ۔ دریاں ' چاندنیاں ' قالین بچھانا ، گاؤ تکیے لگانا ، سامان جمانا ، مشعلیں جلانا ' غرض اتنا کام تھا کہ پردہ گرے گرے بڑی دیر ہوگئی ۔ اور لوگوں میں ذرا ہل چل ہونے لگی ۔ مجھے اس وقت سوا اس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ ایک چھوٹی سی تقریر کرکے اس بے چینی کوکم کروں ۔ میں نے کہا " یارو ! ذرا جلدی کرو ۔ دیر ہور ہی ہے ۔ مزا کرکرا ہوجائےگا ۔ میں باہر جا کر کچھ بولنا شروع کرتا ہوں ۔ تمہارا کام جب ختم ہو جائے تو سیٹی بجا دینا ۔ میں اپنی اسپیچ ختم کردوں گا " ۔ اتنا کہہ میں جھٹ باہر پردے کے سامنے آگیا ۔ مضمون سوچنے کا موقعہ نہیں ملاتھا' اس وقت یہی سمجھ میں آیا کہ اپنے مضمون کی تمہید کو ذرا مذاق میں ادا کردوں ۔ جن صاحبوں نے وہ مضمون پڑھا ہے' وہ واقف ہیں کہ میں نے اس مضمون کو مولوی کریم الدین صاحب مؤلف " طبقات شعراء " سے منسوب کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ مشاعرہ انہی کے مکان پر نواب زین العابدین خاں کی مدد سے ہوا تھا ۔ چنانچہ میں نے اپنے لکچر میں ابتداً اس زمانے کی دھلی کا نقشہ کھینچا اور پھر مولوی کریم الدین صاحب کا پانی پت سے دھلی آنا مذاقیہ پیرایے میں بیان کیا ۔ ان کی پھٹی ہوئی جوتیوں ' ان کے خاک آلودہ کپڑوں ' ان کی وحشت زدہ شکل اور ان کی مفلسی کا نقشہ خدا جانے کن کن الفاظ میں کھینچ کیا ۔ پھر ان کے دھلی میں آکر تعلیم پانے' مسجد کی روٹیوں پر پڑے رہنے' دوسروں کی مدد سے مطبع کھو لنے کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ آخر کس طرح اس مشاعرےکی اجازت ہوئی اور کس طرح دھلی کےتمام شعراءاس میں جمع ہوے ۔ میں اسپیچ دینے میں سیدھا کھڑا نہیں رہتا' کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلاتاہوں ۔ خدا معلوم مولوی کریم الدین کا حال بیان کر نے میں کیوں میرے ہاتھ کا اشارہ کئی دفعہ مولوی وحیدالدین 'سلیم' کی طرف ہو گیا ۔ مجھے تو معلوم نہیں' مگر جلسے میں اس نے کچھ اور ہی معنی پیدا کر لئے ۔ مولوی صاحب کے والد بھی پانی پت سے دھلی آئے تھے۔ کتابوں کا بیوپار کرتے تھے ۔ لوگ سمجھے کہ مولوی کریم الدین ہی مولوی وحیدالدین

کے والد تھے - ناموں کے ایک سا ہونے نے اس خیال کو اور تقویت دی - اب جو بھی وہ
وہ مولوی صاحب سے پوچھتا ہے " مولوی صاحب ! کیا مولوی کریم الدین صاحب
آپ کے والد تھے " - مولوی صاحب کے تاؤ کی کچھ نہ پوچھو ' دل ہی دل میں اونٹتے
رہے ' خدا خدا کر کے ڈیڑھ بجے مشاعرہ ختم ہوا - اسٹیج کے دروازے سے جو نکلتا ہوں
تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب دیوار سے چپکے کھڑے ہیں ' مجھے دیکھتے ہی
بپھر گئے - کہنے لگے " فرحت ! یہ سب تیری شرارت ہے - کریم الدین کو میرا باپ
بنادیا " - میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں - بڑی مشکل
سے مولوی صاحب کو ٹھنڈا کیا - وہاں سے لے جا کر خیمے میں بٹھایا ' پان بنا کر دیا '
سگریٹ پیش کیا ' جب جاکر ذرا نرم پڑے - اور واقعہ بیان کیا - میں نے کہا
" مولوی صاحب ! بھلا مجھ سے ایسی گستاخی ہوسکتی تھی - اول تو اس مذاق کا یہ
موقعہ ہی کیا تھا - دوسرے مجھے کیا معلوم کہ آپ کے والد کون تھے ' کہاں کے تھے '
دہلی آئے بھی تھے نہیں کتابیں بیچتے تھے یا کیا کرتے تھے" - کہنے لگے " تو کھڑی کھڑی
ہاتھ سے میری طرف کیوں اشارہ کرتا تھا " - میں نے کہا " مولوی صاحب ! اسپیچ
دینے میں ہاتھ کا اشارہ خود بہ خود اسی طرح ہوتا ہے - اب اگر اگلی صف میں
بیٹھ کر آپ اس اشارے کو اپنے سے متعلق کرلیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے "
بہر حال یہ بات لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسی جم گئی کہ مٹائے نہ مٹی - جب
تک اورنگ آباد میں رہے ' ہر شخص مولوی صاحب سے یہی سوال کرتا تھا " مولوی
صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے" - یہ کبھی تو ہنس کر چپ ہوجاتے
کبھی صرف جھڑک دیتے ' کبھی جل کر کہتے " جی ہاں میرے والد تھے ' کچھ آپ کا
دینا آتا ہے " - —

اورنگ آباد واپس آنے کے بعد میرا ان کے ہاں آنا جانا بہت ہو گیا تھا - جب
کچھ لکھتا ' پہلے ان کو جا کر سنا تا - بڑے خوش ہوتے ' تعریفیں کر تے ' دل بڑھاتے '
ہائے ان کے گھر کا نقشہ اس وقت آنکھوں میں پھر گیا - گھر بہت بڑا تھا' مگر خالی

تھلندار ' ساٹھ روپے مہینا کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے ۔ نہ بال نہ بچے نہ نوکر نہ ماما ۔ میں گیا ' باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا ' آواز آئی " کون " ۔ میں نے کہا " فرحت " ۔ اسی وقت کرتہ پہنتے ہوئے آئے' دروازہ کھولا ' اندر لے گئے ۔ برآمدے میں ایک بان کی چار پائی پڑی ہے' دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں۔ اندر ایک ذراسی دری بچھی ہے' اس پر میلی چاندنی ہے' دو چار چوھاچکٹ تکئے اور ایک بڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔ دیواروں پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین چار پرانے کیلنڈر لٹکے ہیں ۔ سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھ ٹُنڈا ٹوٹی چائے کی پیالیاں ' کنارے جھڑی رکابیاں ' ایک دو چائے کے ڈبے رکھے ہیں ۔ سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں' دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں ۔ نیچے دو تین پرانے کھڑنک جوتیوں کے جوڑے پڑے ہیں ۔ لیجئے ' مولوی صاحب کے گھر بار کا یہ خلاصہ ہے ۔ مولوی صاحب بیٹھے ہیں' سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں ۔ ایک پر پانی' دوسری پر دودھ جوش ہو رہا ہے ۔ چائے بن رہی ہے ۔ خود پی رہے ہیں ' دوسروں کو پلا رہے ہیں ۔ ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے ۔ چائے بنائی ' نمک کے ڈلے کو ڈال دو ایک چکر دے نکال لیا ۔ بس سارے دن ان کا یہی شغل تھا ۔ گھر میں برتن ہی نہیں تھے ' کھانا کیسے پکتا اور کون پکاتا ۔ خبر نہیں کہاں جا کر کھا پی آتے تھے ' کبھی میں گیا دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے' سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کہیں چرنے چگنے تشریف لے گئے ہیں ۔ میں نے کئی دفعہ پوچھا بھئی کہ مولوی صاحب! آپ کے ہاں کچھ پکتا پکاتا نہیں ۔ کہنے لگے "نہیں بھئی ' میں نے تو مدتوں سے کھانا چھوڑ دیا ہے ۔ صرف چائے پر گزران ہے " ۔ تم مان لو ' میں تو نہیں مانتا میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کو کھاتے اور خوب کھاتے دیکھا ہے ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنے گھر کا پکا نہیں کھاتے تھے اور کھاتے تو کیونکر کھاتے ۔ پکانے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا ۔ ماما رکھنی پڑتی ' سامان منگوانا ہوتا ' لکڑی کا خرچ ' تیل کا خرچ ' نون کا خرچ ۔ غرض اتنے خرچ کون اپنے سر باندھے اور اپنی بھلی چنگی جان

کو بیٹھے بٹھائے روگ لگائے - چائے بنائی اور پی لی - اِدھر اُدھر گئے، پیٹ بھر لیا، گھر آئے، بان کی کھری چارپائی پر لوٹ ماری - چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا۔ ان کی بان کی چار پائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی - ننگی پیٹھ اس پر لوٹتے تھے کہ بان صاف اور چمکدار ہو کر کالی اطاس ہو گیا تھا - ادوان خود کھینچتے تھے اور ایسی کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو تو طبلے کی آواز دے - خدا معلوم اب یہ چار پائی کس کے قبضے میں ہے - کسی کے پاس ہو، سونے میں تو بڑا آرام دیگی —

مولوی صاحب کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا - خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے - ان کے بھی یار دوست شاگرد غرض کوئی نہ کوئی ان کو مٹھائی پہنچاتا ہی رہتا تھا یہ کچھ کھاتے، کچھ رکھ چھوڑتے مٹھائی کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتے، ان کو پونچھ پانچھ صاف کر جمع کرتے جاتے، انہی کاغذوں پر خط لکھتے، مضمون لکھتے، غزلیں لکھتے - غرض جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا بس انہیں کاغذوں پر ہوتا - خدا معلوم ایسے چھوٹے چھوٹے کاغذ پر یہ لکھتے کیونکر تھے —

مولوی صاحب دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے، ہاں ڈرتے تھے تو مولوی عبدالحق صاحب سے - میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ان کی رائے معلوم کروں - مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹال گئے - تھوڑے دن اور جیتے تو پوچھ ہی لیتا - دوسروں کے متعلق مجھے ان کی رائے معلوم ہے - اگر انہی کے الفاظ میں لکھوں تو ابھی فوجداری ہو جائے —

مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع کرنے کا خاص ملکہ تھا - ایسے ایسے لفظ دماغ سے اتارتے کہ باید و شاید - جہاں ثبوت طلب کیا اور انھوں نے شعر پڑھا - پڑھا اور کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا - اب خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ خود ان کا شعر ہوتا تھا یا واقعی اُس شاعر کا - بھلا ایک ایک لفظ کے لئے کون دیوان ڈھونڈتا بیٹھے اگر کوئی تلاش بھی کرتا اور وہ شعر دیوان میں نہ ملتا تو یہ کہدینا کیا مشکل تھا کہ یہ غیر مطبوعہ کلام ہے - انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے - مگر انگریزی اصطلاحات پر

پورے حاوی تھے ۔ یہی نہیں بلکہ یہاں تک جانتے تھے کہ اس لفظ کےکیا ٹکڑے ھیں ' ان ٹکڑوں کی اصل کیا ھے ' اور اس اصل کے کیا معنی ھیں ' اس بلا کا حافظہ لے کر آے تھے کہ ایک دفعہ کوئی لفظ سنا اور یاد ھو گیا ۔ الفاظ کے ساتھہ انھوں نے اس پر بھی بہت غور کیا تھا کہ انگریزی میں اصطلاحات بنانے میں کن اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ھے ' انھیں اصولوں کو وہ اردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں کام میں لاتے اور ھمیشہ کامیاب ھوتے ۔ میری کیا اس‌وقت سب کی‌یہی راے ھے کہ اصطلاحات بنانے کے کام میں مولوی وحیدالدین 'سلیم' اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ۔ اور اب ان کے بعد ان کا بدل ملنا دشوار تو کیا ناممکن ھے ۔ عربی اور فارسی میں اچھی دسترس تھی مگر وہ اردو کے اٹھے بٹھے تھے' اور اردو ان کے لئے ۔ خوب سمجھتے تھے اور خوب سمجھاتے تھے زبان کے جو نکات وہ اپنے شاگردوں کو بتا گئے ھیں ' اسی کا نتیجہ ھے کہ کالج کے لونڈے وہ مضمون لکھہ جاتے ھیں' جو بڑے بڑے اھل قلم کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتے مولوی صاحب کیا مرے ' زبان اردو کا ایک ستون گر گیا ۔ اور ایسا ستون گرا کہ اس جیسا ملنا تو دیجا' اس حصے میں اڑواڑ بھی لگانی مشکل ھے ۔ ان کی جگہ بھرنے کے لئے دوسرے پروفیسر کی تلاش ھو رھی ھے' مگر عثمانیہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد لکھہ رکھیں کہ چاھے اس سرے سے اس سرے تک ھندوستان چھان مارو' مولوی وحیدالدین "سلیم" جیسا پروفیسر ملنا تو بڑی بات ھے ان کا پاسنگ بھی مل‌جاے تو غنیمت اور بہت غنیمت سمجھو —

نستعلیق ٹائپ

از

(جناب مرزا رفیق بیگ صاحب)

علم کی منجملہ اور اقسام کے دو قسمیں ایجابی اور معیاری بھی ہیں - اول‌الذکر کے ذریعے ہم اشیا، واقعات اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی حالت و کیفیت موجودہ سے باقاعدہ طور پر واقف ہوتے ہیں - اور ثانی‌الذکر کے توسط سے ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کوئی شے یا واقعہ کس حالت اور صورت میں اصلی معنوں میں شے اور واقعے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے - گویا ایجابی علم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز "کیا ہے" اور معیاری علم یہ بتاتا ہے کہ اس چیز کو "کیا ہونا چاہئیے" - مثلاً ایک ڈاکٹر ایک مریض کا علاج کر رہا ہے، وہ پہلے تشخیص مرض کرتا ہے - یعنی یہ معلوم کرتا ہے کہ مریض کی صحت میں کیا خرابی ہے یا بہ الفاظ دیگر اس کی موجودہ حالت "کیا ہے" - تشخیص مرض یا مریض کی موجودہ حالت معلوم کرنے کے بعد وہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ کونسی صورت حال ہے، جس کے پیدا ہوجانے کی بنا پر مریض کی صحت کو اصلی معنی میں صحت کہا جاسکتا ہے - گویا اس طرح وہ ازالۂ مرض کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ مریض اچھا ہوجائے - اگر تشخیص غلط ہوئی ہے تو کوئی علاج خواہ وہ اکسیر سے ہی کیوں نہ کیا جائے، بالکل کارگر نہیں ہوتا - علاج کی بہ نسبت تشخیص زیادہ ضروری ہے - اس لئے

معیاری علم کے مقابلے میں ایجابی علم کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے - جب تک ہم کو کسی چیز کے متعلق پورے طور سے یہ واقفیت نہ ہو جائے اور یہ نہ معلوم ہولے کہ " وہ کیا ہے " ہم ہرگز یہ کہنے کے قابل نہیں ہوں گے کہ " اس کو کیا ہونا چاہئیے " - ہماری پستی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے (اور اس میں ہمارے اکثر لیڈر اور قومی اخبارات بھی مبتلا ہیں) کہ مشاہدہ اور مطالعہ اور اصل مرض کی پوری تشخیص کی کوشش کئے بغیر اصلاح کی طرف قدم بڑھاتے ہیں - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑے اصلاحی اور تعمیری منصوبے نا کام رہ جاتے ہیں - جس قدر بھی رزو لیوشن وغیرہ منظور ہوتے ہیں ' وہ چونکہ زیادہ تر اسی طریقے پر ہوتے ہیں ' اس لئے بہت کم زیر عمل رہتے ہیں —

اعتراض یا تنقید کرنا بہت اچھا کام ہے بشرطیکہ نیک نیتی سے ہو اور معترض یا ناقد کو اس امر کے متعلق جس پر وہ اعتراض کرتا ہے پوری واقفیت ہو - محض شہرت حاصل کرنے کے لئے یا بد نیتی سے اعتراض کرنا نہایت قبیح فعل ہے اور اس کا نتیجہ آخر میں ہمیشہ ندامت ہوتا ہے - اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ اعتراض کرنے والا پہلے خود اپنی اصلاح کرے - یعنی اس کی نیت نیک ہو ' جس چیز پر اعتراض کرتا ہے اس سے پوری واقفیت رکھتا ہو ' اعتراض سے اس کا مقصد کسی کو ضرر پہنچانا نہیں بلکہ فائدہ پہنچانا مقصود ہو - اس کے بعد اگر تنقید یا اعتراض کیا جائے تو وہ حقیقی معنوں میں تنقید ہوگی ' ورنہ اہل نظر کی نگاہ میں بے وقعت خیال کی جائے گی —

نستعلیق ٹائپ کا مسئلہ کچھ ایسا آسان مسئلہ نہیں ہے کہ بغیر سوچے سمجھے محض جذبات سے متأثر ہوکر اس پر قلم اٹھایا جائے - جو چیز جس قدر اہم اور دشوار ہوتی ہے ' اتنی ہی اہمیت اور دشواری اس کے متعلق قطعی رائے قائم کرنے میں بھی پیش آتی ہے - اب تک مقامی اخبارات میں نستعلیق ٹائپ کے متعلق مخالف اور موافق مضامین مسلسل شائع ہوچکے ہیں - میں ان تمام مضامین

کو ٹھنڈے دل سے پڑھتا رہا ہوں - اور اس امر کا متلاشی رہا ہوں کہ ان مضامین میں کوئی ایسی مفید بات میرے ہاتھ لگے جو کام میں میری ممد و معاون ہو - مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اگر ایک طرف محض بدگمانی سے کام لیا گیا ہے تو دوسری طرف انتہائی خوش اعتقادی کا اظہار ہوا ہے - ایک طرف بے صبری کا جلوہ نظر آ رہا ہے تو دوسری طرف جلد بازی اپنے کرشمے دکھا رہی ہے - یہ صورت حال تخلیقی کام کی حد تک جس قدر نقصان رساں ہے اس کا اعادہ تحصیل حاصل ہے - کیونکہ اس میں علاوہ بے حد صبر کے بہت کچھ قربانیاں بھی کرنی پڑتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ میں نستعلیق ٹائپ کے متعلق اپنی معلومات اور اس حیثیت سے کہ میں ایک حد تک اس میں کافی طور پر مہارت رکھتا ہوں اپنے خیالات کا اظہار کروں - تاکہ مخالف اور موافق حضرات اس کے متعلق پورے طور پر واقف ہو جانے کے بعد اپنے اپنے قیمتی خیالات کا اظہار فرمائیں اور اس طرح ممکن ہے کہ کوئی کام کی بات میرے ہاتھ لگ جائے - میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ میں جو کچھ لکھنے والا ہوں اس کی حیثیت "حکم قطعی" کی ہوگی" بلکہ میں خود اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری واقفیت اس میں اتنی بھی نہیں ہے جتنی سمندر میں سے ایک قطرہ - مگر چونکہ ہر فرد قوم کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی واقفیت سے حتی المقدور قوم و ملک کی خدمت کرے ' اس لئے میں بھی کوشش کرتا ہوں کہ ہر معاملے کو آسانی کے ساتھ سلجھا دیا جائے اور کوئی پیچیدگی باقی نہ رہے —

اصل مضمون کی طرف رجوع کرنے سے پہلے میں یہ امر بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد اس مضمون سے یہ نہیں ہے کہ میں خدا نخواستہ کسی کی ذات پر حملہ کروں یا یہ بتاؤں کہ کس ٹائپ میں کیا کیا محاسن ہیں ' بلکہ میں مختصراً یہ بتاؤں گا کہ اب تک جو ٹائپ بنے ہیں ان میں بڑے بڑے کیا نقائص ہیں اور یہ کہ انہی نقائص کے مد نظر میں اپنے

ٹائپ کی خامیوں کو رفع کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، اور یہی حالات دوسروں کے لئے بھی رہبری کا کام دے سکتی ہیں۔ میں فی الحال یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ ان کوششوں کے اختتام پر میرے یا کسی اور ٹائپ کی کیا صورت ہو جائے گی --

ہماری خطاطی اور اُس کی اہمیت

قبل اس کے کہ میں ٹائپ کے متعلق کچھ عرض کروں۔ یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں خطاطی کو تمام دنیا سے زیادہ کیوں ترقی ہوئی۔ آخر دنیا میں اور قومیں بھی تھیں اور ہیں۔ مگر کسی قوم میں مسلمانوں سے بہتر اور زیادہ دلکش خطاطی آپ کو نہیں ملیگی۔ کیا کبھی آپ نے اس پر غور کیا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ —

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اور ایک عرصے بعد تک عرب میں صرف خط کوفی کا رواج تھا۔ اس کے آس پاس کے ملکوں میں اُس وقت تک ترمیم شدہ خط تصویر، خط میخ وغیرہ وغیرہ رائج تھے۔ یہ پتہ لگانا کہ خط کوفی کی ابتدا کب اور کس طرح ہوئی، بہت دشوار ہے۔ اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس کا مأخذ ایک بڑی حد تک سریانی خط ہے۔ نقطے پہلے اس کے حروف میں نہیں تھے یہ بعد میں شامل کئے گئے ہیں۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اس میں ترمیمیں ہو کر خوبصورتی پیدا ہوتی رہی۔ ان ترمیموں کی وجہ سے خوبصورتی میں تو اضافہ ہوتا گیا مگر آسانی پیدا ہونے کی بجائے مشکلات حائل ہو گئیں، یہاں تک کہ خط کوفی جو پہلے کسی قدر آسان تھا، ترمیمات کے بعد عوام کے واسطے نہ رہا، بلکہ اُس کو خاص خاص ہی لوگ پڑھ سکتے تھے۔ یہ صورت حال بنی عباس کی خلافت تک باقی رہی۔ سلاطین عباسیہ کو علم سے جس قدر ذوق اور شوق تھا، اُس کا اندازہ تاریخ کے صفحات سے اچھی طرح ہوسکتا ہے۔ توسیع علم نے خط کوفی کی خرابیوں کو

لوگوں پر ظاہر کیا - اور ضرورت ہوئی کہ اس میں کچھ اصلاح کی جائے - اُس وقت کے مسلمان اس قدر قدامت پسند نہ تھے کہ وہ اس خط کی دقتوں کو محسوس کرنے کے بعد بھی قدیم طرز تحریر کو نہ چھوڑتے - انھوں نے ضرورت دیکھی' لہٰذا اس کو فوراً ترک کردیا اور خط نسخ ایجاد ہوا - ایک عرصے تک یہ دونوں ساتھ ساتھ رائج رہے - مگر ساتویں صدی ہجری کے شروع تک خط کوفی محض نمائشی خط رہ گیا اور اس کی جگہ نسخ عام طور پر رائج ہوگیا - گو اور مختلف قسم کے خط بعد میں ایجاد ہوتے رہے' مثلاً ثلث' شفیعہ' ریحان' طغرا' غبار وغیرہ وغیرہ' مگر چونکہ ان سب خطوں میں اس وقت تک خط نسخ ہی زیادہ آسانی سے پڑھا جانے والا خط تھا اس لئے عام رواج اسی کا رہا اور ہر شخص آسانی کے خیال سے اُسی کو پسند کرتا تھا - یہاں تک کہ ایران میں بھی خط نسخ ہی رائج تھا ' حالانکہ وہاں کی زبان عربی نہ تھی —

میں یہاں ''آسان'' اور ''عام پسند'' کو ذرا وضاحت سے بیان کردینا چاہتا ہوں تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ خط کوفی کے مقابلے میں خط نسخ کیوں آسان اور کیوں عام پسند ہوا - آسانی اور عام پسندی کا تعلق محض انسان کی ''آسائش پسندی'' اور ''سہولت اجرائے کار'' سے ہے - جب تمدن اور علم ترقی کرجاتا ہے تو اس وقت لازماً جلد بازی بھی آجاتی ہے - انسان ہمیشہ سہولت اور آسانی کی طرف دوڑتا ہے - آپ خط کوفی کی ایک عبارت کو سامنے رکھئے اور اسی عبارت کو نسخ میں لکھواکر دونوں کو پڑھئے - دیکھئے کہ آپ کس کو جلد پڑھ لیتے ہیں' یقیناً آپ خط نسخ زیادہ آسانی سے اور جلدی پڑھ لیں گے - اس کی تمام تر وجہ یہی نہیں ہے کہ آپ ہمیشہ سے نسخ پڑھتے آئے ہیں - اور خط کوفی سے مانوس نہیں ہیں' بلکہ در اصل اس کا تعلق آنکھ اور دماغ سے ہے - یعنی آپ خود محسوس کریں گے کہ جس قدر جلد آپ کی نگاہ نسخ کے ہر ہر جوڑ پر سے گزرتی جاتی ہے اسی قدر جلد آپ کا دماغ اس کو اپنے میں جذب کرلیتا ہے - یا یہ کہئے کہ آپ اسے سمجھ جاتے ہیں' حتیٰ کہ

آپ اس عبارت کو پڑھ لیتے ھیں' برخلاف اس کے خط کوفی کے توڑ جوڑ میں نگاہ کو ضرورت سے زیادہ چکر لگانا پڑتا ھے یا بالفاظ دیگر آپ کی نگاہ کو بہ نسبت نسخ کے جوڑوں کے خط کوفی کے جوڑوں کو دیکھنے کے لئے زیادہ سفر کرنا پڑتا ھے۔ اور اسی قدر دیر سے آپ کا دماغ بھی اس کو قبول کرتا ھے' اسی لئے آپ اس کو ذرا تکلف سے پڑھتے ھیں اور دیر میں سمجھتے ھیں۔ اسی کو نگاہ اور دماغ پر بار پڑنا کہتے ھیں۔ جب لکھنے پڑھنے والے زیادہ ھوے تو اتنی ھی زیادہ نوشت و خواند ھر وقت کی ضروریات میں داخل ھوئی۔ اور اب خط کوفی کا دیر میں پڑھا جانا لوگوں کے لئے تکلیف دہ ھونے لگا۔ آخر خط نسخ کے موجدوں نے اسی چیز کو محسوس کرکے خط کوفی میں سے یہ چیزیں نکال دیں اور اس ترمیم شدہ خط کا نام خط نسخ رکھا گیا —

یہی اصول آپ کو انگریزی زبان میں بھی نظر آئے گا۔ قدیم انگریزی کے حروف دیکھئے اور آج کل کے دیکھئے۔ مثال کے طور پر آپ اخبار ٹائمز آف انڈیا ملاحظہ فرماسکتے ھیں' اخبار کے سرنامے پر جو اس کا نام بڑے بڑے حروف میں پہلے ھی صفحے پرھوتا ھے اس کو ذرا غور سے دیکھئے کہ اس میں سے کتنے حروف آپ پڑھ سکتے ھیں؟ قدیم انگریزی خط میں بھی یہی خرابیاں تھیں اور اسی لئے اس کو مجبوراً آسانی کی خاطر تبدیل کردینا پڑا۔ اگر یورپ کی موجودہ زبانوں کے چھپنے والے حرفوں کو آپ ملاحظہ کریں گے تو خفیف خفیف فرق کے ساتھ ھزاروں شکلیں نظر آئیں گی' جن کو Faces کہا جاتا ھے' ان کا فرق عام طور پر اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک خاص طور پر اس کا علم حاصل نہ کیا جاے۔ اگر زمانے نے فرصت دی تو میں اس کے متعلق آئندہ کسی مضمون میں بحث کروں گا۔ بھر حال مقصد اس وجہ سے کہ نگاہ اور دماغ پر بار نہ پڑے حرفوں کی کوئی لکیر موٹی کردی جاتی ھے اور کوئی باریک' تاکہ نگاہ اس جگہ آکر رک نہ جاے بلکہ ایک طرح سے پھسل جاے۔ لیکن یہ چیزیں اس وقت ظہور پذیر ھوتی ھیں جب کوئی قوم اور ملک اتنی ھی

ترقی کرلیتا ہے جتنی یورپ نے اس خصوص میں کی ہے - ہم ان چیزوں سے ابھی بہت دور ہیں - ہمارے ہاں اب تک ٹائپ ہی نہیں بنا ہے تو بھلا یہ چیزیں تو اس کے بھی بہت بعد کی ہیں —

غرض آسانی ہی ایک ایسی چیز تھی جس کی وجہ سے لوگوں نے اپنے ایک قدیم ترین خط کو بہت جلد ترک کردیا اور نسخ کو بخوشی قبول کرلیا - ورنہ یہ یاد رکھئے کہ کوئی قوم اپنی قدیم روایات اور رسوم کو ہرگز اس وقت تک چھوڑنا پسند نہیں کرتی جب تک اس میں ان کو صریح نقصان نظر نہ آئے - دوسرے ضروریات زندگی روز بروز بدل رہی ہیں' قوم وہی زندہ کہے جانے کی مستحق ہوسکتی ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ چلتی رہے - موجودہ زمانے میں برہنہ رہنے والی قوموں کو آپ صرف اس واسطے غیر متمدن کہتے ہیں کہ وہ آپ کے برابر برابر نہیں چل رہی ہیں- لیکن کیا وہ اپنے قدیم رسم و رواج کو آج تک لئے نہیں بیٹھی ہیں؟ کیا آپ سے زیادہ انھوں نے اپنے آبا و اجداد کی میراث کی حفاظت نہیں کی ہے ؟ مگر نہیں ' خدا نے انسان کو عقل دی ہے تا کہ اس کے ذریعے سے اپنی ترقی میں سر گرم رہے - خدا کی خدائی کو آنکھیں کھول کر دیکھئے کہ اس میں کیا ہو رہا ہے - مسلمانوں نے بھی تقریباً ہزار سال تک برابر ترقی کی ' مگر جب سے " پدرم سلطان بود " پر عمل کرنا شروع کیا اس وقت سے آج تک کے نتائج ہمارے سامنے ہیں - اب زمانہ ہم کو اچھی طرح پیس رہا ہے اور ہم مجبور ہو کر اب وہی چیزیں قبول کر تے جار ہے ہیں جن کو بوجہ قدامت پسندی ہم نفرت سے دیکھتے تھے - مگر اللہ اکبر ' با وجود پے درپے ذلتوں کے اب تک بھی ہم خوشی سے ایسی چیزیں قبول نہیں کر تے ہیں جو ہماری فلاح و بہبود کا باعث ہوں - اگر مجبوری ہو تی ہے تو خیر طوعاً و کرہاً سب ہی کچھ کرنا پڑتا ہے —

یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ خطاطی کیا چیز ہے ' اس میں کیوں تبدیلیاں ہو تی رہتی ہیں اور خط نسخ کی کیوں ضرورت ہوئی - اب یہ بھی سن لیجئے

که مسلمانوں میں فن خطاطی کو اس قدر کیوں ترقی ہوئی —

مذہب اور جذبات فطرت کے تصویر کشی اور نقاشی بھی انسان کا ایک فطری جذبہ ہے اور یہی حالت موسیقی کی ہے۔ مگر چونکہ مسلمانوں میں موسیقی اور تصویر کشی جائز نہیں ہے' اس لئے ان لوگوں نے جن میں یہ جذبہ موجود تھا پہلے تو انتہائی جرأت سے اس کے دبانے کی کوشش کی' مگر قدرتی اور فطری چیزوں کا دبانا کوئی آسان کام نہیں ہے' انسان پھر انسان ہے اور قدرت کا مقابلہ اس کے امکان سے باہر ہے' آخر یہ جذبات ابھر ہی آئے۔ موسیقی کا بدل انہوں نے یہ نکالا کہ کلام مجید کو طرح طرح کے لہجوں اور قرأت سے پڑھنے لگے اور تجوید کا ایک مستقل فن ایجاد ہو گیا —

اب رہی تصویر کشی اور نقاشی یا پینٹنگ' تو اس جذبے کو انہوں نے اول اول پھل' پھول' درخت اور مختلف قسم کے بیل بوٹوں کی صورت میں ظاہر کیا' مگر جب اس طرح بھی ان کی پیاس نہ بجھی تو سب سے زیادہ زور انہوں نے خوش نویسی میں دکھایا۔ آج جو آپ بہترین خوش نویسی کے نمونے دیکھتے ہیں' یہ وہی قوت اور جذبہ ہے۔ ادھر فطرت کا تقاضا تھا کہ وہ تصویر کشی پر آمادہ کرے' اُدھر شرع کی ممانعت تھی کہ وہ اس سے پرہیز کریں۔ اس کشمکش کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ جذبۂ نقاشی کو حروف کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ خوش نویسی ایک قسم کی پینٹنگ یا تصویر کشی ہے جس میں مسلمانوں نے اپنا کمال دکھایا ہے اور اسی وجہ سے آج ان کی خطاطی کے قطعات وغیرہ اُسی طرح اپنی قدر و قیمت رکھتے ہیں' جس طرح اور قوموں کی تصاویر وغیرہ۔ اگر دنیا میں کسی مصور کی تصویر کو نقل کوئی دوسرا مصور کر سکتا ہے تو خوش نویسی کے بہترین نمونوں کو بھی نقل اُتاری جاسکتی ہے' ورنہ جس طرح ان کی نقل نہیں ہوسکتی ہے اسی طرح

اب دنیا میں میر عماد اور عبدالرشید کے خط کی بھی نقل نہیں ہوسکتی - اور جس طرح ہر ایک اپنا اپنا جدا جدا رنگ رکھتا ہے، اسی طرح اس میں بھی سب کے رنگ بالکل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں اور الگ الگ رہینگے - اب سوال یہ ہوتا ہے کہ جس طرح نقاشی میں روزانہ حسب ضرورت رد و بدل ہوتا رہتا ہے، کیا وجہ ہے کہ اسی طرح خطاطی میں بھی ضرورت کے لحاظ سے رد و بدل نہ ہو ؟ اور کیوں اُس میں بصورت مجبوری تھوڑی بہت ترمیم نہ کریں ؟ اور کیوں ان مشکلات کو جو ہماری ترقی میں حائل ہوتی ہیں، نہایت دلیری کے ساتھ راستے میں سے نکال کر نہ پھینک دیا جائے - میرامطلب اس سے خدا نخواستہ یہ نہیں ہے کہ آپ کسی بہترین چیز کو اپنے ہاں باقی ہی نہ رکھیں نہیں، بلکہ اُس کو اُسی طرح رکھئیے اور اگر ہوسکے تو اس سے بھی بہتر صورت میں رکھئیے - مگر جو چیزیں آپ کو کسی خاص کام میں آگے بڑھنے سے روک رہی ہیں، اُن کے لئے ضرورت ہے کہ تھوڑے سے ایثار سے بھی کام لیا جائے —

خط نستعلیق کی مختصر تاریخ

خط نستعلیق کی ایجاد کا سہرا ایران کے سر ہے - علامہ ابوالفضل کے قول کے مطابق اس کے موجد خواجہ میر علی تبریزی ہیں، جن کا زمانہ امیر تیمور کا زمانہ ہے (سنہ ۱۳۶۹ ع سے سنہ ۱۴۰۴ ع تک) مگر یہ غلط معلوم ہوتا ہے، اس واسطے کہ امیر تیمور سے پہلے کی نستعلیق میں لکھی ہوئی کتابیں مل چکی ہیں (ملاحظہ ہو موئرز آت آرکے لوجی کل سروے آت انڈیا نمبر ۲۹) اس لئے غالباً ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں ہی یہ خط ایجاد ہو چکا تھا - میر علی تبریزی کا زمانہ اس کے بہت بعد کا ہے - اس کا ثبوت

مولاناغلام محمد هفت قلم دهلوی کی کتاب " تذکرهٔ خوشنویساں" سے بھی ملتا هے -
خواجه میر علی کے بیان میں انہوں نے لکھا هے " پیشتر هم خط نستعلیق می نوشتند
لیکن ایں مرد بزرگوار قواعد درخط نستعلیق مقرر نموده و نزاکتے بهم رسانیده " -
مزید ثبوت خود اس واقعے سے بھی اچھی طرح مل سکتا هے که خواجه میر علی کا خط
انتہائی خوبیوں کے ساتھ مکمل اور عروجی شان لئے هوے هے - اور ایسا آج تک
نہیں هوا که جو چیز آج هی ایجاد هوئی هو وه فوراً هی تمام تدریجی منزلیں
طے کر کے ایک مکمل شکل پیدا کر لے - خط کوفی ' خط نسخ وغیره سب نے اسی
طرح بتدریج کئی کئی صدیوں میں جاکر موجوده صورتیں اختیار کی هیں - اس لئے
یه هرگز یقین نہیں کیا جاسکتا که میر علی تبریزی اس کے موجد هوں - البته یه
ضرورهے ده انهوں نے اس کی ترقی میں چار چاند لگا دیے - مگر موجد کون هے اس کا پته
شاید کبھی نه لگ سکے —

یه خط جیسا که اس کے نام سے ظاهر هے ' نسخ اور تعلیق سے ملکر بنا هے - سلطان
علی مشهدی جو علاوه ایک اچھے شاعر هونے کے فن خطاطی میں استاد کامل کا درجه
رکھتے تھے ' ایک جگه خواجه میرعلی کو هی موجد مانتے هوے فرماتے هیں :—

نسخ و تعلیق گر خفی و جلی است
واضع الاصل خواجه میر علی است

تاکه بود است عالم و آدم
هرگز ایں خط نبود در عالم

وضع فرمود او ز ذهن دقیق
از خط نسخ و از خط تعلیق

ذیل میں میں ایک ایک لفظ بطور نمونه نسخ'تعلیق اور نستعلیق میں لکھکر
فرق بتاتا هوں - جس کے دیکھنے کے بعد غالباً ناظرین بخوبی اندازه کرسکیں گے

که ان دونوں کو کس طرح ملایا گیا هے —

نستعلیق　　　تعلیق　　　نسخ

ازجهان ـ ازجهان ـ ازجهان

اس کے علاوہ ابتدا میں جس قطعے * کی تصویر دی گئی هے اُس سے ظاهر هوگا که اب سے کئی صدی پہلے کتنے مختلف قسم کے خط رائج تھے اور یه که اگر ان مختلف خطوط کو ایک دوسرے سے ملایا جاے ' جس طرح که نسخ اور تعلیق کو ملا کر نستعلیق بنایا گیا هے ' تو اب کتنے مختلف قسموں کے خطوں کی ایجاد هونے کا امکان باقی هے ' اور نستعلیق ٹائپ بنانے میں (بشرطیکه لوگ منظور کریں) اس صورت حال سے کتنی آسانیاں پیدا هوسکتی هیں —

هر زبان کی تحریر یا حروف جو لکھے جاتے هیں ' کسی نه کسی اصول کے تحت هوتے هیں ۔ ثلث اور نسخ میں ۱/۳ گولائی اور ۲/۳ سیدھی لکیریں هیں اور نستعلیق میں هر چیز گول هوتی هے ۔ زمانۂ موجودہ کے انگریزی ٹائپ کے حروف بھی اسی اصول پر مبنی هیں ۔ یه طریقه انگریزی میں مجبوراً اختیار کرنا پڑا هے ۔ ورنه جیسا که میں پہلے کہه آیا هوں حقیقت میں ایسا نه تھا ' بلکه حروف عجیب عجیب طرح سے لکھے جاتے تھے ۔ اب انھوں نے اپنے هاں تین چیزیں لے لی هیں ۔ ایک خط مستقیم " —— | " وہ چاهے عمودی هو یا افقی ۔ دوسرا خط منحنی ")("

---

* میں عالی جناب نواب سالار جنگ بہادر کا بے حد ممنون هوں ' که جنھوں نے از راہ علم پروری اس قطعے کی تصویر عنایت فرمائی اور ساتھه هی حامد علی صاحب اور مولوی مرزا فرحت الله بیگ صاحب بی اے ۔ کا بھی شکر گذار هوں ۔ جنھوں نے اس کے حاصل کرنے میں مدد فرمائی —

تیسرے دائرہ " ○ " - اب آپ انگریزی کے تمام حروف کو انہی چیزوں سے بنائیے اور دیکھئے کہ ہر ایک انہی اصول کے تحت آتا ہے یا نہیں - یہی صورت ہمارے ہاں بھی اختیار کی گئی ہے - فرق صرف یہ ہے کہ انہوں نے اس طریقے سے اپنے ہاں آسانی پیدا کرلی ہے اور آپ اپنی ضروریات کو قدامت پسندی پر قربان کر رہے ہیں - اگر آپ آسانی کے لحاظ سے کچھ ترمیم کرسکتے ہیں تو بسم اللہ —

بہرحال نستعلیق کی یہ ایجاد ایران میں بہت مقبول ہوئی - دن بدن اس کا رواج بلحاظ سہولت بڑھتا گیا - اس فن لطیف کے بڑے بڑے استاد پیدا ہوئے اور انہوں نے خطاطی کے میدان میں خوب خوب زور قلم دکھایا یہاں تک کہ دسویں صدی ہجری میں میر عمادالحسینی ● اور عبدالرشید دیلمی نے اسے کمال پر پہنچا دیا —

● میر عمادالحسنی قزوینی ایران میں ہوئے ہیں - جن کی بابت یہ مشہور ہے کہ آپ کا ایک لفظ ان کی زندگی میں ہی ایک تومان کو فروخت ہوا کرتا تھا - غالباً ایک خوش نویس عمادالحسنی ہندوستان میں بھی ہوئے ہیں - یہ حسنی ہیں اور وہ حسینی ہیں - مگر عماد حسنی کا تذکرہ نہ تو علامہ ابوالفضل نے اپنے ہاں کیا ہے اور نہ " تذکرۂ خوشنویساں " میں ہے - مگر میں اپنے اور چند اہل ذوق کے یقین اور اعتماد پر کہہ سکتا ہوں کہ عمادالحسنی کوئی اور ہی صاحب تھے - اس واسطے کہ اگر ان دونوں کے خط کا مقابلہ کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے - عمادالحسنی کے قطعات ہندوستان میں بکثرت ملتے ہیں اور عمادالحسینی کے قطعات میں نے باوجود تلاش کے اب تک کم ہی دیکھے ہیں - البتہ یہ سنا ہے کہ عالی جناب نواب سالار جنگ بہادر کے ہاں قطعات کے علاوہ کتابیں بھی ان کے ہاتھ کی موجود ہیں - مگر اب تک میری نظر سے ان کی لکھی ہوئی کوئی کتاب نہیں گذری - لوگ عمادالحسنی کو بھی عمادالحسینی خیال کرلیتے ہیں، حالانکہ ان کے خطوں میں بہت بڑا فرق ہے —

غالباً شاہنشاہ اکبر کے زمانے میں یہ خط شمالی ہندوستان میں آیا - یہاں بھی یہ بے انتہا مقبول ہوا اور رفتہ رفتہ اس کا رواج عام ہو گیا - مگر استادوں میں جو سب سے پہلے اُستاد کامل اس خط کے ہندوستان میں آئے وہ عبدالرشید دیلمی تھے - یہ زمانہ شاہ جہاں بادشاہ کا تھا (سنہ ۱۶۲۸ ع سے سنہ ۱۶۵۸ ع تک) بادشاہ نے ان کی بہت قدر کی اور شہزادہ دارا شکوہ کی اُستادی پر مقرر کردیا - ان کے بعد ہر بادشاہ کے دربار میں بڑے بڑے خوش نویس گذرے ہیں - اس زمانے میں خوش نویسی ایک اعلیٰ اور شریف ترین فن سمجھا جاتا تھا - بادشاہ سے لے کر ہر ادنیٰ صاحب ذوق تک اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا - بادشاہوں میں داراشکوہ اورنگ زیب ' شاہ شجاع اور بہادر شاہ قابل ذکر ہیں - اس فن کے آخری مشہور اُستاد سید محمد امیر رضوی دہلوی ہوے ہیں - یہ " میر پنجہ کش " کے نام سے زیادہ مشہور ہیں - کہا جاتا ہے کہ (۹۱) سال کی عمر میں سنہ ۱۸۵۷ ع کے غدر میں اپنے مکان کی حفاظت کرتے ہوے شہید ہوے —

یہاں تک تو شمالی ہندوستان کا ذکر تھا ؛ مگر دکن میں اس سے بھی پہلے سے خط نستعلیق کا وجود ملتا ہے اور ' بیدر ' کے اکثر کتبات اس کا ثبوت دیتے ہیں - مثلاً علی بریدبادشاہ ' بیدر ' نے جو ایک شہ نشین قلعے کے اندر بنایا تھا ' اُس پر خط نستعلیق میں یہ شعر اب تک لکھا ہوا ہے :—

شاہ نشین چشم من تکیہ گہ خیال تو جاے دعاست شاہ من بے تومباد جاے تو

اور خود علی برید کے مقبرے کے اندر جس قدر بھی اشعار لکھے ہوے ہیں وہ سب نستعلیق میں ہیں - علی برید کا زمانہ سنہ ۱۵۴۲ ع سے ۱۵۷۹ ع تک ہے - یعنی اکبر بادشاہ کے تخت نشین ہونے کے چند سال کے بعد اس کا انتقال ہوا - اور شہ نشین اُس نے اپنے ابتدائی زمانے میں بنوایا تھا —

دکن میں بھی بڑے بڑے اُستاد گذرے ہیں - مگر افسوس ہے کہ مجھکو کوئی ایسا تذکرہ نہیں ملا جس سے میں کچھ مدد لے سکتا - یہاں اب تک بھی اس کا شوق اُمرا

میں باقی ہے - مثلاً نواب خان‌خاناں بہادر ' نواب لطف الدولہ بہادر اور مہاراجہ یمین‌السلطنت سرکشن پرشاد بہادر اچھے خوشنویس ہیں - مہاراجہ بہادر کے ۲۵ - ۳۰ سال پہلے کے لکھے ہوے قطعات میں نے بھی دیکھے ہیں —

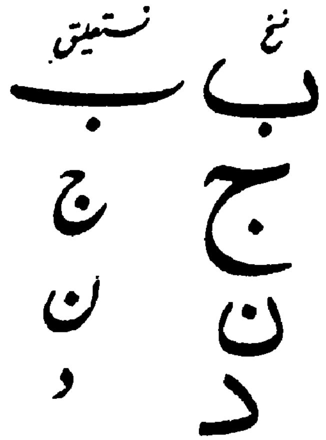
جب اُردو زبان گفتگو سے بڑھ کر تحریر میں آنے لگی تو اس نے بھی فطرتاً وہی خط اختیار کیا ' جو اُس زمانے کا پسندیدہ ترین بلکہ ایک حدتک رائج‌الوقت خط تھا - اور سچ پوچھئے تو اُردو بیچاری نے تو آنکھ کھول کر کوئی دوسرا خط دیکھا ہی نہیں - ابتدا سے جس خط کو دیکھا اسی کو جانا اور اپنے لئے اسی کو پسند کیا —

نسخ اور نستعلیق میں فرق

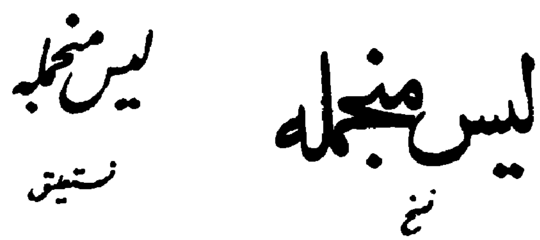
نسخ اور نستعلیق کا وہ فرق جس پر ان کی بنیادیں قائم ہیں ' الفاظ میں بیان کرنا کم از کم میرے لئے بہت مشکل کام ہے - اس لئے میں جو کچھ بھی بیان کرونگا وہ زیادہ تر اسی حد تک ہوگا جس حد تک کہ ٹائپ سے اس کا تعلق ہے - مولانا سلطان علی مشہدی کہتے ہیں کہ نسخ اور تعلیق خفی اور جلی ہیں - اور چونکہ ان دونوں سے نستعلیق بنایا گیا ہے' مطلب یہ ہوا کہ خفی اور جلی دونوں کا اس میں استعمال ہے - یعنی میرے حساب سے نسخ کے لکھنے میں قلم ۱/۷ حصہ ذرا خفی لگتا ہے اور باقی میں پورا قلم ہوتا ہے - تعلیق میں ۱/۴ حصے میں بہت ہی خفی قلم لگایا جاتا ہے اور باقی میں پورا - مگر نستعلیق میں قریب قریب نصف حصے کے میں خفی اور کہیں بہت ہی خفی قلم کا استعمال کیا جاتا ہے - مگر یہ فرق صرف موجدوں کے لئے موزوں ہو سکتا ہے ' ٹائپ بنانے والوں کے نقطۂ نظر سے حسب ذیل تین اہم فرق ہونگے : —

(۱) نستعلیق کے حرفوں کی شکل نسخ کے حرفوں کی شکل سے مختلف ہے اور جیسا کہ علامۂ ابوالفضل نے صراحت کی ہے ' خط نسخ میں لکیریں ۱/۳ گول اور ۲/۳

سیدھی ہوتی ہیں، در آنحا لیکہ نستعلیق میں ہر لکیر اگول ہوتی ہے، حتیٰ کہ الف بھی پورا سیدھا نہیں ہوتا، حالانکہ الف کی مثال تیر سے دی جاتی ہے ۔ مثلاً : —



(۲) چھوٹے سے چھوٹے جوڑوں کا بھی مختلف انچائی پر ملنا نستعلیق کی امتیازی خصوصیت ہے ۔ مثلاً " منجملہ " اور " لیس " کو لیجئے ۔ اس کو ہم نستعلیق اور نسخ دونوں میں لکھتے ہیں —



اس میں آپ دیکھینگے کہ نستعلیق لکھنے میں ایک جوڑ کے بعد دوسرا جوڑ کچھ نہ کچھ نیچے کر کے لگایا جاتا ہے اور ہر حرف جوڑ ملانے کے بعد کچھ نہ کچھ ڈھلتا ہوا لکھا جاتا ہے ۔ اوپر کے نمونے میں نسخ لکھنے میں سوائے بیچ کے جیم کے بقیہ جوڑوں کو اگر ایک ہی خط پر ملایا جائے تو نسخ کی خطاطی میں کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا ۔ لیکن اگر نستعلیق میں کہیں بھی اس چیز کو کم کر دیا جائے تو وہ بہت بدنما ہو جاتا ہے —

(۳) نسخ میں تمام جوڑ قریب قریب ایک ہی موٹائی سے لگائے جاتے ہیں ۔ برخلاف اس کے نستعلیق میں کہیں باریک جوڑ لگایا جاتا ہے اور کہیں موٹا ۔ مثلاً

نسخ نستعلیق

سد سد

سن سن

اس کے علاوہ ہر خوشنویس اپنا اپنا طرز قاعدہ رکھتا ہے - اگر ایک شخص شروع کا میم اور عین پورے قلم سے لکھتا ہے تو دوسرا پون یا نصف قلم سے ہی اُس میں خوبصورتی پیدا کردیتا ہے - بہر حال ہزاروں قدیم اساتذہ کے قطعات وغیرہ دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نستعلیق خط میں باوجود قواعد ہونے کے " ہر کہ آمد عمارت نو ساخت " والا مضمون ہے - دائرہ کوئی بیضوی لکھتا ہے کوئی شمسی' اور کوئی ان دونوں کے بین بین - مطلب اس کا یہ ہوا کہ گو قواعد ہیں' مگر اس پر بہت کم لوگ چلتے ہیں - اور میں تو یہ کہوں گا کہ نستعلیق میں وہی قاعدہ ہے جو آنکھوں کو بھلا معلوم ہو --

ٹائپ کی ضرورت اور لیتھو کے مقابلے میں اُس کی خوبیاں

ٹائپ کی ضرورت کا مسئلہ میرے خیال میں اردو داں ہندی پبلک کے دماغ میں شاید ابھی تیس فی صدی سے زیادہ نہیں ہے ' اُس ضرورت کا احساس کہ ٹائپ کے بغیر ہمارے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہورہی ہے یا نہیں ' سوائے چند فی صدی سوجھ بوجھ دار دماغوں کے اور کسی کو بھی نہیں ہے - میرے خیال میں پچاس فی صدی تو لوگ ایسے ہیں کہ وہ اب تک یہ بھی نہیں جانتے کہ ٹائپ اور لیتھو کی چھپائی میں کیا فرق ہے چہ جائیکہ ان دونوں کے حسن و قبح سے واقفیت ہو - کہا یہ جاتا ہے کہ " اُردو طباعت باوجود اپنی اس شدید آرزو کے کہ نستعلیقی آہنی حروف کے سانچوں میں ڈھل جائے' اپنی خوبصورتی کو کھونے

کے لئے ہرگز راضی نہ ہوگی" - لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ٹائپ کی چھپائی مزیل حسن ہرگز نہیں ہوسکتی - کیونکہ اگر ٹائپ کی ضرورت ہم کو اس پر مجبور کر رہی ہے کہ ہم اپنے خط میں کچھ رد و بدل بھی کرلیں تو اس سے ہمارے نستعلیق کی خوبصورتی زائل نہیں ہوتی - بلکہ اس دلیل کی بنا پر کہ ہر استاد فن اپنی ایک جدید طرز کا موجد ہوا ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ زمانۂ موجودہ میں جس طرح اور تمام چیزوں میں ترمیم و تنسیخ اور اضافے کا عمل جاری ہے' اسی طرح نستعلیق میں بھی بہ لحاظ ضرورت ایک خفیف حد تک تصرف کیا گیا ہے اور یہ تصرف یافتہ صورت بجائے خود نستعلیق کے ایک جدید طرز کا آغاز کرتی ہے - کیونکہ ہر جدید طرز کسی خاص سہولت اور آسانی کے لحاظ سے نکالی گئی ہے اس لئے یہ بات نستعلیق ٹائپ میں بدرجۂ اتم موجود ہوگی - اس کی زندہ مثال انگریزی کا ٹائپ ہے - یہ نہیں کہا جا سکتاکہ انگلستان میں اب ہاتھ سے لکھنا کوئی جانتا ہی نہیں - اسی طرح گو نسخ کا ٹائپ بن گیا ہے اور باوجودیکہ اس میں وہ اصلیت بالکل باقی نہیں ہے' لیکن ایسا نہیں ہے کہ نسخ کا لکھنے والا اب دنیا میں کوئی رہا ہی نہ ہو - ہیں اور بہت کثرت سے ہیں - کیونکہ ٹائپ کے علاوہ بھی تو دنیا میں رات دن بہت سے کام ہوتے رہتے ہیں - خصوصاً اس زمانے میں اشتہاری کام میں جس کی طباعت کا کام دنیا میں سب سے زیادہ ہے' ہاتھ کی لکھائی کی بے حد ضرورت ہوتی ہے - ہر ضرورت کے لئے اس کے مطابق سامان فراہم کئے جاتے ہیں - ہم کو جب طباعت کی ضرورت ہے تو ٹائپ ضروری ہے - اور جب ضرورت ہاتھ کی لکھائی کی ہو تو خطاطی ضروری ہے - بہر حال جس طرح ہر کام اپنی اپنی علحدہ علحدہ نوعیت رکھتا ہے - اسی طرح اس کے لئے سامان بھی فراہم کئے جاتے ہیں - لہذا یہ کہنا کہ اِدھر ٹائپ بنا اور اُدھر خوشنویس اور خوشنویسی دونوں مٹ جائیں گے ایک مہمل سی بات ہے - بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ موجودہ خوشنویسوں کی قدر بڑھ جائے گی —

کہا میں یہ دریافت کرسکتا ہوں کہ آج کل جو عام طور پر (خاص کو چھوڑ دیجئے کہ وہ ہر ایک طباعت کے لئے ہر کس و ناکس کو میسر نہیں آسکتی) لکھائی ہو رہی ہے۔ اس میں کتنے فی صدی لکھنے والے ایسے ہیں جو خوشنویسوں کے زمرے میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ اس موجودہ "خوشنویسی" کا تو استیصال ہی اچھا ہے کہ نہ اس قسم کی لکھائی ہوگی اور نہ ہماری اُردو بدنام ہوگی۔

آپ کو معلوم ہے کہ ٹائپ نہ ہونے سے اردو کو کیا کیا نقصان پہنچ رہا ہے۔ اگر ہمارے ہاں ٹائپ ہوتا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت جس قدر لوگ اردو جانتے ہیں ان سے دس گنا زیادہ جانتے۔ کیونکہ دوسری قوم والے جب آپ کی آج کل کی چھپی ہوئی کتابیں ہاتھ میں لیتے ہیں تو ان کو اس قدر کراہت آتی ہے کہ پڑھنا تو درکنار ورق گردانی بھی پسند نہیں کرتے۔ آپ کے ہاں تصاویر نہیں چھپ سکتی ہیں۔ صحیح نہیں چھپتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی ایسی باتیں (جن کا ذکر آگے آئے گا) مل گئی ہیں کہ جن کو ذراسی بھی انگریزی آتی ہے وہ کبھی اُردو کا اخبار تک بھی نہیں دیکھتے ــ

یہ یاد رکھئے کہ موجودہ ضروریات کے مد نظر آج نہیں تو کل، اور کل نہیں تو پرسوں، حیدرآباد میں ہو یا دنیا کے کسی اور گوشے میں، اگر اردو کو دنیا میں زندہ رہنا ہے تو وہ اپنا ٹائپ بناکر رہے گی (خواہ وہ نستعلیق ہو یا مخالفتوں سے مجبور ہوکر نسخ یا ہندی کیریکٹر اختیار کرلیا جائے۔ اور اگر ٹائپ نہیں بنا یا اختیار نہیں کیا گیا تو وہ زمانہ دور نہیں ہے کہ اردو فنا ہوجائے، کیونکہ تعلیم روزانہ ترقی کر رہی ہے، جب آج تعلیم یافتہ دوسری زبانوں کی بہترین مطبوعات دیکھتے ہیں تو اپنی طباعت پر آنسو بہاتے ہیں، تو کل تو یہ رونا اور بھی زیادہ ہوجائے گا۔ بہر کیف ٹائپ ضرور بن کر رہے گا اور ہمارا آج کل کا یہ قول کہ "ہم کو ایسے ویسے ٹائپ کی ضرورت نہیں ہے" آئندہ آنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہم کو سورہ ملامت بنانے کا ایک اچھا آلہ ہوگا۔

اس واسطے کہ ان کی ضرورتیں ہم سے بدرجہا زیادہ ہوں گی۔ دنیا کے ہر مہذب اور متمدن قوم کی زبان کا ایک ٹائپ موجود ہے، مگر نہیں ہے تو ہماری اُردو کا۔ اس سے غالباً یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ ہم اب تک مہذب قوم کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ اس زمانے کی تعلیمی اور کاروباری زندگی میں طباعت کی جس قدر ضرورتیں بڑھ گئی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں —

آج کل طباعت کے عام طور پر دو طریقے رائج ہیں۔ ایک لیتھو پریس* اور دوسرا ٹائپ پریس۔ ثانی الذکر طریقہ اول الذکر کی نسبت بہت بہتر، آسان، ارزاں اور تیز کام کرنے والا ہے۔ اس واسطے یہی طریقہ سوائے ہندوستان کے جہاں خط نستعلیق کی اب تک پوجا کی جارہی ہے، باقی تمام دنیا میں رائج ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ نستعلیق خط دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت خط ہے، مگر "بہت پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان"—

ٹائپ کے طریقۂ طباعت کو جو ترجیح ہمارے موجودہ لیتھو کے طریقۂ طباعت پر ہے، اسے واضح کرنے کے لئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر ان دونوں طریقوں کا مقابلہ کرکے دکھا دیا جائے تاکہ پبلک کو یہ تو معلوم ہوجائے کہ لیتھو کی چھپائی سے جو نفرت کی جارہی ہے اس کے کیا اسباب ہیں اور ٹائپ پریس میں ایسی کیا خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے اس کا استعمال ناگزیر ہوگیا ہے۔ ان میں سے چند سطور ذیل میں عرض کرتا ہوں :-

---

* یہاں میں یہ بتادینا مناسب سمجھتا ہوں کہ لیتھو کا جو جدید طریقہ آج کل یورپ میں خاص خاص کاموں کے لئے رائج ہے۔ وہ ٹائپ سے بہت خوبصورت اور بہت بہتر ہے۔ مگر اول تو اس پر خاص خاص کام ہی کئے جاتے ہیں، دوسرے وہاں اس طرح سے پتھر نہیں استعمال کئے جاتے، جیسے کہ ہندوستان میں ہوتے ہیں۔ بلکہ وہاں یہی کام المونیم کی پلیٹوں پر کیا جاتا ہے۔ اس کی مشنری بھی خاص ہوتی ہے اور میرے خیال میں ایسی مشین ہندوستان میں کوئی نہیں ہے، مگر یہ خیال رہے کہ وہ اس لیتھو پریس سے ٹائپ کا کام نہیں لے رہے ہیں، بلکہ اس کا استعمال خاص نوعیت رکھتا ہے جن کو ہم ابھی سمجھ بھی نہیں سکتے ہیں —

(۱) اُردو مصنفین کو اگر ذرا بھی اچھی چھپائی کی ضرورت ہوتی ہے تو سب سے پہلے ان کو اچھا کاتب تلاش کرنا پڑتا ہے۔ قسمت سے اگر اچھا مل گیا تو فبہا ورنہ وہی عام بازاری خط اُن کو ملے گا اور مجبوراً اُن کو قبول کرنا پڑے گا۔ برخلاف اس کے ٹائپ کا خط اچھا ہو یا برا یکساں ہوگا اور ہر جگہ آپ کو اور ہر کس و ناکس کو بغیر کسی خاص جستجو یا منت و سماجت کے مل جائے گا —

(۲) قسمت سے یعنی بد قسمتی سے اگر کوئی اچھے کاتب صاحب مل بھی گئے اور آپ نے اپنا کام اُن کو دے بھی دیا تو بس اب آپ پر ایک مصیبت نازل ہوگئی روزانہ صبح و شام اُن کے در دولت کی حاضری آپ کے فرائض میں داخل ہوگئی۔ پھر اُن کی عشوہ طرازیاں، پیشگی مطالبات، غرض ایک عذاب ہے جس سے خدا ہی نجات دے سکتا ہے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ "زر دادن و دردسر خریدن" کی مثل ایسی ہی صورتوں پر صادق آتی ہے اس پر بھی ظالم اکتفا نہیں کرتے۔ زیادتی اجرت کے علاوہ وعدہ خلافی تو اُن کے آگے کوئی چیز ہی نہیں۔ وقت پر کام نہ دینا وہ اپنی شان سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے ٹائپ پریس میں معمولی آٹھ بارہ آنے روز کا مزدور وہی خط کمپوز کرتا ہے جو ایک اعلیٰ خوش نویس نے ایک مرتبہ بنادیا ہے

(۳) لیتھو پریس کی چھپائی ہندوستان میں جیسی کچھ ہو رہی ہے، ظاہر ہے۔ اگر علی الکاتب اور عبدالرشید بھی زندہ ہو کر آجائیں اور کاپیاں لکھنی شروع کردیں تو بھی سنگ سازی اور چھپائی کے مرحلوں کے طے کرنے کے بعد نتیجہ برابر ہی رہیگا۔ اور اُن کی اور موجودہ خوشنویسوں کی کتابت میں سر مو فرق نہ ہوگا۔ کاتب بیچارہ کتنی ہی محنت کیوں نہ کرے، چھپائی سے سب پر پانی پھر جائے گا اور کتاب چھپ کر ایسی شکل سے آپ کے ہاتھ میں آئیگی کہ آپ اپنا سر پیٹ پیٹ لینگے۔ کاپی کا پتھر پر جمانا اور پھر ہر ہر کاغذ کے لئے مختلف ہلکی اور بھاری داب کا دینا بھی ایک مستقل فن ہے۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن پر طباعت کی اچھائی اور برائی کا انحصار ہے۔ لہذا بہترین پریس مین کی آپ کو ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ

" بہترین " ہوتے ہیں اس لئے ان میں بھی بفضلہ تعالیٰ وہ تمام باتیں موجود ہوتی ہیں جو کاتب صاحب میں پائی جاتی ہیں اور یہ دوسرا عذاب ہے - اس کے مقابلے میں ٹائپ پریس میں معمولی کام جاننے والا بھی بخوبی کام چلا سکتا ہے —

(۴) ایتھو کی کاپیوں میں جس رنگ کی روشنائی اور کاغذ استعمال کیا جاتا ہے ان کا دیکھنا اور تصحیح کرنا ایک بڑا مرحلہ ہے - میرے خیال میں ان کی تصحیح سے تصنیف کا کام زیادہ آسان ہے - ان کاپیوں میں الف اور نقطے تو بعض اوقات دکھائی ہی نہیں دیتے - اسی سبب سے باوجود دیدہ ریزی کے غلطیاں رہ جاتی ہیں-

(۵) تصحیح کی مصیبت یہیں ختم نہیں ہوتی ' بلکہ اگر آپ نے پنسل سے تصحیح کر کے کاپی کاتب صاحب کو واپس کردی ہے تو اب وہ جو اس کی درستی کرینگے تو آپ ملاحظہ فرمائینگے کہ انشاءالله جس قدر غلطیاں آپ نے درست کی تھیں اُس سے زیادہ ہی کاپی میں اور موجود ہیں' دو چار مرتبہ کی الٹ پھیر میں سخت محنت اُٹھانے اور آنکھوں کا تیل نکالنے کے بعد جب ان کا پروف مطبع سے آئیگا تو کیا مجال ہے کہ غلطیاں باقی نہیں - اگر ڈرتے ڈرتے کاتب صاحب کی توجہات عالیہ کو اس طرف مبذول کرایا گیا تو جواب ملتا ہے کہ "آپ نے درست ٹھیک طرح سے نہیں کیا ہوگا"

(۶) ان کاپیوں کے ساتھ ایک مصیبت یہ بھی ہے - یعنی اگر آپ کی تصحیح وغیرہ میں کچھ دیر ہوجائے تو پھر پتھر پر کاپی اچھی نہیں اُٹھتی اور تازہ کاپی میں جو بات ہوتی ہے وہ اس میں باقی نہیں رہتی —

(۷) ان تمام مراحل کے بعد سنگ ساز صاحب " نوبت مجنوں برفت و نوبت ماست " کے نعرے لگاتے ہوئے میدان طباعت میں کامزن ہوتے ہیں - آپ اگر پروف میں خدانخواستہ ایک آدھ لفظ بنا دیں تو وہ اس کو یقیناً الٹا لکھینگے جو قطعی خوبصورت نہیں ہوسکتا - اس پر بھی اگر آپ نے " رضینا با لقضینا " کھدیا تو یقین جانئے کہ آس پاس کا ایک دہ ایک حرف یا نقطہ ضرور سنگ ساز صاحب کے بھینٹ چڑھ جائیگا - اور جب کتاب چھپ کر تیار ہو گی تو آپ کو ایک غلط نامہ الگ چھپوا نے

کی ضرورت پڑیگی - اور غلط نامہ بھی اللہ چاہے تو غلطیوں سے مبرا نہ ہوگا - کیا ٹائپ کی چھپی ہوئی کتابوں میں بھی آپ اس قدر غلطیاں دیکھتے ہیں —

(۸) لیتھو کی سیاہی کے پھیلنے کو غلط لگانے یا غلط داب دینے میں کسی جگہ سے نقطے یا صفر کا اُڑ جانا یا بلا ضرورت کسی جگہ ان کا بڑھ جانا تو کوئی بڑی بات ہی نہیں ہے - مثلاً اگر آپ نے کہیں ہندسوں میں (۱۰۰) لکھدیا ہے تو اُس کا (۱۰) رہ جانا یا (۱۰۰۰) ہو جانا نہایت آسان ہے - یہ دوسری بات ہے کہ اس حذف یا ایزاد سے آپ کی ذمہ داری میں کمی یا بیشی ہو جائے - یا اسی طرح بابو کا یا بوا ور یابو کا بابوبو جائے اور آپ حیران ہوں کہ آخر ان دونوں میں سے یہاں کون سے جانور کا ذکر ہے —

(۹) اطف تو اُس وقت آتا ہے جب کہیں سے کاتب صاحب ایک آدھ سطر کھا جاتے ہیں - اس جو اِدھر اُدھر سے چوپل دیکر جگہ نکالی جاتی ہے اور غائب شدہ مضمون بڑھا یا جاتا ہے تو بس پورا کیا ہے - لکھیں موسی پڑھیں خدا —

(۱۰) لیتھو کی چھپائی میں بلاک یا تصاویر کی چھپائی غیر ممکن ہے - اگر دوہری چھپائی کی جائے تو اخراجات نا قابل برداشت ہو جاتے ہیں —

(۱۱) سب سے بڑی خرابی جو لیتھو میں پڑتی ہے وہ مطبوعات پر لاگت کی زیادتی ہے - یہ سچ ہے کہ دو چار سو کی تعداد تک تو لیتھو کا مقابلہ ٹائپ نہیں کرسکتا مگر جہاں دو چار ہزار کی چھپائی ہو وہاں لیتھو کی لاگت ٹائپ سے سہ گنا زیادہ ہو جاتی ہے - مگر چھپائی پر دھیان نہ کر کے لوگ کتابت اور کمپوزنگ کا مقابلہ کرتے ہیں - گو کمپوزنگ میں دونی لاگت آتی ہے مگر چھپائی میں چار چند زیادہ خرچ ہو جاتا ہے - مثال کے طور پر ہم ٹائپ کے پرانے قسم کے دستی پریس سے مقابلہ کرکے بتاتے ہیں کہ لیتھو کے دستی پریس میں ۲۰ × ۳۰ / ۸ کے سائز کے چار صفحوں سے زیادہ نہیں چھپ سکتے - ٹائپ کے عام پرانے قسم کے دستی پریس • میں ایسے چھ صفحے آتے

• اس میں ایسے پریس بھی آتے ہیں جس میں ایسے آٹھ صفحے آسانی سے چھپ سکتے ہیں - مگر چونکہ وہ عام طور پر نہیں ہوں اس لئے ہم ان کو چھوڑ دیتے ہیں - ورنہ اگر اُن سے مقابلہ کیا جائیگا تو اس سے بھی دو گنا فرق آئیگا —

ھیں ، مگر چار صفحے ھی طبع کئے جاتے ھیں ۔ لیتھوکی چھپائی سستی ہے سستی چار روپے ہزار داب مل سکے گی اور ٹائپ پریس میں صرف دو روپے صرف ہونگے، اب حساب لگا لیجئے کہ ہر ہزار پر اتنا فرق پڑتا جاے تو پوری کتاب پر کتنا فرق آجائیگا۔ اِس کے کئی وجوہ ھیں - ایک تو لیتھو کی سیاھی گراں ہے، دوم لیتھو پریس پر تین آدمی کام کرتے ھیں اور اس پر دو - سوم لیتھو میں پریس مین کی خاص ھوشیاری کی اور ٹائپ میں معمولی واقفیت کی ضرورت ھے —

اگر رنگین کام کا مقابلہ کیا جاے تو آٹھ گنا فرق پڑ جاتا ھے ۔ لیتھو کی رنگین سیاھیاں بہت ھی گراں ھوتی ھیں - اسی وجہ سے آپ دیکھتے ھیں کہ ھمارے ھاں رنگین چھپائی بہت کم دکھائی دیتی ھے - مزید براں ٹائپ کی جدید ترین دستی مشینیں Treadle اگر استعمال کی جائیں جو ھاتھ کی طاقت سے ھی چلتی ھیں تو اس پر کام کرنے کے لئے صرف ایک لڑکے کی ضرورت ھوتی ھے جو دن بھر میں دو تین ہزار داب نہایت آسانی سے نکال دیتا ھے اور آپ کو صرف ایک روپیہ آٹھ آنے فی ہزار داب مل سکتی ھے - بر خلاف اس کے لیتھو میں تین اچھے قوی مضبوط آدمی سارا دن محنت کر کے بھی بارا سو سے زیادہ داب نہیں نکال سکتے - اس سے مزدوری کا حساب آپ خود ھی کرسکتے ھیں- ستم ظریفی یہ ھے کہ ھر ہزار داب کے بعد دو بارہ سنگ ساز صاحب کی "نوبت" تشریف آتی ھے- اگر چہ لیتھو میں آپ کا خط بہتر سے بہتر آسکتا ھے، مگر سب سے بڑی بات تو یہ ھے کہ لیتھو میں لاکھ کوشش کی جاے وہ صفائی اور پاکیزگی ھرگز ھرگز نہیں آتی جو ٹائپ کی معمولی چھپائی میں ھوتی ھے - اس لئے ھم مجبور ھیں کہ ٹائپ کا طریقۂ طباعت اختیار کریں اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں کہ یا تو نسخ اختیار کرلیا جاے یا پھر کسی قدر ایثار سے کام لےکر نستعلیق کا ٹائپ تیار کیا جاے —

نسخ ٹائپ کی ایجاد

نسخ ٹائپ کی سب سے پہلی کتاب کا پتہ چلانے کی میں نے بہت کوشش کی۔ مجھکو جو سوال حل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اس ٹائپ میں کتاب " فی ذکر امیر تیمور " تالیف احمد بن عربشاہ سب سے پہلے سنہ ١٦٣٦ء میں اٹلی میں طبع ہوئی ہے۔ میں نے یہ معلوم کرنے کی بے حد کوشش کی کہ سب سے پہلا نسخ ٹائپ کہاں بنا اور کب بنا؟ لیکن افسوس کہ میں اس میں کامیاب نہ ہوسکا —

اس کتاب کے ٹائپ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ ابتدائی کوشش نہیں ہے تو کم از کم اس کے قریب کی ضرور ہے۔ کیونکہ حروف کی شکل، بودی اور جوڑ اچھی طرح نہیں بنے ہوئے ہیں۔ دوم اس میں کوشش کی گئی ہے کہ کرسیاں بھی دی جائیں۔ یہ کرسیاں کہیں تو خاصی آگئی ہیں۔ اور کہیں اگر نہیں آسکی ہیں تو اس کی شکل کچھ عجیب ہوگئی ہے۔ سوم حروف کے جوڑ بہ صورت الفاظ اور بھی زیادہ برے معلوم ہوتے ہیں۔ جہاں ایک کرسی ہے وہ لفظ خاص ہے مگر جہاں دو کرسیاں دبتی پڑی ہیں وہاں نیچے کی کرسی کو نشست سے بہت نیچے گرا کر استعمال کیا گیا ہے۔ بہرحال چونکہ یہ ابتدائی کوشش تھی، اس لئے ہم اعتراض کی بجائے تعریف کریں گے کہ باوجود مشکلات کے اس کے بنانے والوں نے ہمت نہ ہاری۔ اور یہ انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج نسخ کا بہترین ٹائپ بتدریج ترقی کر کے دنیا کو میسر آرہا ہے۔ اگر اسی وقت اس کی یہ خرابیاں دیکھ کر " ہم کو نہیں چاہئے " کے نعرے لگادیے جاتے تو نسخ کا بھی آج وہی حشر ہوتا جو نستعلیق کا ہے، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نسخ ٹائپ کے استعمال کرنے والے ہم سے زیادہ سمجھدار تھے اور اپنی بھلائی برائی اچھی طرح جاننے والے تھے —

ذیل میں ابتدائی ٹائپ اور موجودہ ٹائپ کے نمونے دیے جاتے ہیں، جس سے ناظرین بخوبی اندازہ کرسکیں گے۔ کرسیوں کی جو مشکلات نسخ میں پیش آئی تھیں

اُن کو کس طرح ضرورت اور آسانی کے لحاظ سے نکال دیا گیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو آج جو نسخ ٹائپ کی عمدہ عمدہ خود بخود کمپوز کرنے والی (Mechanical Composing) مشینیں کام کر رہی ہیں وہ صرف خواب و خیال ہی ہوتیں۔ اور عربی بولنے والی قومیں ہرگز اس قابل نہ ہوسکتیں کہ ایک بڑے سے بڑے اخبار کے دن بھر میں صباحی اور مسائی دو ایڈیشن معہ تصاویر کے نہایت اطمینان کے ساتھ نکال دیں

جدید نسخ ٹائپ

الحجر الحجر

قدیم نسخ ٹائپ

الحجر

نسخ ٹائپ کے ہندوستان میں رواج نہ پانے کے اسباب

میں اوپر کہیں بیان کرچکا ہوں کہ خط نستعلیق ہندوستان میں اردو زبان کے پیدا ہونے سے پہلے رائج ہوچکا تھا۔ اور یہ بھی مسلم ہے کہ ہندوستان کی معاشرت اور تمدن پر ایران کی معاشرت اور تمدن کا بہت زیادہ اثر تھا۔ اس لئے جب اُردو پیدا ہوئی تو وہی ایران کا پسندیدہ خط نستعلیق اُردو میں بھی رائج ہوگیا۔ اس خط سے عام طور پر یہاں کے لوگ مانوس ہوچکے تھے۔ ہندوستان کو جب طباعت کی ضرورت محسوس ہوی تو اس وقت لیتھو پریس بھی ایجاد ہوچکا تھا۔ اور چونکہ لیتھو میں نستعلیق خط آسانی سے لکھا جاسکتا تھا اور خط نسخ یا نسخ کے ٹائپ سے ان کی طبیعتیں قطعی

مانوس نہ تھیں اس لئے لیتھو کو انھوں نے غنیمت سمجھ کر قبول کرلیا - دوسرے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ لیتھو کا پریس بہت سستے داموں میں قائم ہوجاتا تھا۔ بہر حال سب سے زیادہ قابل لحاظ جو چیز ہوسکتی تھی وہ نسخ اور نستعلیق کا وہی فرق ہے جس کا میں اوپر نسخ اور کوفی کے مقابلے میں ذکر کرچکا ہوں' یعنی نگاہ اور دماغ پر نسخ ٹائپ کے پڑھنے میں بہ نسبت نستعلیق کے زیادہ بار پڑتا ہے۔ اس کے امتحان کا نہایت آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ نسخ کی لکھی ہوئی ایک عبارت کو اچھی طرح حفظ کرلیجئے اور ایک نستعلیق تحریر ایسی جو بالکل نئی ہو اور آپ نے اس کو پہلے کبھی دیکھا بھی نہ ہو۔ اب آپ نسخ کی حفظ شدہ تحریر کو دیکھ کر پڑھیے اور اس کے مقابلے میں نستعلیق کی بالکل نئی عبارت کو پڑھئے - آپ کو خود ہی معلوم ہوجائے گا کہ باوجودیکہ نسخ کی عبارت کو آپ نے حفظ کرلیا تھا تاہم اس کے پڑھنے سے آپ کے دماغ اور آنکھوں پر زیادہ بار پڑتا ہے - بہرحال میری دانست میں یہی صورت حال نسخ ٹائپ کے ہندوستان میں رائج نہ ہوسکنے کی وجہ موجہ تھی۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ اردو زبان کو اب تک ایسی شدید ضرورت لاحق نہیں ہوئی تھی جیسی کہ اب ہے' اس لئے نسخ کی طرف کوئی اعتنا نہیں کیا گیا' ورنہ شاید "قہر درویش بر جان درویش" کا فلسفہ یہاں بھی اثر دکھلا جاتا —

نستعلیق ٹائپ کی مختصر تاریخ

لیتھو چھپائی کی خرابیاں ہم کو (یعنی ان لوگوں کو جن کو دعویٰ ہے کہ اُردو ان کی مادری زبان ہے) اب کچھ روز سے محسوس ہو رہی ہیں - مگر آج سے سوا سو سال پہلے ہمارے غیر ملکی حکمراں ان سے اچھی طرح واقف تھے - اسی بنا پر اُنھوں نے کوششیں کیں کہ ہمارے جاگنے سے پہلے ہی ہمارے واسطے یہ نعمت تیار کر رکھیں - مگر ہر کام کے لئے قدرت نے ایک وقت مقرر کردیا ہے - جس حد تک نستعلیق ٹائپ کا تعلق ہے' خدا ہی جانے کہ وہ وقت کب آئے گا' یہ بھی کچھ کم خوش نصیبی نہیں ہے کہ ہمارے ذمہ دار اور اردو کے ترقی خواہ افراد اب کچھ

روز سے کوشش کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح لیتھو کے طریقۂ طباعت کی مصیبت سے ان کو آزادی مل جائے۔ مگر یہ آزادی کسی طرح حاصل ہی نہیں ہوسکتی۔ سوال یہ ہے کہ آخر کوئی صورت بھی ایسی ہوسکتی ہے کہ لیتھو کی بلاے مبرم سے اردو کی جان زار کو چھٹکارا نصیب ہو تو اُس کی وہی دو چار صورتیں ہوسکتی ہیں کہ یا تو نسخ یا ہندی یا رومن وغیرہ اختیار کرائے جائیں یا نستعلیق کا ٹائپ جلد سے جلد تیار ہو جائے —

اب تک جس قدر بھی نستعلیق ٹائپ تیار ہوے اور ان میں سے جن جن کا مواد مجھے مل سکا وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) کسی صاحب نے اخبار رعیت میں نستعلیق ٹائپ کی کچھ تاریخ لکھی ہے کہ سنہ ۱۸۰۵ ع میں سب سے پہلے ٹائپ کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ واقعہ صحیح ہے۔ یہ ٹائپ سرکاری مطابع میں تیار کیا گیا تھا۔ اس مطبع کا نام ہندوستانی پریس تھا۔ اس پریس میں بہت سے آدمی کام کرتے تھے۔ جہاں تک اس کا حال معلوم ہوسکا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ نستعلیق ٹائپ بنانے کے لئے کئی خوشنویس اور کاریگر وغیرہ تھے۔ یہ عملہ تقریباً چالیس برس تک قائم رہا اور برابر کوشش کرتا رہا کہ اس میں آسانی کے ساتھ ساتھ خوبیاں بھی پیدا ہوجائیں۔ گویا سنہ ۱۸۰۵ ع میں جس کوشش کا آغاز ہوا تھا اور جو برابر چالیس برس تک جاری رہی وہ کوئی انفرادی کوشش نہ تھی بلکہ اس میں وہی شان موجود تھی جو ایک اجتماعی کوشش اور مشترکہ کاروبار میں ہونا چاہئے۔ کیونکہ جس حد تک انتظام کا تعلق ہے خود حکومت اس کی منتظم تھی۔ جس حد تک خط کی عمدگی کا تعلق تھا متعدد خوشنویس ملازم تھے اور یہ ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ کس طرح آسانی کے ساتھ کسی نقطے کی نشست یا طرزتحریر میں اس طرح اصلاح کی جا سکتی ہے کہ خوبصورتی بھی باقی رہے اور ٹائپ کی ضروریات بھی پوری ہو جائیں اسی طرح ہر ہر کام کے لئے ماہرین کا ایک پورا عملہ موجود تھا۔ اور پھر جب

یہ صورت ہوتی تو یہ کہدینا کہ اب تک اس سلسلے میں " جس قدر کوششیں ہوئیں وہ سب انفرادی حیثیت رکھتی ہیں"۔ درست نہ ہوگا۔ سنہ ۱۸۴۱ء میں جو کتابیں اس ٹائپ میں طبع کی گئیں ان میں بہت کچھ اصلاح کرلی گئی ہوتی۔ کاش ہمارا ملک اس وقت اس قدر بیدار ہو چکا ہوتا کہ وہ اس کی ضرورت کا احساس کر لیتا تو آج ہم کو یہ افسوس نہ کرنا پڑتا۔ [illegible] اور اگر اب سے کچھ [illegible] ملک کی طرف سے ظاہر کی جاتی تو اس [illegible] طور پر بہت کچھ ترقی ہو جاتی۔ اس ٹائپ کی چھپی ہوئی کتابیں اب بھی مل جاتی ہیں

(۲) اس کے بعد مصر اور ایران • نے کوششیں کیں۔ مصر کی کوشش کا نمونہ تلاش کرنے پر بھی میں اب تک نہیں دیکھ سکا۔ البتہ ایران میں ملکم خاں نے جو ٹائپ تیار کرایا اس کی چھپی ہوئی گلستان میں نے دیکھی ہے یہ انگریزی حروف کی طرح علاحدہ علاحدہ حروف ہیں۔ مثلاً گلستاں کو اس طرح لکھا گیا ہے کہ ہر ہر حرف ایک دوسرے سے بالکل جدا جدا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے انفرادی حروف یہاں تک کیونکر عام ہوسکتے تھے —

(۳) کچھ عرصہ ہوا کہ الہ آباد + میں بھی ایک نستعلیق ٹائپ میں کچھ کتابیں چھپی تھیں یہ ٹائپ غالباً الہ آباد والوں نے اکانو میکل پریس لاہور سے خریدا تھا۔ مگر نہ اب لاہور کا اکانو میکل پریس ہی باقی ہے اور نہ الہ آباد

• میں نے سنا ہے کہ پیرس میں بھی ایک نستعلیق ٹائپ تیار کیا گیا تھا۔ اور کچھ کتابیں بھی اس سے طبع ہوئی تھیں مگر میں نے کوئی کتاب باوجود تلاش کے اب تک نہیں دیکھی ہے۔ اس لئے میں کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا۔ کہ وہ ٹائپ کیسا تھا اور کیوں رائج نہ ہوسکا۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ اور ملکوں میں بھی نستعلیق ٹائپ بنا ہو لیکن میرے پاس کوئی مواد نہیں ہے —

+ مجھے معلوم ہوا ہے کہ الہ آباد میں آج کل پھر اس کی کوشش کی جارہی ہے۔ لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ کن اصول کے تحت یہ نیا ٹائپ تیار ہو رہا ہے۔ اس امر کا بہر حال ہم کو یقین رکھنا چاہئے کہ گذشتہ خرابیوں کو دور کرتے ہوئے نیا ٹائپ تیار کیا جائے گا۔ اور گذشتہ ٹائپوں سے یقیناً بدرجہا بہتر ہوگا —

ہی میں کوئی ٹائپ موجود ہے —

(۴) ازاں بعد حیدر آباد کا نمبر آتا ہے - اس میں سب سے پہلی کوشش مولوی نظام الدین حسن صاحب مرحوم کی ہے - ان کی کوشش یہ تھی کہ حروف انگریزی ٹائپ کی طرح علحدہ علحدہ لکھے جائیں —

(۵) و (۶) ان کے بعد مولوی یوسف الدین صاحب مرحوم اور راجہ صاحب دوم کنندہ ہیں - ان ہر دو اصحاب کی کوششیں قریب قریب یکساں ہیں - یعنی دونوں نے اول تو حرفوں کو علحدہ علحدہ کیا ہے پھر اُس پر شکلیں بھی بدلی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا پھر دو ہزار سال پہلے کا خط رائج کرنا چاہتے ہیں —

(۷) راجہ صاحب دوم کنندہ کی مذکورۂ بالا پہلی کوشش تھی - اس کے بعد انھوں نے غالباً جب یہ دیکھا کہ یہ تو ایک عجیب چیز بن گئی ہے تو اُن کا خیال نسخ کے اصول کی طرف پلٹا - تقریباً دو تہائی سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ مجھے بھی راجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا - راجہ صاحب نے نہایت مہربانی سے اپنی تمام کاوشیں مجھے دکھائیں - اُن کی آخری کوشش یعنی اصول نسخ کا اختیار کرنا ذرا بہتر ہے - اس کے اُنھوں نے لکڑی کے حروف بنا رکھے ہیں - حروف کی شکلوں میں صرف اس قدر ترمیم کی ہے کہ وہ نستعلیق کے حروف معلوم ہوتے ہیں - تمام جوڑ ایک ہی لائن پر ملتے ہیں اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ مولوی عبدالکریم حسین صاحب نے جرمنی * کا بنا ہوا نمونہ کھینچی ٹائپ

---

* جرمنی کا بنا ہوا ایک نستعلیق ٹائپ دھلی میں بھی آگیا ہے میں نے اس کو بھی دیکھا ہے - نہایت بدصورت اور بےقاعدہ ہے - بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اب تک جس قدر بھی نستعلیق کے متعلق تجربے کئے گئے اس نے اُن سب پر بدصورتی میں فوقیت حاصل کرلی ہے - موتی اور پتلے جوڑ جو نستعلیق کی خصوصیت تامہ ہے بالکل نظر انداز کردی گئی ہے - کرسیاں بھی صرف دوھی دی گئی ہیں : نشست اچھی نہیں ہے - آخر میں مالے والی یاے مجہول (لیگچرز کے علاوہ) اور یاے معروف میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا ہے - بر حال یہ ایک بالکل ہی بےکار چیز ہے —

میں پیش کیا تھا - اگر اس کو نستعلیق کہا جاسکتا ہے تو میرے خیال میں اس کو ضرور اختیار کرلینا چاہئے - کیونکہ اس کی وجہ سے سیکڑوں مشکلات سے بچ سکتے ہیں -

(۸) میں نے ایک کتاب " انگریزی محاورات نمبرا " پنجاب اکالو موکل پریس لاہور کی چھپی ہوئی دیکھی ہے جو سنہ ۱۹۰۶ ء کی مطبوعہ ہے - اس میں جو نستعلیق ٹائپ استعمال کیا گیا ہے ' میرے خیال میں اس وقت تک کی جس قدر بھی کوششیں ہوئی ہیں سب سے بہتر ہے البتہ خوش خطی میں دارالطبع سرکار عالی کے برابر نہیں آتا - اس میں غالباً پانچ سو سے لے کر چودہ سو تک جوڑ اور لیگچرز ● ہیں - درمیانی ہی کو صرف دوہی دی گئی ہیں اور نشست بھی خراب ہے مگر اس طرح سے دی گئی ہیں کہ نشست کی یا کرسیوں کی خرابی سرسری نگاہ میں بری نہیں معلوم ہوتی - البتہ جوڑ بہت خراب ملے ہوئے ہیں اور نقطے بھی علاحدہ ہیں - پھر بھی یہ ایک بہت کامیاب ٹائپ ہے - میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ ٹائپ کہاں گیا اور کیوں اس کو بے کار کردیا گیا ---

(۹) چند سال ہوئے کہ بمبئی کی گجراتی ٹائپ فاؤنڈری نے ایک نستعلیق ٹائپ تیار کیا ہے - یہ اس وقت حیدرآباد میں دو جگہ موجود بھی ہے - حروف سے نقطے علاحدہ ہیں : خط بھی اچھا نہیں ہے : میں اس فاؤنڈری میں جا کر مالک سے مل چکا ہوں ' میں نے اس کے متعلق کچھ گفتگو بھی کی ' مگر اس کے مالک اور کارکن سب کے سب نستعلیق سے واقفیت تو در کنار اُردو بھی بہت کم بول سکتے ہیں - میں نے اُن سے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ وہ کیوں اس میں ذرا سی ترقی اور نہیں کرتے ہیں - مگر انہوں نے مجبوری کا اظہار کیا - اس کے جوڑ نے میں

● لیگچر Ligature ایسے حرفوں کے مجموعے کو کہتے ہیں ' جس میں ایک سے زیادہ حروف ایک ہی ٹکڑے میں ملے ہوئے ہوں - انگریزی میں fi یا ff وغیرہ ہوتے ہیں اسی طرح نسخ یا نستعلیق میں بھر کے یا کا وغیرہ بنالئے جاتے ہیں -

نقطے اڑانا ، جوے شیر لانے سے کم نہیں ہے —

(۱۰) پانچ چھ سال کا عرصہ ہوتا ہےکہ بیروت کی ایک فاؤنڈری سے نستعلیق ٹائپ کا چھپا ہوا ایک نمونہ آیا تھا - دیکھنے سے بہت خوبصورت معلوم ہوتا تھا - مگر بقول مشہور " جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں " یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ بمبئی والے ٹائپ سے بھی زیادہ مشکل ہے - دارالطبع سرکار عالی نے اس کی خوبصورتی اور اپنی ضروریات کو دیکھتے ہوے اُس کا آرڈر دیدیا - جب وہ یہاں پہنچا تو معلوم ہواکہ یہ تو ایک اچھا خاصا کھلونا ہے اس میں اُنھوں نے یہ ترکیب رکھی ہے کہ مثلاً شروع کی (ب) ہے ، اس کے اُوپر تین نقطے اور نیچے دو نقطے دیدئے ہیں - اب اگر آپ کو (ب) کا استعمال مقصود ہے تو نیچے کا ایک نقطہ اور اوپر کے سب نقطے چھیل ڈالیے ، (ب) کا جوڑ باقی رہ جاے گا - اسی طرح اگر (ت) کی ضرورت ہے تو اوپر کا ایک نقطہ اور نیچے کے دونوں نقطوں کو چھیل دیجئے (ت) ہو جاے گی ، علی ہذاالقیاس ہر کام کے لئے حسب منشا نقطوں کے کم کردینے سے ایک ہی جوڑ مختلف کام دیتا ہے - اس قسم کی دردِ سری کو بھلا سوا اس کے کہ کمپوزیٹر سارا دن بیٹھا ہوا حجامت کرے اور کیا کہا جاسکتا ہے - یہ ہے بیروت کا نستعلیق ٹائپ جس کا دنیا میں اتنا شہرہ ہو رہا تھا —

اس کے بعد دارالطبع سرکار عالی کا ٹائپ اور پھر میری کوشش ہے - یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ حیدر آباد میں ٹائپ کے متعلق مصروفیات کے آغاز کی اصلی وجہ بیان کردی جاے --

سنہ ۱۳۲۱ ف میں جب مسٹر حیدری (نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر) نے معتمدی عدالت و کوتوالی و امور عامہ کا جائزہ لیا تو دارالطبع سرکار عالی کی اصلاح کے ضمن میں اُردو ٹائپ کی طرف توجہ دلائی - کچھ دنوں بعد آپ کی صدارت میں ایک کمیٹی اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے قائم کی گئی جس نے مختلف اہل الراے سے اس معاملے میں مشورہ لیا اور ان کی رائیں طلب کیں - بعد

غور و فکر رائے یہ قرار پائی کہ فی الحال اُردو کے لئے کوئی نفیس اور بہتر نسخ ٹائپ رائج کیا جائے کیوں کہ نستعلیق کا ٹائپ بننا نہایت دشوار ہے - جب عرض داشت اعلیٰ حضرت خلداللہ ملکہ کے حضور میں پیش ہوی تو حسب ارشاد مزید رائیں طلب ہوئیں - بعد ازاں یہ مسئلہ کونسل میں پیش ہوا اور رائے یہ قرار پائی کہ اُردو کے لئے نستعلیق ٹائپ مناسب اور موزوں ہے - اعلیٰ حضرت و اقدس نے بذریعہ فرمان مصدرہ ۲۹ جمادی الاخری سنہ ۱۳۳۹ ھ حکم فرمایا کہ لیتھو کے بجائے ٹائپ اختیار کیا جائے مگر ٹائپ نستعلیق ہو - ارشاد مبارک کی بنا پر دارالطبع سرکار عالی میں نستعلیق ٹائپ کے بنانے کا انتظام شروع ہوا - چونکہ اس عرصے میں جامعۂ عثمانیہ کا بھی قیام ہو چکا تھا اس لئے اس مسئلے کی اہمیت اور بڑھ گئی - نواب سر حیدر نوازجنگ بہادر نے اس بارے میں جس سعی اور سرگرمی کا اظہار فرمایا ہے اور جس شوق اور دلچسپی سے آپ نے نستعلیق ٹائپ کے لئے ہر قسم کی سہولتوں کو بہم پہنچایا ہے وہ نہایت درجہ قابل شکریہ ہے - اسی ضمن میں نا انصافی ہوگی اگر نواب مسعودجنگ بہادر اور مولوی عبدالحق صاحب کے نام نامی بھی نہ لئے جائیں - کیوں کہ اس خصوص میں آپ لوگوں کی مساعی اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو آسانی کے ساتھ فراموش کردیا جائے - مگر قبل اس کے کہ میں یہاں کی کوششوں کا ذکر کروں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا ٹائپوں کی خامیوں کے متعلق جس کی وجہ سے وہ رواج نہ پاسکے میں جن نتائج پر اپنے خیال کے مطابق پہنچا ہوں وہ سلسلہ وار عرض کردوں :—

(۱) سنہ ۱۸۰۵ ع کا ٹائپ یہ ٹائپ :- تیار ہوا اور مسلسل چالیس سال تک اس میں ترمیم ہوتی رہی - میں نے اس کی کتابیں چھپی ہوئی دیکھی ہیں - ایک عرصہ تک محنت کرنے کے بعد میں پتہ چلا سکا کہ اس کے بھی بارہ سو سے لے کر پندرہ سو تک جوڑ تھے - انیسویں صدی کا درمیانی زمانہ ہندوستان کے لئے بہت ہی نامبارک گزرا ہے - اول تو اُردو دانوں پر پہلے ہی سے نکبت چھارہی

تھی ' علم کا شوق بھی نہیں رہا تھا اور جو کچھ تھا بھی تو وہ صرف شاعروں اور شاعری کی حد تک تھا ' پھر ملک میں اس قدر عام بے چینی تھی کہ اپنی جانیں ھی سلامت رکھنا غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ ایجادیں فرصت اور اطمینان کی باتیں ھیں ' اس ایجاد کے متعلق سب سے بڑی مشکل یہ اُن پڑی کہ نستعلیق ٹائپ کی تیاری کا کام سرکار کمپنی کر رھی تھی ' اس کے بعد ھی کمپنی بادشاھت سے بدل گئی ' ساتھہ ھی ساتھہ سرکار کی پالیسی میں بھی غالباً اُردو کی حد تک انقلاب پیدا ھوگیا۔ ایسے زمانے میں جب کہ مسلمانوں کو اپنے سر و پا تک کا ھوش نہ تھا ' ھمارے ٹائپ کو کون پوچھتا۔ نتیجہ یہ ھوا کہ اتنے عرصے کی محنت دم بھر میں تباہ و برباد ھوگئی اور اس کا اب پتہ ونشان بھی ملنا دشوار ھے۔ لیکن دراصل اس ٹائپ میں مشکل چیز یہی تھی کہ جوڑ بہت کثرت سے تھے —

(۲) مصر اور ایران کا ٹائپ :- مصر کی کوشش چونکہ میں نے دیکھی نہیں اس لئے میں کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا۔ البتہ ملکم خاں کی کوشش اس وقت سب کے سامنے موجود ھے۔ نسخ یا نستعلیق کے مفرد الفاظ کبھی موجودہ رسم‌الخط کی جگہ نہیں لے سکتے۔ اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی گئی —

(۳) ملاحظہ ھو نمبر ۸ —

(۴) (۵) اور (۶) تقریباً ایک ھی قسم کی کوششیں تھیں۔ یعنی حروف کو بالکل الگ الگ کردیا گیا تھا۔ پھر طرہ یہ ھے کہ اُن کی اصلی شکلیں بھی مسخ ھو گئی تھیں۔ بھلا ایسی حالت میں کون اس کو پسند کرسکتا تھا —

(۷) راجہ صاحب دوم کلکتہ کی دوسری کوشش :- یہ کوشش البتہ ایک حد تک ٹھیک کہی جاسکتی ھے۔ مگر نستعلیق کی جو اصلی چیز کرسیاں ھیں جب وھی باقی نہ رھی تو پھر اس میں اور نسخ ٹائپ میں کیا فرق رہ گیا۔ صرف دائروں اور چند جوڑوں کی شکل بدل کر اُن کو نستعلیق نما بنا دینے سے وہ نستعلیق نہیں ھوسکتا۔ مجھے جس قدر یاد ھے اُس کی بنا پر میں ذیل

میں اس کا نمونہ پیش کرتا ہوں :—

ممتحن ممتحن

[illegible] نستعلیق ٹائپ   اصل نستعلیق [illegible]

(۱) اانو میکل پریس لاهور کا ٹائپ :— اس ٹائپ کے متعلق میرا الد
ھے کہ اس میں پانچ چھ سو جوڑ ہیں ۔ مگر حقیقت میں کتنے ہیں کچھ پتہ نہ
چل سکتا ۔ نقطے بھی حروف سے جدا ہیں ۔ غالباً یہ بھی کمپوزنگ کی دقت ا
زیادتی جوڑوں کی وجہ سے نا قابل استعمال متصور ہوا ہوگا ورنہ اور تر
لحاظ سے بہترین ہے —

میرا یہاں شاید یہ بیان کردینا بیجا نہ ہوگا کہ جوڑوں کی زیادتی کچھ
ایسی ہی خرابی اور نقصان کا باعث ہوتی ہے دہ جس سے نستعلیق ٹائپ کامیا
نہیں ہوسکتا اس کی زیادتی سے بڑے بڑے نقصانات حسب ذیل ہیں :—

(ا) ہمارے ملک میں ہر کام انفرادی ہوتا ہے ۔ پریس بھی جس قد
قائم ہوتے ہیں وہ سب انفرادی حیثیت رکھتے ہیں : اس لئے یقیناً سرمایہ کی
کمی ہوتی ہے ۔ اُن میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ وہ اس قدر سرمایہ فراہ
کر کے ٹائپ کا سلسلہ جاری رکھہ سکیں —

(ب) جوڑوں کی زیادتی کی وجہ سے کیس (جس میں ٹائپ رکھا جاتا ہے
اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ اُس پر کام کرنے میں وقت بہت زیادہ خرچ ہوتا ہے ۔ وقت
کی زیادتی دوسرے الفاظ میں مطبوعات پر لاگت کی زیادتی ہے —

(ج) ایک تو جوڑ اس قدر' دوسرے مطبوعات پر لاگت زیادہ' اس پر بھی
نستعلیق خط کی اصلی شان اور کیفیت نہ آسکے تو آپ خود ہی خیال فرمائیے کہ
مذکورہ بالا دونوں خرابیوں کو برداشت کر اپنے پر بھی مرضی کے مطابق کام

نہ ہونے کے کیا کیا اثرات ہوسکتے ہیں —

(۹) گجراتی ٹائپ فاؤنڈری بمبئی کا ٹائپ حیدرآباد میں دو جگہ موجود ہے - اس میں صرف دو ہی کرسیاں دی گئی ہیں اور نقطے بڑی عاصدہ ہیں - دو کرسیوں کی وجہ سے نستعلیق کی پوری شان نہیں آتی - خط بھی خراب ہے - اُس پر نقطے علاحدہ جوڑنا بہت ہی مشکل کام ہے - اسی وجہ سے پسند نہیں کیا جاتا۔

(۱۰) بیروت کے ٹائپ کے متعلق میں اُس نے بیان میں بہت کچھہ کہہ چکا ہوں - اب مزید صراحت کی ضرورت نہیں ہے —

(۱۱) بیروت کے ٹائپ کے آنے اور کام نہ دینے پر دارالطبع میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہیں کیوں نہ ٹائپ تیار کیا جائے - خیال کا آنا تھا کہ وہ مثل ہوگئی " کاٹ اور لے دوڑی " - ٹائپ بننا شروع ہو گیا - اس ٹائپ کی تیاری کے لئے مولوی سراج الدین صاحب جو ایک اچھے خوش نویس ہیں مقرر کئے گئے - انھوں نے جس قدر محنت کی اُس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا - حقیقت میں یہ انہیں کا کام تھا کہ وہ اس قدر لا متنا ہی کوشش اور دیدہ ریزی کو مسلسل چار سال تک تن تنہا قائم رکھہ سکے - لغت ، خیال اور ضرورت کے مطابق جوڑ تیار ہوتے رہے - مگر بطور جملۂ معترضہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب تک سوا سو برس کے اندر جس قدر بھی ٹائپ بنے وہ نا کامیاب کیوں رہے اور دارالطبع نے ان تمام خرابیوں کو کہاں تک دور کرتے ہوے یقینی کامیابی کے خیال میں جو مزید کوشش شروع کی وہ کن کن اصول کے تحت تھی - آیا گزشتہ ٹائپوں کی خرابیوں اور کمزوریوں پر کافی غور کرنے کے بعد کوئی اصول مقرر کیا گیا تھا - اگر ایسا کیا گیا تھا تو پھر آخر ویسے ہی عیب دار ٹائپ تیار کرنے کے کیا وجوہ تھے - میرے خیال میں اگر ٹائپ کے کار کن اور تنقید کرنے والے اس پر ذرا بھی غور فرماتے تو یقیناً منزل مقصود

قریب سے قریب تر ہو جاتی اور جو غلط فہمیاں اس وقت پھیل رہی ہیں، اُن کی نوبت نہ آتی —

دار الطبع میں ٹائپ بنتا رہا اور یہ کام تقریباً چار سال تک جاری رہا۔ چار سال کے بعد جب نواب مسعود جنگ بہادر کی کتاب " روح جاپان " چھپ کر نکلی تب نہیں بلکہ تو معلوم ہوا کہ دارالطبع کا ٹائپ ابھی تک نامکمل ہے۔ یعنی " سمجھوتی" اور " چمکنی " جیسے معمولی الفاظ بھی ملا کر نہیں لکھے جا سکے اور ان کے ٹکڑے کرنے پڑے۔ با وجود گیارہ بارہ سو جوڑ اور لگیچروں کے ایسا کیوں ہوا ؟ اس کا جواب ذیل کی سطور میں بہت اختصار کے ساتھ عرض کرتا ہوں —

میں نے اپنی رپورٹ (پیش کردہ کمیٹی ٹائپ منعقدہ ۲۲ جولائی سنہ ۲۸ ء) میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ جوڑوں کی زیادتی کے با وجود پورے الفاظ کا نہ بننا محض اس لئے ہے کہ دارالطبع نے ٹائپ میں جوڑوں کے ملنے کا کوئی اصول مقرر نہیں کیا تھا بلکہ جانا ہے کہ گذشتہ تجربے کو بنا پر دارالطبع کے ٹائپ میں اس امر پر غور ہو رہا ہے کہ کون سا جوڑ کس قدر انچائی سے کن کن حالتوں میں کن کن حروف سے ملےگا۔ اگر یہ اصول پہلے ہی سے مقرر کر لیا جاتا تو حواہ کرسیاں دو ہو تین یا پانچ کسی حال میں کوئی لفظ اس سے باہر نہیں جاسکتا تھا۔ کوئی ایجاد یا اسکیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کی بنیاد کسی اصول کے تحت نہ ڈالی گئی ہو۔ اگر اس قسم کا اصول بنا لیا جاتا تو میری دانست میں دارالطبع کے مقابلے میں کوئی ٹائپ نہیں آ سکتا تھا۔ بہر حال مختلف الفاظ کو لے لےکر حسب ضرورت جوڑ تیار ہوتے رہے آخر اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ یعنی وہ ایک ایسی چیز ہو گیا کہ اس کو نہ تو دوسرا خرید سکتا ہے اور نہ وہ خود استعمال کے قابل ہے۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہوی کہ ٹائپ جو ایک مرتبہ جوڑ کر چھاپا جاچکا ہےآئندہ اس سےکام نہیں لیا جاسکتا اور گلا دیا جاتاہے۔ دوسرے کیس بہت بڑاہے، جس کو خرید نے کے واسطے کافی سرمائے کی بھی ضرورت ہوگی —

گو دارالطبع نے فورٹ ولیم والے ٹائپ کی طرح کام کیا مگر غالباً وہ ایسا ناکارہ نہ تھا کہ ایک مرتبہ کی چھپائی کے بعد بے کار ہو جاتا ہو - کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو نہ وہ مسلسل چالیس سال تک کام دیتا اور نہ مرشد آباد اور لکھنو کے پریس اس کو خرید سکتے - البتہ یہ ضرور ہے کہ کرسیوں کے زیادہ ہونے کی وجہ سے دارالطبع کا ٹائپ اس سے بدرجہا خوبصورت ہے —

" روح جاپان " کی اشاعت نے ارباب صدر کی توجہ کو اس طرف پھر متوجہ کیا - اور یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ ٹائپ کہاں تک کارآمد ہے' مولوی عبدالحق صاحب پرنسپال اورنگ باد کالج وسکریٹری انجمن ترقی اردوکو مقررفرمایا گیا - انھوں نے مذکورۂ بالا نقائص معلوم کئے - دارالطبع کی یہ گیارہویں کوشش تھی - اب بارھویں کا نمبر آیا " قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند " کی صورت ہوی' اور میں اس دلدل میں پھنس گیا کیونکر پھنسا اس کی بھی کیفیت عرض کئے دیتا ہوں —

آذر سنہ ۱۳۳۱ ف (اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ ع) سے میں نے ایک ماہانہ رسالہ "نمائش" نکالنا شروع کیا - جو اب تک بفضل خدا جاری ہے - رسالہ کی اس قدر آمدنی تو تھی نہیں کہ میں صرف بحیثیت ایڈیٹر کاغذ کے لمبے لمبے سلپوں کو اپنے ' زشت خط سے رنگنے پر اکتفا کرتا ' میں خود ھی ایڈیٹر تھا ' خود ھی منیجر اور خودھی مصحح تھا - جب کاپیوں کی تصحیح کرنی پڑی یا کاتبوں اور مالکان مطابع سے معاملات پڑے (میں نے اپنا ذاتی پریس بھی رکھا تھا مگر وہ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا) تو وہ تمام مراحل مجھے طے کرنے پڑے جوقبل ازیں لیتھو طباعت کے سلسلے میں لکھ آیا ہوں - میں نے اس میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ سب آپ بیتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر اردو مصنف کو یہی روزبد دیکھنا پڑتا ہوگا - انھی مصیبتوں کی وجہ سے مجھے خیال پیدا ہوا کہ نستعلیق ٹائپ کی کوشش کی جاے - اس کے متعلق پرانی کتابیں وغیرہ دیکھیں' تمام مواد فراہم کیا - اور جو کچھ اس بارے میں اب تک دنیا میں ہو چکا تھا اس پر غور کیا اور یہ معلوم کر نے

کی کوشش کی کہ آخر کیا وجوہ ہیں جو باوجود ٹائپ بن جانے کے رائج نہ ہو سکا۔ میں نے ان سے جو کچھ اخذ کیا اُن کا اظہار میں اوپر کرچکا ہوں - اب میں نے کوشش کرنی شروع کی کہ دیکھوں میں کہاں تک جوڑوں میں کمی کرسکتا ہوں - پانچ سال کی مسلسل کوشش کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچا تھا اس کو میں نے ٹائپ کی صورت میں بنا کر پیش کر دیا - اس قسم کا ٹائپ میں نے کیونکر بنایا؟ اس کی وجہ بھی سن لیجئیے - ایک مدت کے ارادے کی ناکامی مجھکو مختلف ٹائپ فاؤنڈریوں میں لے گئی - میں نے ہر قسم کے ٹائپ دیکھے - آخر تلنگی و مرہٹی کے ٹائپ دیکھنے کے بعد ایک خیال آگیا اور اسی کو میں نے اپنا اصول قرار دے لیا - اسی اصول کو لے کر میں نے نستعلیق میں حروف ملانے کی کوشش کی (خدا کا شکر ہے کہ وہ کامیاب ثابت ہوئی)۔ جب یہ ٹائپ کا نمونہ کاغذ کے ٹکڑوں پر بن گیا تو (خدا مغفرت کرے) مولوی عظمت اللہ خاں صاحب نے میری بڑی ہمت افزائی کی - ان کی رائے ہوئی کہ میں کہیں سے بھی فاونڈری کا کام سیکھ کر آؤں - میں بمبئی گیا - ہر ایک جگہ ہاتھ پھیلائے کہ مجھے کام سکھادیں - مگر اس معاملے میں ہندو ذہنیت سے کام لیا گیا اور کسی نے میری ہمت افزائی نہ کی - مختصر یہ کہ جیسا گیا تھا ویسا ہی چلا آیا - اور یہ معاملہ کچھ عرصے کے لئے بالکل ہی ختم ہو گیا —

جب مولوی عبدالحق صاحب دارالطبع کے ٹائپ کی تنظیم کے لئے مقرر ہوئے تو میں نے اپنا طریقہ ان کے سامنے پیش کیا - مولوی صاحب نے اس کو اچھی طرح سمجھ کر میرے متعلق گورنمنٹ سے درخواست کی کہ ان کو ایک موقع دیا جائے - چنانچہ مجھے موقع دیا گیا —

میرے پاس ٹائپ کے متعلق جو کچھ بھی سرمایہ تھا وہ صرف کاغذ کے ٹکڑوں کی شکل میں تھا - مجھے کوئی عملی تجربہ فاؤنڈری کے متعلق اس وقت تک نہیں تھا - بلکہ مجھ پر ہی کیا منحصر ہے خود دارالطبع میں نستعلیق ٹائپ بننے سے پہلے کوئی اس کام سے واقف نہ تھا - یہ صرف آر - وی - پلے صاحب مہتمم دارالطبع

کی ھی انتھک کوشش کا نتیجہ تھا کہ اُنھوں نے مدراس وغیرہ سے ایسے آدمی فراھم کر لئے تھے جو اس کام کو چلا سکتے ہے اور جن کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی تیار ھوگئے تھے - میں پلے صاحب کا بے حد مرھون منت ھوں کہ ان کی انھی کوششوں کی وجہ سے مجھے بھی سیکھے ھوئے آدمی آسانی سے مل گئے اور میں ٹائپ بنا سکا - اب جس طرح سے کہ دارالطبع کے لوگ فاؤنڈری کا کام نستعلیق ٹائپ کا کام کرنے سے سیکھہ گئے ھیں، اسی طرح شاید میں بھی تھوڑا بہت ضرور سیکھہ گیا ھوں گا —

میں صرف اس دعوے سے دارالطبع میں پہنچا تھا کہ اپنے ٹائپ کو تھائی سو جوڑوں میں ختم کردوں گا - سچ پوچھئے تو یہی چیز ایسی تھی جو اب تک ناممکن خیال کی جاتی تھی - باقی سب فروعات تھے - میں نے کوئی دعوی خط کی خوبصورتی یا بد صورتی کا ھرگز نہیں کیا تھا - اس واسطے کہ میں جانتا تھا کہ نہ معلوم ان جوڑوں کے آپس میں ملنے کے بعد کیا کیا شکل ھوجائے گی - جتنا میں نے دعوی کیا تھا، خدا نے مجھے اس میں کامیاب بھی کردیا - عبدالقیوم صاحب پر خط کی خرابی کا جو الزام تھوپا گیا ھے وہ بھی غلط ھے - اس واسطے کہ قیوم صاحب میرے قاعدوں کے پابند تھے، نہ کہ اپنی خطاطی کے - مثلاً اصول نستعلیق کے تحت ایک جوڑ اگر صرف $\frac{1}{4}$ انچ جگہ چاھتا ھے اور میرے اصول کے لحاظ سے اُس کو $\frac{2}{5}$ انچ میں آنا چاھئے تو ایسی صورت میں قیوم صاحب مجبور تھے کہ میری ھدایت کے بموجب اتنی ھی جگہ میں اس جوڑ کو لکھدیں - اس میں ان کے خط یا خطاطی کو کہاں تک دخل تھا؟ اس کا الزام تو سب میرے سر پر ھے، اور جس قدر بھی مجھہ کو برا بھلا کہا جائے میں اُس کا سزاوار ھوں - اس کے علاوہ میں ایک اور طرح سے بھی مورد الزام قرار پاتا ھوں کہ دراصل دارالطبع کے نستعلیق ٹائپ کے راز کی پردہ دری صرف میری وجہ سے ھوئی - ورنہ غالباً یہ آج تک اُسی طرح سر بستہ رھتا جیسا کہ چل رھا تھا اور اخبارات وغیرہ کسی کو بھی اعتراضات کا

موقع نہ ملتا - خیر میں نے ٹائپ بنا دیا - اور جو کچھ وقت کہ مجھ کو دیا گیا تھا وہ دارالطبع کی تیاری ٹائپ کے وقت کا تقریباً $\frac{1}{8}$ حصے تھا، تاہم وہ تیار ہو گیا - خط درست اور بہت خراب ہے - ٹائپ فل باڈی Full Body نہیں بلکہ موٹائی اور ٹکڑوں کی طرح سے ٹکڑے دار Fraction Body ہے - جس کی وجہ سے علاوہ خط کی خرابی کے حسب ذیل اعتراضات قائم ہوتے ہیں :—

(ا) ٹکڑے دار ٹائپ اصول ٹائپو گرافی Typography کے بالکل خلاف ہے -

(ب) اس کا جوڑنا بہت مشکل ہے -

(ج) غلطیوں کی درستی کے وقت مصیبت پڑتی ہے -

(د) ٹکڑے دار ہونے کی وجہ سے اس کو کوئی نہیں خریدے گا —

(ہ) اس کے اسپیسس Spaces اور ٹائپ دونوں کو ملایا جائے تو تقریباً آٹھ سو جوڑ ہو جاتے ہیں —

(و) اس کے کمپوز کرنے میں بہت وقت خرچ ہوتا ہے —

میں اس وقت نہ کسی کی تردید کروں گا نہ اعتراضوں کا جواب دوں گا، کیونکہ اس کے لئے علاحدہ وقت کی ضرورت ہے - میں نے اس مضمون میں صرف اس امر کی کوشش کی ہے کہ ہر ایک ٹائپ کی ضروری ضروری خرابیاں بتا دی جائیں اور اپنے ٹائپ کی تمام وہ خرابیاں جو اس وقت تک اکثر لوگ ظاہر کر چکے ہیں بیان کردی جائیں - بہر حال میرے اور دارالطبع دونوں کے ٹائپ میں خامیاں تھیں، اور اسی پر غور کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے ملک کے آٹھ اعلیٰ عہدے دار اور ایک ماہر فن کی کمیٹی منعقد ہوئی تھی - کمیٹی کی رائے میں دونوں ٹائپ اس کی اہلیت رکھتے ہیں کہ ان کی خامیوں کو دور کیا جاسکے - یہی وجہ ہے کہ مزید ایک سال کی مدت عطا فرمائی گئی ہے —

میں اس حسن ظن کا مشکور ہوں کہ " کرسیوں کا ٹھیک کر لینا ذرا سی یا معمولی بات نہیں " - اس کا جواب اس وقت دینا بالکل قبل از وقت ہے،

کیونکہ اول تو ہر شخص اپنی چیز کو اچھا سمجھتا ہے ' مگر دیکھنا یہ ہے کہ دوسرے اُس کو کس نظر سے دیکھتے ہیں ' یا دوسروں کے لئے وہ چیز کہاں تک کار آمد ہوسکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر اِس وقت میں کہوں کہ میں ہر خرابی کو نہایت آسانی سے دور کردوں گا یا تنقید کرنے والے کہیں کہ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا تو حقیقت میں ہم دونوں غلطی پر ہوں گے - تھوڑا اور انتظار کیجئے ' ایک سال کے بعد خود ہی ہر چیز پبلک کے سامنے آ جائے گی —

اب میں ناظرین کی توجہ تھوڑی دیر کے لئے معزز اخبار رہبر دکن کی حسب ذیل اشاعتوں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں - جس میں ایک مضمون بحیثیت ایڈیٹوریل کے اور ایک مضمون ناقد صاحب کا طبع ہوا ہے (رہبر دکن مورخہ یکم و ۲ و ۹ و ۱۰ شہریور سنہ ۱۳۳۷ ف) —

مجھے اس کا بالکل افسوس نہیں کہ ہر دو اصحاب نے میری ذات سے متعلق کیا لکھا ہے' بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو کچھ لکھا وہ بہت کم اور بالکل صحیح ہے۔ میں اِن کا اس لئے بھی شکر گذار ہوں کہ مجھے اپنی ذات کے متعلق شاید جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی - البتہ اتنا افسوس ہے کہ فاضل ایڈیٹر صاحب نے بغیر تحقیقات کے غیر ذمہ دارانہ بیانوں پر میرے ٹائپ کے جوڑوں کی تعداد چار سو تحریر فرما دی - پبلک کی صحیح اطلاعات کی تمام تر ذمہ داری ملک کے اخبارات پر ہے - جب خود اخبارات کی یہ حالت ہو تو بھلا پبلک میں غلط فہمی کیوں نہ پیدا ہو - اس سے بھی زیادہ افسوس مجھے اس بات کا ہوا کہ جب میں نے ایک خط کے ذریعے اُن کو اطلاع دی تھی کہ جوڑوں کی تعداد اور اخراجات کی رقم دونوں کے اعداد بالکل غلط ہیں تو انھوں نے اپنی سابقہ غلطی کے اعتراف سے اپنا اخلاقی فرض ادا نہ کیا اور یہ معلوم نہ ہوا کہ اُن کا ایسا نہ کرنے سے کیا مقصد تھا۔ خیر ' میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید اس میں بھی اِن کو میری کچھ بھلائی منظور ہوگی ' اور میں ہی غلطی پر ہوں گا —

اسی مضمون میں فاضل ایڈیٹر صاحب جب مولوی عبد الکریم دہلوی صاحب کی تعریف پر آئے تو بغیر کافی غور کے کہ ان کا پیش کیا ہوا نمونہ کیا ہے اور نستعلیق کے کم از کم کس قدر جوڑ ہو سکتے ہیں • نہایت وثوق کے ساتھ تحریر

• اردو کے حروف، اگر دو چشمی ھ، لا، ء اور یائے مجہول کو حساب میں لکھا جائے تو (۳۹) ہوتے ہیں۔ ان میں ا، د، ڈ، ذ، ر، ڑ، ز، ژ، و، لا کو نکال کر بقیہ (۲۹) حروف ایسے ہیں جن کی لکھنے میں چار چار شکلیں ہوتی ہیں - یعنی الفاظ کے شروع میں، بیچ میں، آخر میں اور منفرد جو سب مل کر (۲۹ × ۴ = ۱۱۶) ہوں۔ الف ممدودہ، ٹلوہلی اور سادہ علاحدہ اور آخر میں جملہ (۶) قسم کے ہوتے ہیں۔ لا سادہ اور ٹلوہلی علاحدہ اور آخر میں جملہ (۴) قسم کے ہوتے ہیں و ہمزہ لا اور سادہ علاحدہ اور آخر میں جملہ (۳) قسم کے ہوتے ہیں۔ د، ڈ، ذ، ر، ڑ، ز، ژ، و کی علاحدہ اور آخر میں ان کی دو دو شکلیں ہیں مگر صرف دو ہی قسم کا حساب لکھا گیا ہے چار چار قسم سے لے ہیں۔ اس طرح ان کی (۱۶) شکلیں ہو گئیں۔ اب بقیہ (۳) ایسے ہیں جن کی دو ہی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ اس حساب سے اس کی (۶) شکلیں ہوئیں۔ موجودہ بالا شروع کے (۲۹) حروف ایسے ہیں جو پہلے اور سوتے جوڑ دونوں قسم کے ہوتے ہیں - یہ حساب ان کی شروع اور بیچ میں ہوتی ہے - اس لئے ۲۹ × ۲ = ۵۸ ہوئے - ان تمام کو ملا لیا جائے تو (۲۰۹) ہوجاتے ہیں - اس کے علاوہ یائے مجہول اور معروف ہمزہ اور الف کے ساتھ ہوتی ہیں - ک - گ جب ا، ے سے ملتے ہیں تو ان کی شکل اور ہی ہو جاتی ہے - ب - پ - ت - ٹ - ث - ن اور ی کے شروع اور بیچ کے جوڑ مختلف الفاظ میں مختلف شکلیں رکھتے ہیں - ان کو بھی (۲۰۹) میں ملا لیا جائے تو رہبر دکن کے اعلان کردہ سوا دو سو جوڑوں سے کہیں زیادہ ہو جاتے ہیں - اور یہ ابھی تک صرف ایک ہی لائن پر ملنے والے ہوئے (جیسا کہ جرمنی کا بنا ہوا نستعلیق نما ٹائپ نسخ ٹائپ کے اصول پر آج کل آرہا ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ نمونہ مذکور بھی وہی ہو) ان میں ابھی نستعلیق کی اصلی کرسیاں جو بعض الفاظ میں چار چار پانچ پانچ تک ہوتی ہیں باقی ہیں - دوسرے کشش جو اشعار لکھنے کے لئے ناگزیر چیز ہے وہ بھی باقی ہے - ان سب کو اس میں شامل کیا جائے تو تعداد کم از کم چھ سے سات سو تک پہنچتی ہے - پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سوا دو سو کا اعلان بغیر حساب کئے کس بنا پر کردیا گیا - اگر بفرض محال یہ خیال کر لیا جائے کہ حروف کے نقطے علاحدہ کردیے گئے ہیں تو گجراتی ٹائپ یہاں موجود ہے، اس کی دلکشی کو پہلے دیکھ لیا جاتا اور پھر کوئی رائے دی جاتی —

فرما دیا کہ صرف سوا دو سو جوڑوں میں مولوی صاحب نے نستعلیق ٹائپ ختم کردیا۔ حالانکہ کمیٹی ٹائپ میں جب سخت اصرار کیا گیا تب کہیں پانچ سو جوڑوں پر انہوں نے رضامندی ظاہر کی - اگر سوا دو سو جوڑوں میں مولوی عبدالکریم صاحب اپنا ٹائپ ختم کرچکے تھے ' بلکہ تین قسم کے نمونے رہبر دکن کے دفتر میں بغرض اشتہار بھیج بھی چکے تھے تو پھر (۲۲۵) کے یک دم (۵۰۰) کس طرح ہوگئے - میرا تو تمام کاغذی عمل تھا اور مولوی صاحب ٹائپ بھی بنوالاے تھے - پھر یہ کایا پلٹ کیسے ہوگئی - خیر ' اس کا جواب بھی میں کسی آئندہ وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں - میرے اس لکھنے سے مقصد یہ ہے کہ اس قسم کی غلط اطلاعات سے پبلک میں جو مختلف قسم کے خیالات پیدا ہو گئے ہیں ان کی ایک حد تک اصلاح ہوجاے اور بس —

اب ذرا " ناقد صاحب " کے مضامین بھی ملاحظہ فرمائیے ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب واقعات سے تو ضرور واقف ہیں مگر عملی کام سے بالکل ہی ناواقف ہیں - اور شاید کچھہ باتیں کسی غیر متعلقہ ہستی سے معلوم بھی ہوگئی ہوں گی' جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ " ایک لاکھہ اٹھانوے ہزار کی بربادی پر آنسو بہاے جائیں " حالانکہ ۳۵ - ۴۰ ہزار روپے کی مشنری وغیرہ کی قیمت ملاکر میری اور دارالطبع دونوں کی کوششوں پر اب تک تقریباً ساٹھہ ستر ہزار روپے صرف ہوے ہیں - نہ معلوم ناقد صاحب کو یہ اعداد کہاں سے معلوم ہوگئے - ایک جگہ لکھتے ہیں کہ نستعلیق ٹائپ کی ناکامیابی کے اسباب میں منجملہ اور چیزوں کے "ایک خود نستعلیق کی میکانیکل Mechanical ناقابلیت ہوسکتی ہے " - میں نے ٹائپ بنایا ' تقریباً دس مہینے فاؤنڈری میں کام بھی کیا ' مگر اس چیز کو آج تک باوجود غور کرنے کے میں نہ سمجھہ سکا کہ میکانیکل ناقابلیت نستعلیق میں کیا ہوسکتی ہے - میری سمجھہ سے یہ مسئلہ بہت بالاتر ہے - ماسوا اس کے اس چیز کو میں نے بمبئی کے ٹائپ بنانے والوں سے بھی دریافت کیا مگر

وہ بھی اس کے سمجھنے سے قاصر رہے - کیا اس سے ناقد صاحب کا یہ مقصد ہے کہ :-

(۱) نستعلیق حروف کے جوڑوں کے ملنے میں کوئی خاص قسم کی مشین وغیرہ کام کرتی رہتی ہے - یا یہ کہ

(۲) یہ خط مشین میں ڈھل نہیں سکتا - یا اُن کا مقصود یہ ہے کہ

(۳) نستعلیق خط میں Mechanical Composing نہیں ہوسکتی —

نمبر (۱) بالکل مہمل ہے - نمبر (۲) کے متعلق ناقد صاحب کو معلوم ہونا چاہئیے کہ ان کا خیال غلط ہے - نستعلیق ڈھل سکتا ہے اور اچھی طرح ڈھل جاتا ہے - تمام وہ چیزیں جو باقی کے باہر نکلی ہوئی ہوتی ہیں، نہایت آسانی سے باڈی کے باہر نکل سکتی ہیں - رہا تیسرا سوال تو یہ بھی ہوسکتا ہے، بشرطیکہ رقم اور وقت کافی ہو - بہرحال ان کا اصل اعتراض میں بالکل نہیں سمجھ سکا ہوں - البتہ اگر اتنے بھاری بھاری الفاظ سے خواہ مخواہ لوگوں پر رعب بٹھانا مقصود ہے تو اور بات ہے - ورنہ میرے خیال میں ایک مہمل اعتراض سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا —

ایک اور جگہ بھی اس کی تائید میں لکھتے لکھتے تحریر فرماتے ہیں: " مختلف زبانوں کے حروف کے الفاظ اور ان کے میکا نیکل شکل و صورت کی باہمی مناسبت کا تقابلی علم" ——— میں کم از کم اس سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکال سکا ہوں - اگر ناظرین میں سے کوئی صاحب مجھے اس کا مفہوم سمجھائیں تو میں بے حد مشکور ہوں گا - اور ممکن ہے کہ سمجھنے کے بعد میں کوئی جواب پیش کر سکوں —

معیار قابلیت کی شرائط کے متعلق ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ " نستعلیق کے اصول رسم الخط کے تدریجی ارتقا، تغیرات اور اساتذہ کی اصلاحیں" بھی نستعلیق ٹائپ کے بنانے والوں کے علم میں ہونی چاہئیں ——— میں خود خوش نویس نہیں ہوں، مگر کیا یہ دریافت کرنے کی میں جرأت کرسکتا ہوں کہ اس سے نستعلیق

ٹائپ بنانے میں کیا امداد پہنچ سکتی ہے ۔ مثلاً خط نسخ اور تعلیق سے خط نستعلیق بنا ہے ۔ اب کیا ناقد صاحب ان اصلاحات سے یہ کام لینا چاہتے ہیں کہ جہاں ضرورت ہو وہاں نسخ، تعلیق، شکستہ یا کسی اور خط کا جوڑ اُس میں کام لایا جائے یا کیا ۔ اگر ایسا ہے تو صاحب موصوف کو معلوم ہونا چاہئیے کہ اول تو دنیا اس پر تیار نہیں ہے کہ بجائے آگے بڑھنے کے پیچھے ہٹیے ۔ دوم نستعلیق میں ذرا سی رد و بدل بھی نستعلیق کو نستعلیق نہیں رکھتی ۔ دور کیوں جائیے، میں نے اپنے ٹائپ میں محض ٹائپ کی سہولتوں کے مدنظر چند ایسی ہی باتیں کرلی تھیں، جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ یائے مجہول کو میں نے تعلیق اور شکستہ کی طرز میں اس طرح (ی) بنایا تھا، مگر کسی نے اُس کو پسند نہیں کیا ۔ اس لئے نستعلیق کا تدریجی ارتقا اب کوئی کام نہیں دے سکتا اور اس قسم کے غلط راستوں سے کوئی نتیجہ نہیں —

مضمون کی طوالت کے اندیشہ سے میں نے ہر چیز کو بہت مختصر لکھا ہے ۔ ناقد صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب موصوف مجھ سے ضرور واقف ہیں ۔ اس لئے میں ان سے نہایت عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھے اپنے نام نامی سے مطلع کریں ۔ میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہوکر جو کچھ میں جانتا ہوں تفصیل سے عرض کرکے اُن کی تشفی کر دینے کی کوشش کروں گا اور ممکن ہے کہ اُن کی تنقید سے مجھے بھی کوئی فائدہ پہنچ جائے —

میں نے اس مضمون میں کوشش کی ہے کہ نستعلیق ٹائپ کے لئے ابتک جو کچھ ہوا ہے وہ بطور ایک تاریخ کے ایک جگہ جمع کردیا جائے ۔ رہا آئندہ کے متعلق، تو اس کے لئے بہترین چیز یہ ہے کہ ہم کو نہایت اطمینان سے نتیجے کا انتظار کرنا چاہئیے ۔ میں اور دارالطبع دونوں اس معاملے میں ایک دوسرے کے مقابل کوشش میں لگے ہوے ہیں ۔ اور یہ بھی ایک یقینی چیز ہے کہ جب دو لڑتے ہیں تو تیسرے کا فائدہ ضرور ہوتا ہے ۔ گو دو جگہ کام ہونے کی وجہ سے پندرہ

بیس ہزار کا خرچ سرکار پر زاید پڑرہا ہے مگر ہیں تو یہ کہونگا کہ پندرہ لاکھ میں بھی اگر سرکار کو نستعلیق ٹائپ جیسی کامیاب چیز مل جائے تو بہت سستی ہے۔ ایک سال کے بعد ان دونوں میں سے ایک نہ ایک ٹائپ پبلک کے سامنے ضرور آجائیگا۔ اس لئے یہ کہنا کہ فلاں اچھا ہے اور فلاں خراب ہے بالکل قبل از وقت ہے۔ ایک سال آنکھ بند کرکے گذر جائیگا۔ اس وقت اگر اس قسم کے اعتراضات کئے جائیں تو میرے خیال میں ایک حد تک درست بھی ہونگے۔ مگر اس وقت کا کچھ کہنا بالکل بے نتیجہ ہے —

آخر میں میں تنقید کرنے والوں سے پھر استدعا کرتا ہوں کہ وہ جب کبھی تنقید فرمائیں تو براہ کرم صحیح حالات معلوم کرنے کے بعد تنقید کریں۔ غیر ذمہ دارانہ بیانات کو مستند خیال کرکے اُن پر عمل کرنا بالکل بے کار ہے کیونکہ اس سے خود لکھنے والوں کی ذاتی وقعت واقف کار لوگوں کی نگاہوں میں باقی نہیں رہتی —

سعدی

از

(جناب سید حسن برنی صاحب بی ، اے : ال ال بی)

[خیام اور حافظ کے بعد کرا دے وو (Carra de Vaux) نے سعدی پر لکھا ہے ' اور سعدی کے بعد عطار اور رومی کا نمبر ہے —
یہ مختصر مضمون بھی جو " محققین اسلام " (Les Penseurs de l' Islam) جلد چہارم (ص۲۹۳ - ۳۰۴) سے ماخوذ اور براہ راست فرانسیسی زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے ' حسب معمول مختصر ' مگر دلچسپ و پر مغز ہے —

سعدی پر اس وقت تک جو بہترین کتاب لکھی گئی ہے وہ بھی فرانسیسی زبان میں ہے (Essai sur le Poete Saadi Suivi d' une Bibliography , Paris ; Librarie Paul Geuthner 1919) " مقالہ بر حالات سعدی مع فہرست کتب " اس کتاب کا مصنف ڈاکٹر ماسے (Henri Masse (Docteur es lettres ہے ' اور اُس کی ضخامت سوا تین سو صفحات ہے - کتاب چار حصوں میں منقسم ہے - حصہ اول (ص ۱ تا ۱۳۰) کے باب اول میں سعدی کے حالات زندگی اور باب دوم میں اُس کی تصانیف سے بحث کی گئی ہے - حصہ دوم (ص ۱۰۳ - ۱۹۹) میں سعدی کا مرتبہ بحیثیت ایک متفکر و معلم (Le Penseur) کے دکھا یا گیا ' اور تین جداگانہ ابواب میں اُس کی تمدنی ' اخلاقی اور دینی افکار و

تعلیمات سے بحث کی گئی ہے تیسرے حصے (ص ۱۹۹ - ۲۶۸) میں سعدی پر بحیثیت فن لطیف کے استاد کامل (L'Artiste) کے تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس حصے میں چار باب ہیں پہلے اور چوتھے باب میں سعدی کے طرز بیان، دوسرے باب میں اُس کے مضامین شاعرانہ اور تیسرے باب میں اُس کے تجربات عالم سے بحث کی گئی ہے - خاتمے میں سعدی کے متعلق ایک مجموعی اور انتقادی تبصرہ قلمبند کیا ہے۔ حصۂ چہارم (۵۷ صفحات) میں مفصل فہرست کتب ہے جس میں تصانیف سعدی کے طبعات و تراجم اور اُس کے حالات زندگی کے مشرقی و مغربی مآخذ و مصادر درج ہیں - اخیر میں سعدی کے متعلق بعض سربرآوردہ مغربی ادیبوں کے خیالات و آرا نقل کی گئی ہیں - الغرض یہ کتاب ہر طرح مکمل اور اُردو میں ترجمہ کئے جانے کے قابل ہے --

حال ہی میں سعدی کی گلستان کا ایک جدید فرانسیسی ترجمہ با تصویر بڑے اہتمام سے پیرس میں شائع ہوا ہے، جس کی قیمت تین سو فرنک (تقریباً ۳۵ روپے) ہے - مفصل پتہ حسب ذیل ہے :-

Saadi – Le Jardin des Roses et des Fruits, Tradait du Persan par Franz Toussaint. Illustre par Desligneres. P P. 248, Paris, 1928.)

[سید حسن برنی

سعدی، شیریں ناصح اور خوشنام شاعر، بمقام شیراز سنہ ۱۱۸۴ ع میں بعہد اتابک پنجم فارس پیدا ہوا* - یہ زمانہ پر آشوب تھا - اتابکان فارس مسلسل طور پر

---

* سعدی کے حالات کے لئے دیکھو دیباچہ ترجمہ بوستان نوشتہ بارلی اے دی مینار (Barlier de Meynard) و نیز "مقالۂ بر سعدی" (Essai sur le Poet Saadi) نگاشتہ ماسے (H. Masse) مطبوعۂ پیرس سنہ ۱۹۱۹ء جس کے اخیر میں مفصل فہرست کتب بھی ہے —

(بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

اتابکان عراق و سلاطین خوارزم سے جنگ و جدل میں مصروف رہتے تھے - مغل بھی میدان میں آچکے تھے —

سعدی کے خاندان کے متعلق بہت کم حالات معلوم ہیں۔ اُس کا باپ ایک سربرآوردہ شخص تھا - وہ سعدی کی کم سنی ہی میں انتقال کرگیا - نو عمر سعدی تکمیل تعلیم کے لئے نظامیۂ بغداد میں آیا اور علامہ ابن الجوزی کے تلامذہ میں داخل ہوا - خیال کیا جاتا ہے کہ وہ نامور صوفی سہروردی متوفی سنہ ۶۳۲ھ کے درس میں بھی شریک ہوا

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

تصانیف سعدی کے تراجم و طبعات بکثرت ہیں جن میں سے ہم حسب ذیل درج کرتے ہیں —

(ا) ترجمہاے فرانسیسی :-

ترجمۂ بوستان نوشتہ بارلی اے میناز سنہ ۱۸۸۰ ع - ترجمہاے گلستان نوشتہ سیمیلے (Semelet) سنہ ۱۸۳۷ع و ڈے فرے مری (Ch: Defremery) سنہ ۱۸۵۸ ع
ایک گمنام شخص ساکن علی گڈہ (؟) (M Xd' Aligare) مطبوعہ پیرس سنہ ۱۷۰۴ع
حال ہی میں گلستان کا ایک فرانسیسی ترجمہ اریتم فیار (Artheme Fayard) نے کیا ہے جو مدام دے نوئیل (Mme. la Casse de Noailles) کے دیباچہ کے ساتھہ پیرس سے سنہ ۱۹۱۳ ع میں شائع ہوا ہے —

(ب) ترجمہاے انگریزی :-

ترجمۂ گلستان نوشتہ پلیٹس (J. L. Platts) مطبوعہ لندن ۱۹۰۴ ع (طبع سوم)

(ج) ترجمہاے جرمنی :-

قدیم ترجمہ گلستان نوشتہ سیاح اولیاریوس (Olearius) مطبوعہ سنہ ۱۶۵۴ع و سنہ ۱۶۶۰ ع —
ترجمہاے بوستان نوشتہ گراف (Graf) مطبوعہ جینا - سنہ ۱۸۵۰ ع و شلختا وزہرد (Schlechta Wsschrd) ویانا سنہ ۱۸۵۲ ع و روکرٹ (Ruckert) مطبوعہ لائپزک سنہ ۱۸۸۲ ع و نیز حسب ذیل کتب :-
سعدی کے سیاسی اشعار (Ruckert, Saadis Politische Gedichte) مطبوعہ برلن سنہ ۱۸۹۴ع
یعنی نصایح و اشعار سعدی- (Bacher, Aphorismen and Siugle dechte)
کلیات سعدی کلکتہ میں سنہ ۱۷۹۱ع میں اور طہران میں سنہ ۱۲۵۹ھ و سنہ ۱۳۴۷ھ میں طبع ہوچکی ہے - ترکی زبان میں بوستان سعدی کی ایک عمدہ شرح لکھی گئی ہے جس کا لکھنے والا سوری ہے اور یہ شرح سنہ ۱۸۷۱ع میں قسطنطنیہ میں شایع ہوچکی ہے —

معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی تعلیمات کا سعدی پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ۔ بعد ازاں سعدی نے سیر و سیاحت کی ۔ اس کے قدیم ترین تذکرہ نویس کا ان ہے کہ اُس نے تیس برس سیر و سیاحت میں صرف کئے ۔ سفر کا باعث کچھ صوفیانہ میلان طبع اور کچھ ذاتی شوق ہوا ۔ اس سیر و سیاحت کا کوئی گہرا اثر سعدی کی طبیعت پر نہیں پڑا نہ اُس کے تصانیف میں اُس کے نمایاں آثار نظر آتے ہیں ---

اس جہاں نوردی کے دوران میں سعدی کو بعض حوادث البتہ پیش آئے ۔ دمشق کے بعض فقرا کی ملاقات سے واپس آتے ہوئے وہ نواحی بیت المقدس کے صحرا میں اہل فرنگ کے ہاتھوں میں پڑگیا اور قید کرلیا گیا ۔ یہودی قیدیوں کے ساتھ سے بھی حصار طرابلس پر کام کرنا پڑا ۔ اُس کے ایک دوست نے جو حلب کا رہنے والا تمول حبشی تھا اُسے دس دینار میں خرید کیا اور اُس کی شادی اپنی لڑکی سے کردی ۔ لیکن یہ صورت ایسی بدمزاج ثابت ہوئی کہ غریب سعدی کو اپنی اسیری کا زمانہ بہتر معلوم ہوتا تھا ۔ بالآخر سعدی نے اپنا پیچھا چھڑا کر پھر سیر و سیاحت کا راستہ لیا ۔

وہ ترکستان بھی گیا ۔ کاشغر پہنچا اور چینی ترکستان میں دور تک سیاحت کی ۔ ممکن ہے کہ ہندوستان بھی گیا ہو، لیکن بت سومنات کا قصہ جو سعدی نے بوستاں میں لکھا ہے سچا نہیں معلوم ہوتا ۔ اُس قصے میں سعدی ہندو پجاریوں سے دوستی پیدا کرتا، بتکدہ کے اندر پہونچتا اور بت کی دل چلانے کی حالت میں پجاریوں کو پکڑلیتا ہے ۔ یہ دلچسپ قصہ جو جووتری کرامت کے متعلق (اطالین افسانہ نگار) بوکاکس (Boccace) کی دل خوش کُن حکایات کو یاد دلاتا ہے بہت اغلاط سے پر ہے اور کسی طرح باور نہیں کیا جا سکتا ---

ایشیائے کوچک، بصرہ، حجاز، حبش میں سیاحت کرنے کے بعد سعدی سنہ ۱۲۵۶ ع میں شیراز میں واپس پہونچا ۔ سیاسی حالات میں کچھ سکون پیدا ہوگیا اور اتابک ابوبکر تخت نشین ہوچکا تھا ۔ اس نے مغل بادشاہوں کو خراج دینا قبول کرلیا تھا

اور ان کی حمایت میں امن پاکر عمارات کی تعمیر اور علوم و فنون کی سرپرستی میں مصروف تھا - سعدی بھی اُس کے کرم سے مستفید ہوا اور اُس نے سنہ ۱۲۵۷ ع میں بوستان اور اگلے برس گلستان تصنیف کرکے اتابک مذکور کے نام سے معنون کیں۔ اُس وقت سعدی کی عمر تقریباً ۷۵ برس کی تھی —

لیکن تھوڑے ہی دن بعد فارس کے صوبہ پر نئی مصیبتیں نازل ہونی شروع ہوئیں - ابوبکر کی وفات کے بعد اتابکاں فارس کا چند ناکام مقابلوں کے بعد مغلوں کے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا - مغل پادشاہ اباقا ایلخاں پسر ہولاگو (ہلاکو خاں) نے شیراز میں اپنا عامل مقرر کر دیا - یہ دیکھہ کر افسوس ہوتا ہے کہ سعدی نے بلا کسی پس و پیش کے نئے حاکموں کا خیر مقدم کر لیا - اُس نے ہولاکو کی فتوحات کو سراہا اور مغلوں کی مدح میں ایسے قصاید تصنیف کئے جو اس سے پیشتر شاید ہی اتابکوں کی شان میں لکھے ہوں - وہ مغل خان کی خدمت میں تبریز میں بھی حاضر ہوا - ممکن ہے کہ اس طرز عمل سے سعدی نے اپنے ملک کو کچھہ فایدے پہونچائے ہوں اور اُس کے لئے آزادی حاصل کرلی ہو —

سعدی کے اخیر ایام زندگی ایک دلکش خانقاہ میں گذرے جو شیراز کی رود رکنباد کے کنارے پر واقع تھی - بعض حاسدوں کی فتنہ پردازیوں کے باوجود وہ عزت کے ساتھہ اُس خانقاہ میں بسر اوقات کرتا رہا - لوگ گروہا گروہ اُسے ایک بڑا شاعر اور صوفی سمجھہ کر اُس کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اُس کی برکت حاصل کرتے تھے - رفتہ رفتہ سعدی کے متعلق طرح طرح کی روایات پیدا ہو گیئں - مشہور ہوگیا کہ خضر نبی سعدی سے ملنے کے لئے آئے اور آب حیات کے کچھہ قطرے سعدی کے ہونٹوں پر ڈال گئے - سعدی نے نہایت سن رسیدہ ہو کر ایک سو بیس برس کی عمر میں خریف سنہ ۱۲۹۲ ع میں وفات پائی - اُس کے رہنے کی جگہ اُس کی وفات کے بعد ہی زیارت گاہ بن گئی۔اُس کا مزار شیراز کے باہر تقریباً ایک فرسخ کے فاصلے پر واقع ہے —

باوجود اُس تقدس کے جو سعدی کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے ' سعدی ایک ایک خشک مزاج صوفی نہیں ہے - وہ کبھی انتہا پسندی سے کام نہیں لیتا - اُس کے پندو نصایح بہ نسبت صوفیوں کے حکایات و قصص لکھنے والوں کے خیالات و موعظت سے زیادہ ملتے ہیں ---

اُس کی طبیعت متمدن ہے ' جو زندگی کے لطف اور لذتوں سے واقف ہے - دو مشہور و مقبول عام تصانیف بوستان و گلستان کے علاوہ سعدی نے مجموعہائے نظم معروف بہ " طیبات " و " بدایع " اور دیگر مختلف نظمیں اور رندانہ هزلیات بھی لکھی ہیں اُس کی تمام کتابیں " کلیات سعدی " کے نام سے بار ہا مشرق میں طبع ہو چکی ہیں - یہ بھی قابل توجہ ہے ' اور آج کل خاص طور پر حسب مقامی زبانوں کی طرف توجہ کی جا رہی ہے ' کہ سعدی اُن ملکوں کی زبانوں میں جہاں وہ گیا دلچسپی رکھتا تھا وہ ترکی اور عربی ، هندی ، ۔۔۔ اور ایران کی مقامی زبانوں سے بھی پورے طور پر واقف تھا - علاوہ کی طرح وہ بھی بعض اوقات شیراز کی مقامی زبانوں میں لکھا کرتا تھا ---

سعدی کی جس چیز کو هم پسند کرتے ہیں وہ صرف اُس کے معتدل ' معقول اور همدردانہ نصایح اور شیریں و لطف آمیز حکمت ہی نہیں ہیں ' بلکہ اُس کا دلکش پیرایۂ بیان اور بامزہ تشبیہات و استعارات و کنایات بھی ہیں جو اُس نے اپنے پند و نصایح میں اختیار کئے ہیں اور نیز مناظر قدرت کا ذوق جن کا بیان اُس نے نہایت نزاکت و دل بستگی کے ساتھ کیا ہے ' جس طرح کہ کوئی اپنے زیبا اور عزیز محبوب کا کرے گا - ذیل میں ایک حمد نقل کرتا ہوں ' جو ایک گیت ہے جس میں خدائے تعالی کے فضل و کرم کو مناظر قدرت کے اندر دکھایا ہے - یہ نظم فراخ و باوسعت ہے جس میں ساتھ ہی ایک قسم کی نزاکت و صفائی ہے اور پھر محکم و دل نشیں بھی ہے —

"کمالات ایزدی کو کون شمار کر سکتا ہے - اُس کی بے شمار نعمتوں میں سے کسی

نے ایک نعمت کا بھی پورا شکر ادا کیا ہے ؟ اُس نے سراپردۂ عالم کو کھڑا کیا اور مختلف و دلفریب رنگ اس میں پھیلا دیے ۔ زمین ' سمندر ' جنگل ' سورج ' چاند ' ستارے سب اُس کے هاتھہ کے بنائے ہوئے ہیں ۔ اُس کی بے نہایت فیاضی نے تمام عالم کو گھیر رکھا ہے ' اور آسمان کا گنبد اُس کے فضل کے سامنے گرد ہے ۔ نازک اور آسانی سے ٹوٹ جانے والی لکڑی میں وہ خوشنما پھول لگاتا ' شاخ گلاب میں شکر بھرتا اور قطرۂ آب سے اولوے درخشاں پیدا کرتا ہے ۔ پہاڑوں کو زمین پر بطور میخوں کے قایم کر رکھا ہے ' تا کہ پانی پر زمین ٹھیری رہے ۔ سورج کے عمدہ اثر سے وہ زمین شور کو سبزہ زار بنا تا ہے اور صحرا کو نرگس و گلاب کا باغ ۔ بادلوں کے سینے سے وہ باران بے حساب برسا تا ہے ' جو مردہ پودوں کو از سر نو زندہ کرتی ہے ' اور فصل بہار میں وہ برہنہ شاخوں کو سبز اور چمکتا ہوا لباس پہنا تا ہے ۔ ایسا کونسا انعام ہے ' جس کا انسان نے کبھی پورا پورا شکریہ ادا کیا ہے ۔ وہ اپنے انعامات بے دریغ بخشتا ہے ' لیکن سب سے بڑا ' سب سے زیادہ نہ مٹنے والا انعام یہ ہے کہ اس نے ہمارے دلوں میں خوش بختانہ زندگی کی امید پیدا کردی ہے ''—

بوستاں کے آٹھویں باب میں شکر الہی پر مندرجۂ بالا اقتباس کے مضمون کو مختلف پیرایہ میں ادا کیا ہے:—

'' رات ' دن ' مہ روشن اور مہر گیتی افروز تیری آسایش کے لئے بنے ہیں ۔ آسماں فراش کی طرح تیرے لئے بساط بہار بچھا تا ہے ۔ باد و برف اور باران و میغ ' رعد غراں اور برق درخشندہ سب کار پرداز و فرماں بردار ہیں ' جو تیرے تخم کو خاک میں پالتے ہیں ۔ اگر تو پیاسا ہے تو تکلیف سے مت گھبرا کہ سقاے ابر تیرے لئے اپنے کاندھے پر پانی لائےگا .. .. خاک سے رنگ ' بو اور طعام پیدا کرتا ہے جو آنکھہ دماغ اور حلق کے لئے تماشا گاہ ہیں ۔ مکھی کے

ذریعے سے شہد اور ہوا سے مشک پہنچاتا ہے۔ اور درخت نخل سے خرما اور گٹھلی سے
نخل ہوس پیدا کرتا ہے - تمام عقلمند حیرت سے ہاتھ ملتے ہیں کہ ایسا
نخل کسی نے نہیں بنایا - سورج، چاند اور پروین تیرے لئے ہیں -
اور تیرے مکان کی چھت کی قندیلیں ہیں - تیرے لئے خار سے گل،
نافہ سے مشک، کان سے زر اور چوب خشک سے برگ تر پیدا کیا ہے
اے خدا! میرا دل خون ہوگیا اور آنکھیں زخمی ہو گئیں کہ بیان سے بڑھکر تیرے
انعامات دیکھتا ہوں .... اے سعدی اپنا دفتر بند کر اور ہاتھ کو روک ایسے
راستے میں کہ جس کی انتہا نہیں مت دوڑ" —

سعدی نے کمال لطف کے ساتھ گلستاں کے دیباچے میں اس مشہور کتاب کا
سبب تالیف اس طرح بیان کیا ہے —

"ایک رات گذرے ہوئے دنوں کا خیال اور تلف شدہ عمر کا افسوس کر رہا
تھا، اور سراچۂ دل کے پتھر کو آب دیدہ کے الماس سے پروتا اور چند ابیات
ملائمت حال پڑھتا تھا ...... غور کرنے کے بعد یہ مناسب معلوم ہوا کہ
نشیمن عزلت میں بیٹھ رہوں، اور دامن کو صحبت سے کھینچ لوں اور دفتر
کو پریشان بیانی سے روک لوں اور اس کے بعد پریشاں بیانی سے کام نہ لوں..........
یکا یک ایک دوست جو کجاوہ غم میں میرا انیس رہتا تھا اور حجرہ میں ہم
جلیس، برسم قدیم دروازے میں داخل ہوا - ہر چند اس نے چھیڑ چھاڑ کی لیکن
میں نے بات نہ کی —

سعدی کے دوست نے اسے بات کرنے کی خوبیاں بتلائیں اور کہا " دو چیزیں
تیرہ عقلی کی علامت ہیں ایک تو بات کرنے کے وقت چپ رہنا اور دوسرے
چپ رہنے کے وقت بولنا " - اس کے بعد سعدی کو اپنا ہم خیال بنا کر دونوں دوست
تفریح گلشن باہر کو روانہ ہوئے۔ " موسم بہار تھا موسم سرما کی سختی کے نشان مفقود
تھے، اور گلاب کے ایام دولت پیدا ہو چکے تھے - درختوں پر پیراہن سبز چڑھا ہوا تھا"

جو نیک بختوں کے عید کے کپڑوں سے ملتا تھا - سنہ جلالی کے ۶۱۰ اردی بہشت کا پہلا دن تھا - بلبل شاخوں پر چہک رہے تھے - گل سرخ پر شبنم کے موتی پڑے ہوئے تھے، جس طرح کے شاہدان غضب ناک کے چہرہ پر پسینہ .... سعدی اور اس کے دوست نے ایک پر بہار باغ میں رات گذاری، جہاں درختاں دلکش کا ہجوم تھا، گویا کہ مینا کے ٹکڑے اس کی خاک پر بچھے تھے اور عقد ثریا تاک سے لٹکے ہوئے........علی الصباح جب واپسی کا ارادہ ہواتو سعدی نے دیکھا کہ اس کے دوست نے اپنا دامن گل و ریحان اور سنبل و ضیمران سے بھر رکھا تھا - سعدی نے اس سے کہا کہ " گلہائے بوستاں کو بقا نہیں ہے اور نہ عہد گلستاں کو وفا - کتاب زیادہ دیرپا چیز ہے - میں گلستاں تصنیف کروں گا جس کے اوراق پر باد خزاں کا دست تطاول نہ پہنچ سکے گا اور جس کی بہار کو گردش زمانہ خزاں سے مبدل نہ کر سکے گی " - اس کے دوست نے فوراً دامن گل چھوڑ دیا اور سعدی نے گلستاں لکھنی شروع کر دی —

گلستاں متفرق چیزوں کا مجموعہ ہے - جس میں اخلاقی حکایات و پند ونصایح درج ہیں - حکایات بالعموم نثر میں ہیں اور پندو نصایح نظم میں - حکایات کہانیاں نہیں ہیں، بلکہ اکثر خیالی یا تقریباً تاریخی قصص ہیں - جن سے اخلاقی نتایج نکلتے ہیں اور موعظت درج ہو تی ہے - وہ کلمات طرب انگیز و طیب آمیز سے پر ہیں، جو کبھی متانت لئے ہوے ہیں تو کبھی درد آمیز ہیں اور کبھی ظریفانہ —

یہ کتاب آٹھ بابوں میں تقسیم ہے - پہلے دو بابوں میں بادشاہوں کی سیرت اور درویشوں کے اخلاق و عادات سے بحث کی ہے - اس کے بعد ان خصایل کا بیان ہے، جن کی ضرب الامثال و حکایات میں اکثر تعریف ہوتی ہے یعنی قناعت و خاموشی - بعد ازاں جوانی و پیری کا ایک ایک جدا باب میں ذکر ہے - دو سب سے اخیر بابوں میں تاثیر تربیت اور آداب صحبت کا بیان ہے —

بوستاں کی ترتیب بھی ایسی ہی ہے۔ اس میں دس باب ہیں۔ پہلے باب میں بادشاہوں کی سیرت کا بیان ہے بقیہ ابواب میں احسان، صوفیانہ زندگی، تواضع، رضا، قناعت، تربیت، شکر الہی اور توبہ کا بیان ہے۔ آخیر میں دو مناجاتوں اور تین حکایتوں پر کتاب کا خاتمہ ہے۔ بوستاں کے ابواب سے خیال ہوتا ہے کہ وہ گلستاں کے مقابلہ میں زیادہ صوفیانہ خیالات سے پر ہوگی لیکن درحقیقت دونوں [illegible]

سعدی کے اخلاق کی معتدل و عملی نوعیت واضح کرنے کے لئے ہم وہ مقام نقل کرتے ہیں جس میں سعدی نے توانگری کی درویشی کے مقابلے میں حمایت کی ہے۔ تمام صوفی فقر کی مدح و ستائش کرتے ہیں اور سعدی بھی اس کی خوبیوں سے واقف ہیں لیکن وہ نہیں چاہتا کہ فقر کو توانگری پر فوقیت دے یا توانگری [illegible] کہ زمستان میں بفراغت [illegible] مصروف رہتا ہے لیکن وہ شخص جس کی روزی کا کوئی ٹھکانہ نہیں پراگندہ دل رہتا ہے۔ عربی کی ایک ضرب المثل ہے "میں [illegible] اور ایسے ہمسایہ سے جو محبت نہیں کرتا پناہ مانگتا ہوں"

[illegible] الفاظ سادہ [illegible] لیکن صحیح جذبات انسانی سے مملو اور خوشگوار ہیں۔ ایک [illegible] سعدی ایک ایسے شخص کا قصہ بیان کرتا ہے جو فقیروں سے [illegible] ایک راہگیر جو اسے پہلے برہنہ و نادار دیکھ چکا تھا [illegible] کے ہاتھوں میں گرفتار اور ایک بھیڑ میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ اس کا کیا سبب ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ شراب پی اور مستی کی حالت میں [illegible] ہے۔ اسی حالت میں اس کی خوب زدو کوب کی جارہی ہے۔

"اگر کمزور کو طاقت حاصل ہوجائے تو وہ اندھا ہو جاتا اور ضعیفوں کے ہاتھ توڑ ڈالتا ہے۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ یہی بہتر ہے کہ چیونٹی کے پر نہ ہوں۔ اگر بلی

کے پر ہوتے تو وہ دنیا سے چڑیوں کا بیج ناپید کر دیتی " —

الغرض سعدی کے اخلاقی مواعظ قناعت پسند ہیں - وہ ہر شخص کو اس کی حالت کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے - وہ قناعت کے فواید کی تلقین کرتا اور شکایات و ناشکیبائی سے روکتا ہے —

کے اخلاقی فواید کو نظر انداز کر دے - ایک درویش اسی غلط فہمی میں مبتلا تھا - وہ دفتر شکایت کھولے ہوئے توانگری کی مذمت میں مصروف تھا اور کہہ رہا تھا " درویش کا دست قدرت بندھا ہوا ہے اور توانگروں کا پاے ارادات ٹوٹا ہوا - فیاض لوگوں کے ہاتھ میں درم نہیں اور خداوندان نعمت کے پاس کرم نہیں " - یہ الفاظ مجھے گراں گذرے ' اس لئے کہ میں بزرگوں کی نعمت سے پلا ہوں - میں نے کہا " اے یار - توانگر دخل مسکینان و ذخیرہ گوشہ نشینان و مقصید زایران و ملجاو ماواے مسافران ہیں - توانگروں کے لئے وقف نذر و مہمانی ' زکواۃ و فطرہ ' اعتاق ہدی و قربانی ہیں-تواُن کی دولت کو کیسے پہنچ سکتا ہے-تیرے پاس صرف یہ دو رکعت ہیں-اور وہ بھی بصد پریشانی " غریب ہمیشہ پریشان رہتے ہیں - فراغت فاقہ کے ساتھ پیوند نہیں کھاتی اور جمعیت تنگدستی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی - وہ شخص جسے کل کے کھانے کا سامان نہ دکھائی دے شب کو پراگندہ

قدیم اردو

گجری، گجراتی زبان

میاں شیخ خوب محمد چشتی

از

ایڈیٹر

اس سے قبل میں شاہ علی محمد جیو گام دھنی کے حال اور کلام کے متعلق لکھ چکا ہوں۔ اسی زبان کے ایک دوسرے مصنف شیخ خوب محمد چشتی بھی گزرے ہیں۔ یہ بھی احمدآباد گجرات کے رہنے والے تھے اور ان کا کلام وہیں کی مقامی زبان میں ہے جو گجری کہلاتی تھی۔ صاحب مفتاح التواریخ لکھتے ہیں کہ وہ "درویش کامل و صاحب اسرار و صاحب سخن بودند و در تصوف دستے رسا داشتند"۔ اور اس پر ان کا کلام شاہد ہے۔ ان کی مشہور تصنیف "خوب ترنگ" ہے۔ اسی کی شرح انہوں نے فارسی زبان میں لکھی ہے جس کا نام "امواج خوبی" ہے—

میاں صاحب شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید تھے چنانچہ فرماتے ہیں -

وارث محمدی ہر ٹھانوں   شیخ کمال محمد ناؤں
تھا مرشد مقام اقدس   اللہم اغفر و ارحم

پھر اگلے شعر میں اُن کی تاریخ بیان کی ہے —

کہہ تاریخ تنہوں کی خوب   جن عدد ذاکر محبوب

"ذاکر محبوب" سے ۹۷۹ ھ نکلتے ہیں —

یہ کتاب (خوب ترنگ) انھیں کے فیض تربیت کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:-

ان دوں تھا یہ علم کمال   خذ العلم افواہ رجال

انتھیں میں سنیا دی رات | اس میں یاد رھی کچھ بات
وہ جیوں سنم کوں آئی ترنگ | جمع کئے لی تس تس ڈھنگ

کتاب کی زبان کے متعلق تحریر فرماتے ھیں :-

جیوں مری بولی منہ بات | عرب عجم مل ایک سنگھات

اس کی شرح "امواج خوبی" میں یوں کی ھے "ھر یک شعرے بزبان خود تصنیف کردہ اند و می کنند من بزبان گجرات (گجراتی) کہ بالفاظ عربی و عجمی آمیزاست گفتہ ام" ۔ یعنی وہ اپنی زبان کو عربی عجمی آمیز گجراتی بتاتے ھیں ۔ در حقیقت یہ اُردو کی ایک صورت ھے جو گجرات میں رائج تھی اور گجری کہلاتی تھی اور اسی کی بہن دکنی تھی جو اس کے پڑوس دکن میں بولی جاتی تھی بلکہ یہ کہنا درست ھو کہ دونوں ایک ھی زبانیں ھیں صرف مقامی رنگ کی کہیں کہیں جھلک نظر آجاتی ھے ۔ ایک دوسری جگہ فرماتے ھیں :-

جیوں دل عرب عجم کی بات | سن بولے بولی گجرات

یہاں بھی اپنی زبان کو گجراتی ھی کہا ھے۔ شرح میں اس کا ترجمہ ھندی کیا ھے۔ اس سے بھی ظاھر ھے کہ ان کی زبان گجری اُردو تھی —

یہ کتاب سنہ ۹۸۶ھ میں تصنیف ھوی جیسا کہ خود کہتے ھیں :-

نسخہ کی تاریخ اس تھانہ | پاے عدد ھر مصرع مانہ
خوب محمد گنے بچار | چودہ گھاٹ اوس برس ھزار

یعنے ھزار میں سے چودہ کم یعنی ۹۸۶ ۔ جیسا کہ پہلے شعر میں اشارہ کیا ھے دوسرے شعر کے ھر مصرعہ سے بحساب ابجد یہی سنہ نکلتا ھے —

سنہ کے ساتھہ تاریخ اور دن بھی بتادیا ھے —

دوجا چاند سو تھا شعبان | دیس دوشنبہ کیا بیان

اور اس کتاب کی شرح "امواج خوبی" کی تکمیل کی تاریخ پورے ایک ھزار

سنہ ہجری ہے۔ یہ ہیں وہ زمانہ تھا جب شاہان گجرات پر زوال آچکا تھا، امرا خود سر تھے اور سارے ملک میں طوائف الملوکی کی شان نظر آتی تھی۔ اکبر نے اسی زمانے میں گجرات کو فتح کرکے ممالک محروسہ میں شامل کرلیا تھا —

اس زمانے میں علمائے سوء اور صوفیائے خام کا بھی بڑا زور تھا۔ اور طرح طرح کی بدعتیں اور بے اعتدالیاں مروج ہوگئی تھیں، لیکن اسی گروہ میں ایسے لوگ بھی حق کی ہدایت اور اصلاح میں بے خوف کام کر رہے تھے —

خوب ترنگ خالص تصوف کی کتاب ہے اس میں شروع سے لےکر آخر تک مسائل تصوف سے بحث کی گئی ہے۔ مسائل اس قسم کے ہیں :-

مرتبۂ لاتعین، حضرت وحدت، حضرت الوہیت، مراتب وجود، مقدمۂ فاعل مختار، مرتبۂ محمدیت، مرتبۂ روح، دائرۂ عشق، مرتبۂ عبودیت، مرتبۂ قلب، مرتبۂ سلوک، شرط ذکر، مراقبہ در شغل علم، مراقبہ در شغل سمع، مرتبۂ صورت، مقامات سعوم، مرتبۂ نبوت، مرتبۂ رسالت وغیرہ —

لیکن یہ سب علمی بحثیں ہیں۔ شاہ علی محمد جیو کی کتاب جواہر اسرار اللہ اس سے مختلف ہے۔ اس میں عشق و محبت کا رنگ ہے اور قلبی واردات کا ذکر ہے۔ خوب ترنگ ایک خشک کتاب ہے جس میں تصوف کی اصطلاحات میں تصوف کے مقامات کا بیان ہے وہ حال ہے اور یہ قال ہے۔ علاوہ اس کے شاہ علی محمد جیو کے کلام میں جو گرمی اور حلاوت ہے وہ اس میں نہیں۔ شاہ علی جیو شاعرانہ طبیعت رکھتے ہیں اور اس میں عشق و محبت کی آگ ہے۔ میاں خوب محمد عالم اور سالک ہیں، تصوف کے نکات کے ماہر اور بہت اچھے ناظم ہیں۔ بڑے بڑے مسائل چند لفظوں میں نہایت اختصار سے بیان کردیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہیں خود ہی شرح لکھنی پڑی۔ ذیل کے نمونے سے ان کی طبیعت کا رنگ معلوم ہو جائے گا —

ابتدا (در حمد)

بسم اللہ کہوں چھت • ذات　　جس رحمن رحیم صفات
ذات صفات اسما افعال　　جمع مفصل جلد اک حال
فاذٍ محمد تس کوں دیت　　اوس تفصیل سو عالم کیت
اوسی روح ارواح تمام　　اوسی جوس کے سب اجسام
سارے نسخے منہ یہ بات　　سنیں کہوں کا بکت سنگھات
بکت‡ سواس تہیں سمجھی جاے　　چھ حضرات سو خمس کلہاے $

جوں کھلہلیا سمند چھپاے　　جانے سب دریا لے جاے
(جس طرح ماهی گیر پرندہ اس زور سے سمندر میں ڈبکی مارتا هے کہ گویا سارے سمندر کو لے اڑے گا) -
نوک ننھیں دریا بن پار　　بھری تو نوکچ کی مقدار
(اس کی نوک تو اتنی ننھی سی اور دریا بے پایاں' تو سواے اس کے کہ نوک کی مقدار بھر پانی لے اور کیا کر سکتا هے) -
جیوں ظاهر بھنتیاں کہلائیں　　پن اینٹاں اس بھانت دکھائیں
(ظاهر میں دیوار کہلاتی هیں لیکن اصل میں اینٹیں هیں جو دیوار نظر آتی هیں) -
ذرے مل اک تولا تھا نہ　　فانوں دھر یا هے اینٹ سوتا نہ
(اور یہ ذروں کا ایک انبار هے جس کا نام اینٹ رکھہ لیا گیا هے) -
جو هر عرض سو ذرا جان　　تلتل پھرے عرض من آن
(ذرہ عبارت هے عرض و جو هر سے اور عرض کو ایک لمحہ قرار نہیں) -
جس کو وهم کرے نہیں دوے　　تاوا جنماں جسے نہ هوے

• هستی　† جلد' جسم　‡ تفصیل　$ کہاے —

(اور جوہر جزء لایتجزیٰ ہے کہ جس کی تقسیم ہو ہی نہیں سکتی اور نہ جس کا کوئی بایاں دایاں ہے)۔

پانیں پرب بھرے جیوں ہوے   پانیں اس منہ پئے جو کوے

(جیسے سبیل میں پانی بھرا رکھا ہوتا ہے اور رہ چلتے اس سے مستفید ہوتے ہیں)۔

اس کا ہوے ثواب تس   جن پانوں بھریا اس مس

(اس کا ثواب اسے ہو گا جس نے پانی بھر کر رکھا ہے)۔

عالم حق کے پرب سو جیوں   علم بھریا جیوں پانیں تیوں

(اہل علم بھی حق کی سبیل ہیں اور علم پانی کی طرح ان میں بھرا ہے)۔

اوس سیکھیں جے ہوے ثواب   سو ثواب سو ذات کے باب

(اور اس کے سیکھنے میں ثواب اس کو ملے گا جس نے علم بھرا)

جسے ثواب ایسا ثواب   سمجھ لذت سمجھ عتاب

(پس جس کسی کو ثواب ہے اسے محنت و عذاب نہیں ہے اور لذت اسی کو ہے جس میں سمجھ ہے)۔

بھری طشت میں ماٹی جب   دوجی ماٹی ماے نہ تب

(جس وقت طشت کو مٹی سے بھر دیتے ہیں تو پھر اس میں دوسری مٹی نہیں سما سکتی)۔

پانیں جب ریڑو اس مانہ   پچھیں سماوے پانیں تا نہ

(لیکن جب اس میں پانی ڈالتے ہیں تو پانی اس میں سما جاتا ہے)۔

جس باٹیں پانی سوس جاے   پانی میں باؤ سماے

(جس طرح پانی مٹی میں مل گیا اُسی طرح ہوا پانی میں سما جاتی ہے)۔

پچھیں سماوے آگ بسیکھہ   پا نی آگ تتا کر دیکھہ

(اگر طشت کو آگ سے گرم کریں تو آگ سماجاتی ہے) —

جی کو ہوے بہت لطیف   ماے لطیف سو مانجہ کثیف

(جو چیز کہ لطیف ہے اس کی گنجائش کثیف میں نکل آتی ہے) ۔

خدا لطیف سو جس کہ ٹھانوں   ا ہے محیط سو وے ہر ٹھانوں

(خدا لطیف ہے اور وہ ہر شے میں ہے) —

کلام کے اس مختصر نمو نے سے ان کی شاعری اور زبان کی حالت معلوم ہو تی ہے —

میں اس سے قبل لکھہ چکا ہوں کہ گجری اردو میں گجرا تی کے لفظ ملے ہیں چنانچہ اس زبان کے الفاظ شیخ علی جیو اور میاں خوب ترنگ کے کلام میں جا بجا پاے جا تے ہیں۔ مثال کے طور پر چند لفظ یہاں لکھے جاتے ہیں —

لفظ	معنے	لفظ	معنے
ہوں	میں	ہب یا ہببیں	اب
ڈوسی	بڑھیا	جھلا	دایاں
بکت	تفصیل	چھولا (چھیلی)	آخری
اولقا	گہرا	ٹونکا	مختصر ، تھوڑا
ماں	میں	پپوٹے	حباب
چھولی	چھوٹی موج		

دکنی میں " ہی " کے لئے " چ " کاحرف آ تا ہے اور گجری میں اسی معنے میں " چ " استعمال ہو تا ہے ۔ مثلاً دکنی میں " اس ہی " کو " اسیچ " کہیں گے اور گجری میں " اسیج " ۔ اسی طرح ایکچ اور ایکج وغیرہ —

تحفۃ الکرام میں میاں خوب محمد کا سنہ وفات سنہ ۱۱۰۲ ھ لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ابن اللہ خوب ترنگ کا سنہ تصنیف سنہ ۹۸۶ ھ اور شرح کی تکمیل کا سنہ ۱۰۰۰ ھ ہے۔ یہ قرین قیاس نہیں کہ ان کی عمر اس قدر ہو۔ علاوہ اس کے ان کی تاریخ وفات " خوب بود " سے نکلتی ہے جس کے عدد بحساب ابجد ۱۰۲۳ ہوتے ہیں اور یہی ان کا سنہ وفات ہے

میاں صاحب کا انتقال گجرات ہی میں ہوا اور ان کی قبر چوک احمد آباد متصل مسجد خوب محمد دروازہ دارو میں ہے —

مقدمۂ السنۂ عالم

(مرقومۂ اے - میلے و مارسل کوہن)

[یہ ایک عالمانہ اور محققانہ کتاب کا مقدمہ ہے جو یورپ کے نامور محققین السنہ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے - مقدمے کا ترجمہ فرانسیسی سے ہماری درخواست پر پروفیسر ای ای اسمتھ (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) نے انگریزی میں کرکے عنایت فرمایا ہے - انگریزی کا ترجمہ اُردو میں ہمارے دوست مولوی سید وہاج الدین صاحب پروفیسر اورنگ آباد کالج نے کیا ہے - ہم دونوں صاحبوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں — ایڈیٹر]

زبانوں کی سب سے زیادہ مشہور تقسیم جو انفرادی *' اتصالی † اور تصریفی ‡ زبانوں میں کی گئی ہے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی ' اور اس سے کوئی علمی یا عملی فایدہ نہیں حاصل ہوتا - اگر زبانوں کی کوئی تقسیم کار آمد اور مفید

---

* انفرادی زبانیں ' مثلاً چینی ' وہ زبانیں ہوتی ہیں جن میں حروف نہیں ہوتے اور ہر شکل مختلف مستقل لفظ ہوتی ہے اور ہر لفظ مفرد آواز ہوتا - ان الفاظ میں تبدیلی نہیں ہوتی - الفاظ کے معنی محض ان کی ترتیب اور نشست سے نکلتے ہیں -

† اتصالی زبانیں جیسے ترکی ' ان زبانوں میں بقول وہٹنی Whitney کے اجزاے الفاظ کا اتصال ادنیٰ درجہ کا ہوتا ہے ' اور ان کے سابقے اور لاحقے ایک دوسرے سے ' اور خود اصل لفظ سے بے نیاز ہوتے ہیں —

‡ تصریفی زبانیں جیسے لاطینی ' عربی ' سنسکرت وغیرہ ' ان میں محض لاحقوں اور خاتمے کے رد و بدل سے زمانہ ' تذکیر و تانیث ' واحد و جمع کے اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں —

ہوسکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ انھیں خاندان اور شجرے کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے،
اور ان میں باہمی تعلق کو مد نظر رکھا جائے۔ یہی تقسیم موجودہ کتاب کی اساس ہے —

اس تقسیم کا اصول ہر شخص کا جانا بوجھا ہے۔ جب کوئی زبان کسی وسیع
حلقے میں بولی جاتی ہے، اور اس کے بولنے والے افراد میں وہ باقاعدہ اور مسلسل
تعلقات باقی نہیں رہتے جن کی وجہ سے اس زبان کی وحدت قائم تھی۔ تو ایسی
صورت میں اس وسیع حلقے کے مختلف حصوں میں جو لسانی تغیرات پیدا ہوجاتے
ہیں وہ ایک سے نہیں ہوتے اور ایک خاص زمانے کے گزرنے کے بعد، جس کی مدت
حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، ان مختلف مقامی بولیوں میں جو اب سابقہ
عام زبان کی یادگاریں ہیں، کچھ ایسے اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں کہ مختلف اضلاع
کے باشندوں کے لئے ایک دوسرے کی گفتگو سمجھنا محال ہوجاتا ہے۔ پس جس
حد تک کہ مختلف صوبوں کے باشندے ایک دوسرے کی گفتگو سمجھنے سے قاصر
رہیں اسی حد تک یہ کہنا بجا ہے کہ سابقہ عام زبان کی جگہ اب نئی نئی زبانوں
نے لے لی ہے —

مثال کے طور پر لاطینی زبان کو لیجئے۔ یہ ایک زمانے میں سلطنت روما کے
مغربی حصوں کی عام زبان تھی، لیکن جب قدیم تہذیب کے پاؤں اکھڑے تو اس
زبان کا نشو و نما اطالیہ کے مختلف حصوں، جزیرہ نمائے اندلس، اور گال (قدیم
فرانس) میں مختلف نہج پر ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان مختلف حصوں کے باشندے
اگرچہ کسی وقت یہ قطعی دعویٰ نہ کرسکتے تھے کہ ہم اب لاطینی نہیں بولتے،
لیکن پھر بھی نویں صدی عیسوی کے آغاز تک ان باشندوں کی زبانیں ایک دوسرے
سے الگ، اور لاطینی سے بالکل مختلف ہوگئی تھیں؛ چنانچہ اطالوی، ہسپانوی،
فرانسیسی رومی (Gallo Romanic)، رھٹیہ رومانی * (Rheto Romanic) او

* Romansch یا Rehto-Romanic وہ زبان جو بھیرہ اڈریاٹک میں Grisons سے Friuli تک بولی جاتی ہے —

(و)

رومانوی (Rumanian) زبانیں سب کی سب لاطینی هی سے نکلی هیں ' لیکن ایسی لاطینی سے جس کا ارتقا مختلف مقامات میں مختلف طریقوں پر هوا هے —

لاطینی زبان میں جو کچھہ مختلف تدریجی تغیرات رونما ہوے' وہ خاص خاص تاریخی دوروں میں هوے - بعض تغیرات تو ایسے زمانوں میں هوے جن کے متعلق همارے پاس ایک بھی تاریخی شہادت نہیں هے ' لیکن اکثر صورتوں میں خود الفاظ اپنے اصل کا پتہ دے دیا کرتے هیں - چنانچہ سنسکرت ' ژند ' قدیم یونانی ' لاطینی ' قدیم آئرش (Irish) ' گاتھک ' قدیم سلافی Slavonic ' قدیم ارمنی وغیرہ میں جو گہری مشابہت پائی جاتی هے' وہ اس صورت میں هرگز نہ هوتی اگر یہ مختلف زبانیں ایک هی زبان یعنی هندی یوروپی (Indo European) کے مختلف تغیرات کا نتیجہ نہ هوتیں —

مذکورۂ بالا بحث سے همارا ذهن دو اصطلاحات (۱) خاندان السنہ (۲) اور السنۂ متعلقہ کی تعریف کی طرف منتقل هوتا هے -

' خاندان السنہ ' سے ایسی زبانوں کا مجموعہ مراد هوتا هے جن میں اگرچہ کم و بیش رد و بدل ضرور هوگیا هے' لیکن سب کی سب ایک هی عام زبان کا سلسلہ هیں -

' السنۂ متعلقہ ' وہ زبانیں هوتی هیں جو ایک هی خاندان السنہ کی رکن هوں - واضح هو کہ اس تعریف کی حیثیت محض تاریخی هے ' اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ان سب زبانوں میں کوئی عام یا تفصیلی مشابہت ضرور پائی جاے گی - کچھہ نہ کچھہ عام مشابہت اس سے ضرور معلوم هوتی هے ' اور اکثر یہ مشابہت بہت کچھہ زیادہ بھی هوتی هے ' لیکن محض اس تعریف کی بنا پر کوئی شخص یہ پیشین گوئی نہیں کرسکتا کہ السنۂ متعلقہ کی مشابہت کی ٹھیک ٹھیک کمیت اور کیفیت کیا هے —

جن زبانوں کو " السنۂ متعلقہ " کہا جاتا هے ان کی مغائرت بعض اوقات اس

درجہ تک پہنچ جاتی ہے کہ ان کی کسی خصوصیت سے بھی باہمی تعلق کا پتہ نہیں چلتا مثلاً پولش اور انگریزی زبانوں کی عام ساخت اور تفصیلی خصوصیات میں بہت کم مشابہت پائی جاتی ہے ' حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی مجموعی یعنی ہندی یوروپی سے تعلق رکھتی ہیں ۔ اس امر کا بالواسطہ ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں زبانیں نتیجہ ہیں ان مسلسل تبدیلیوں کا جو ہندی یوروپی زبان میں ہوئیں اور جو ایک طرف پولش اور دوسری جانب انگریزی کی صورت میں ظاہر ہو گئیں —

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی ایک خاندان السنہ میں دوسرے نئے خاندان بھی پائے جاتے ہیں ایک زبان جو کسی سابقہ زبان کی ترقی یافتہ شکل ہے ' خود اپنی نوبت میں درجہ بدرجہ ہو کر مختلف زبانوں کو پیدا کر دیتی ہے ۔ مثلاً ہندی یوروپی خاندان کی تقسیم ہندی ' ایرانی ' یونانی ' لاطینی ' جرمنی وغیرہ میں ہوتی ہے ۔ لاطینی اطالوی ' فرانسیسی ' ہسپانوی ' پرتگالی ' پراونسی * Provençal فرانسیسی اور دوسری زبانیں پیدا کرتی ہے ۔ جرمانی زبان کا ایک اس طرح اسکینڈے نوی (Scandinavian) المانی ' انگریزی وغیرہ میں تقسیم ہو جاتی ہے —

مختصر یہ ہے کہ یہ ثابت کرنا کہ دو زبانیں آپس میں کوئی تعلق نہیں رکھتیں ' ناممکن ہے ۔ مثلاً یہ تو البتہ کہا جا سکتا ہے کہ فلیمش Flemish† میں رومانی ‡ خاندان السنہ کی کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی ۔ لیکن

---

* یعنی Provence کی زبان جو فرانس کا ایک حصہ ہے — (و)

† Flanders کی زبان — (و)

‡ Romance Languages رومانی زبان ! اس سے مراد بالعموم فرانسیسی یا وہ دوسری زبانیں لی جاتی ہیں جو جنوبی یورپ میں بولی جاتی ہیں اور جو کہ زبان لاطینی سے نکلی ہیں مثلاً پراونسال ' اطالوی ' ہسپانوی ' پرتگالی ' رومانوی (Rumanian) وغیرہ سب کی سب Romance Languages کہلاتی ہیں — (و)

فلے مش جرمانی زبان ہے ' اور اس اعتبار سے ہندی یوروپی زبانوں میں سے ہے '
لہذا ان دوسری رومی زبانوں کی طرح جو لاطینی سے نکلی ہیں فلے مش بھی ہندی یوروپی ہے - اتنا ضرور صحیح ہے کہ اس کا رشتہ اتنا نزدیک کا نہیں ہے جتنا کہ رومی زبانوں کا ' بلکہ بہت دور کا رشتہ ہے ' یعنی ہندی یوروپی تعلق سے - یہی حال فنی یوگری ● (Finno - Ugric) زبان کا ہے ' جو اگرچہ ہندی یوروپی خاندان سے بہت مختلف ہے ' لیکن پھر بھی اس اختلاف سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں مجموعے بہت قدیم زمانے کی ایک ہی اصل زبان سے نہیں نکلے ہیں —

خاندانی وار تقسیم السنہ سے صرف اتنی سی تاریخی بات ثابت ہوسکتی ہے کہ کسی زمانۂ قدیم میں زبانوں کی ایک برادری قائم تھی - پس ہمیں ہمیشہ اس بات کو یاد رکھنا چاہئیے کہ اگر زمانۂ ماضی کے متعلق زیادہ گہری تحقیق سے کام لیا جائے تو یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ کوئی سی دو زبانیں یا زبانوں کے مجموعے جن میں ہم آج اپنی موجودہ تحقیق سے کوئی تعلق دریافت نہیں کرسکے ہیں ' ضرور زبانوں کی کسی نہ کسی ایک ہی برادری کے ارکان رہ چکے ہیں - لیکن سب سے بڑی دقت تو ثابت کرنے کی ہے —

السنۂ متعلقہ کی نسبت یہ قیاس قائم کیا جاسکتا ہے کہ اگر دوسرے حالات اور واقعات وہی رہیں ' تو جتنی زیادہ مدت تک متعلقہ زبانیں ایک دوسرے سے بچھڑی ہوئی رہیں گی ' اتنے ہی زیادہ ان میں اختلافات پیدا ہوتے جائیں گے - اسی طرح سے جتنا زیادہ فاصلہ دو زبانوں اور ان کی مشترک اصل زبان کے عہدوں میں ہوگا ' اتنا ہی زیادہ ان کا تعلق ثابت کرنا مشکل ہوگا —

رومی زبانوں کا آپس کا تعلق ثابت کرنا آسان ہے ' اور یہ اس لئے کہ اس زمانے میں جب کہ لاطینی کئی زبانوں میں منقسم ہونا شروع ہوئی ' اور اس زمانے میں جب کہ مختلف رومی زبانوں کی قدیم ترین کتابیں تصنیف ہونے لگیں '

● Fino-Ugric وہ زبان ہے جو یورال اور الطائی پہاڑوں کے درمیان بولی جاتی ہے - (و)

چند هی صدیوں کا فرق هے ۔ اسی طرح سے هندی یوروپی زبانوں کے باهمی رشتے کے ثبوت میں همارے پاس جو کچھه کافی معلومات هے وہ صرف اس وجه سے هے که اس خاندان کی اکثر زبانوں کے متعلق همارے پاس زمانۂ مسیح سے کئی صدی پہلے کا اور تقریباً سب زبانوں کے متعلق دسویں صدی عیسوی تک کا مواد موجود هے ۔ اگر همیں صرف هندی یوروپی زبانوں کا نظریه قائم کرنا هوتا تو ان زبانوں کی موجودہ ساخت هی سے ان کا باهمی تعلق ثابت هو سکتا تھا ۔ لیکن اس صورت میں هم اس درجه کامل نتائج صرف و نحو کی بنا پر نکالتے جو آج ان کی قدیم یادگاروں کی بنا پر تیار هو سکے هیں

لیکن ان هندی یوروپی زبانوں کے برخلاف دنیا کی زیادہ تر زبانیں ایسی هیں جن کے متعلق همارے پاس مواد یا تو بہت کم قدیم زمانے کا هے اور یا پھر تمام تر زمانۂ جدید کا هے ۔ اس مواد کی بنا پر صرف چند هی صدی قبل کی ان زبانوں کی برادری کا تعین هو سکتا هے ۔ لیکن جن زبانوں کی اصلی برادریوں کی تحقیق مطلوب هو جو هندی یوروپی یا سامی برادریوں سے بہت پہلے کی هیں وهاں ان کے قدیم ترین زمانے یعنی مسیح سے کئی صدی پہلے کے اور حقیقی زمانے کے درمیان کچھه ایسے انقلابات اور تغیرات حائل هیں که تحقیق کی حیثیت محض خیالی اور قیاسی رہ جاتی هے ۔

علاوہ بریں اسی زیر بحث زمانے میں عام خصائص کی جتنی کمی هوگی اتنی هی اس کی خاندانی وارثی تقسیم خواہ زبانوں کے تاریخی مطالعه کے لئے هو یا ان کے سمجھنے کی سہولت کے لئے کم مفید هوگی ۔ اگر کوئی شخص صرف انگریزی فرانسیسی ، پولش اور ارمنی زبانوں کی اصلی ساخت کی بنا پر اور ان کا مقابله اور موازنه کر کے ان کی تاریخ مرتب کرنا چاهے تو اسے زیادہ کامیابی نه هوگی ، اور ان کے متعلق محض یه جان لینا که یه سب کی سب ایک هی زبان کی مختلف شکلیں هیں جو آج سے چار پانچ هزار برس پہلے رائج تھی ، نه

تو ان کے بولنے میں کچھ زیادہ مدد دے گا ' اور نہ ان کے ارتقا کی تحقیق میں مذکورۂ بالا واقفیت چاہے مورخ کے لئے دلچسپ ہو ' لیکن ماہر لسانیات کے لئے اس کا براہ راست فائدہ کچھ بھی نہیں ہے ۔ اور بفرض محال اگر یہ بھی مسلم مان لیا جائے کہ بعض زبانوں کا کسی ایک عام زبان کے صدیوں کے تغیرات کا نتیجہ ثابت ہونا تاریخ داں کے لئے ضروری مواد کا حکم رکھتا ہے تو بھی اس کی اہمیت کو بڑھا چڑھا کر ظاہر کرنا غیر ضروری ہے —

ہر زبان کی تحقیق میں ' اس ذخیرۂ مواد کے علاوہ جو صدیوں سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے ان عوامل اور موثرات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے ' جو اکثر صورتوں میں غیر معلوم ہیں ' اور جنہوں نے اس کے تغیرات میں حصہ لیا ہے ۔ فرانسیسی لاطینی کی بدلی ہوئی شکل ضرور ہے ' لیکن یہ تبدیلی انتہائی درجہ کی ہے ' اور عام ساخت نیز جزئیات دونوں حیثیتوں سے فرانسیسی اور لاطینی میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ پس ظاہر ہے کہ جن عوامل نے اس تبدیلی میں حصہ لیا وہ فرانسیسی زبان کی اصلی ساخت میں کچھ ایسے رچ بچ گئے ہیں کہ ناپ جوک تو در کنار ' ان کا صحیح تخمینہ تک نہیں کیا جاسکتا حالانکہ اگر دیکھا جائے تو فرانسیسی زبان کی تشکیل میں ان عوامل کی اہمیت قدیم لاطینی عنصر کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہے ۔ ماہرین لسانیات زبانوں کی تحقیق میں ہمیشہ ابتدائی صورت حالات پر زیادہ زور دیا کرتے ہیں (مثلاً فرانسیسی کی تحقیق میں لاطینی عنصر پر زور دینا) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خواہ براہ راست شہادت کی بنا پر ہو (جیسے لاطینی میں) یا موازنے اور مقابلے سے غرض کہ کسی نہ کسی طرح ابتدائی صورت حالات سے وہ تھوڑے بہت واقف ضرور ہوتے ہیں ' لیکن ان موثرات کا ذکر جن کی وجہ سے تشکیل یا تبدیلی ہوئی ہے ماہرین لسانیات بہت کم کرتے ہیں ' اور یہ اس لئے کہ ان کے متعلق ان کی معلومات قطعی نہیں ہوتی ' لیکن ظاہر ہے کہ محض نقص واقفیت کی وجہ سے کسی شخص کو اپنے نفس کو دھوکا نہ دینا چاہئے۔

اگر مذکورۂ بالا بیان سے بھی قطع نظر کرلی جائے تو بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر زبان کا ایک حصہ اور اکثر صورتوں میں بہت بڑا حصہ ایسا ہوتا ہے جس کا خاندانی وارثی تقسیم السنہ میں بالکل لحاظ نہیں کیا جاتا - یعنی مستعار الفاظ کا حصہ - اگر کوئی شخص یہ کوشش کرے کہ فرانسیسی زبان کے سارے سرمایۂ لفظی کی تحقیق قدیم ..... زمانے کی تقریری لاطینی کے ارتقاء سے کی جائے تو اسے فرانسیسی الفاظ کا بہت بڑا فاضل حصہ ایسا نظر آئے گا جس کے متعلق وہ کسی قسم کی تحقیق نہ کرسکے گا - بات یہ ہے کہ فرانسیسی الفاظ کا بہت بڑا حصہ مختلف زبانوں مثلاً المانی، عربی، اطالوی، ہسپانوی، انگریزی وغیرہ سے مستعار لیا گیا ہے - سبب کبھی اندرونی لسانی تغیرات کی وجہ سے یا نئے خیالات کے اظہار کے لئے فرانسیسی زبان کو نئے الفاظ کی ضرورت داعی ہوئی تو اس نے انہیں باقاعدہ طور پر تحریری لاطینی سے مستعار لے کر ان کے اشکال اور معانی کو اپنا لیا - چنانچہ زمانہ قدیم اور ازمنۂ وسطیٰ کی تحریری لاطینی کا دخل جدید فرانسیسی الفاظ کی ساخت میں اتنا یا اس سے زیادہ ہو گیا جتنا کہ روی ماہرین لسانیات کی مدونہ تقریری لاطینی کا اور ابھی حال میں تو یونانی ذخیرۂ لفظی سے بھی بہت کچھ مستعار لیا گیا ہے —

لفظی سرمایہ کے علاوہ جملوں کی ساخت پر بھی غیر ملکی اثرات خاص کر تحریری لاطینی کے پڑے ہیں

لفظوں کا مستعار لینا سب سے زیادہ اس صورت میں نمایاں ہوتا ہے جہاں کسی بالکل ہی مختلف زبان سے لفظ لئے جائیں - مثلاً فارسی ایک ہندی یورپی زبان ہے لیکن مذہبی امور کے متعلق اس کا تمام تر سرمایہ عربی سے لیا گیا ہے جو سامی زبان ہے —

زبان کا وہ حصہ جو عہد بہ عہد، اور تدریجی تغیر اور تشکیل کے زمانے

میں بھی اپنی حالت پر بر قرار رہتا ہے ' صرفی اور نحوی قواعد کا حصہ ہوتا ہے - اس میں کوئی شک نہیں کہ لاطینی کی ساخت ہندی۸یوروپی کی ساخت سے اور فرانسیسی کی ساخت لاطینی زبانوں کی ہیئت سے بہت کچھ مختلف ہے - لیکن لاطینی نظام السنہ کی بہت سی خصوصیات فرانسیسی میں اور ہندی۸یوروپی نظام کے خصائص لاطینی میں دوبارہ ظاہر ہوتے ہیں - بات یہ ہے کہ زبانوں کی ہیئت میں ایک طرح کا تسلسل پایا جاتا ہے اور اسی وجہ سے ان کی تقسیم اور درجہ بندی ممکن ہوتی ہے خاندان واری تقسیم السنہ کی اصلی بنیادی تسلسل ہیئت ہے —

جزئیات کی مطابقت سے مثلاً فرانسیسی زبان کے il est (وہ ہے) اور ils sont (وے ہیں) کو المانی زبان کے (وہ ہے) er ist اور sie sind (وے ہیں) سے مطابق پاکر ان زبانوں کے آپس کے رشتے کے متعلق جو ثبوت ملتا ہے اتنا محض عام ساخت کی مشابہت سے نہیں فراہم ہوتا - پس اگر ہندی۸یوروپی خاندان السنہ کے عام قاعدے دریافت ہوسکتے ہیں تو اُن زبانوں کی گردانوں یا خاص کر بے قاعدہ الفاظ کی تحقیق سے دریافت ہوسکتے ہیں جن کا ہندی۸یوروپی ہونا متحقق ہے ' اور اسی بنا پر اس کل مجموعے کی تقابلی صرف و نحو بھی تیار ہوسکتی ہے - باقی رہا عام ساخت یا نظام کی بنا پر کوئی تحقیق کرنا ' تو واضح رہے کہ اثرات کی وجہ سے زبانوں کی ظاہری ہیئت بالکل بدل جایا کرتی ہے - فرانسیسی یا انگریزی کی ساخت ہندی۸یوروپی کی بہ نسبت چینی زبان سے زیادہ ملتی ہے - پس معلوم ہوا کہ محض زبانوں کے عام نمونے کی تحقیق کی بنا پر ان کی خاندان واری تقسیم نہیں کی جاسکتی ' زیادہ سے زیادہ ایک عام اشارہ مل جاتا ہے —

یہی وجہ ہے کہ ہم ترکی۸منگولی اور فنی۸یوگری زبانوں کو ایک ہی خاندان میں شامل نہیں کرسکتے حالانکہ عام نمونے کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ان دونوں میں بہت کافی مشابہت پائی جاتی - ہر زبان کا طریقۂ اصوات

Phonetic System اگرچہ اس کی عام ساخت کے مقابلے میں نسبتاً کم پائدار ہوا کرتا ہے لیکن پھر بھی اس میں کسی قدر ثبات موجود رہتا ہے اور زبانوں کی تحقیق میں اس سے مفید اشارے ہاتھ آ جاتے ہیں —

ہر زبان کے ذخیرۂ لفظی میں عجیب و غریب تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ سرمایۂ لفظی بجائے اس کے کہ اس لسانی تسلسل کا مظہر ہو جو خاندان واری تقسیم میں ظاہر کیا جاتا ہے زیادہ تر تہذیب کے اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام طور پر ہر زبان میں پرانے الفاظ کا ذخیرہ کم و بیش باقی رہتا ہے خاص کر ایسے الفاظ جن کے معنی کھانے پینے جانے آنے کے ہوتے ہیں نیز صفات اور اسماء جیسے رشتوں کے نام عام جانوروں کے نام وغیرہ یہ سب کے سب زیادہ تر پرانے ہی ہوتے ہیں لیکن زبان کا وہ حصہ جس کا تعلق معاشرتی یا ذہنی زندگی سے ہوتا ہے ضرور خارجی اثرات سے متاثر ہوتا ہے تہذیب و تمدن کی اصطلاحیں زیادہ تر کسی تہذیب یافتہ زبانوں سے مستعار لی جاتی ہیں جن کا اثر دنیا کے وسیع قطعوں پر ہوتا ہے اور جو بعض صورتوں میں اس خاندان کی رکن نہیں ہوتیں جس کے لئے وہ الفاظ فراہم کرتی ہیں مثلاً یونانی تہذیب نے جو جدید مغربی تمدن کی اساس اولین ہے لاطینی کو الفاظ مستعار دیے ہیں علاوہ ازیں جس لفظی سرمایہ کو لاطینی نے رواج دیا اس کے پیچھے بھی یونانی زبان ہی کا نمونہ تھا سنہ عیسوی کے آغاز سے جتنے علمی زبانوں کے ذخیرے وجود میں آئے اور بحر قلزم کے گردوپیش پھیلے ان سب کا براہ راست یا بالواسطہ یونانی زبان ہی سرچشمہ تھی اسی طرح سے تمام دنیائے اسلام کے لفظی ذخیرے عربی سے ماخوذ ہیں —

بدھ مت کی نشر و اشاعت کی وجہ سے ہندوستان کی زبان کا اثر وسط ایشیا، ہندچینی اور ملایا کی زبانوں پر پڑا ہے —

. دسویں صدی عیسوی سے فارسی کا اثر وسط ایشیا پر، بلکہ ہندوستانی

تک ، پڑا ہے —

مشرق بعید میں ہم دیکھتے ہیں کہ چین نے انام ، کوریا اور جاپان کے لئے تہذیب و تمدن کے الفاظ فراہم کئے —

مختصر یہ کہ تہذیب و تمدن کی ان سب بڑی بڑی زبانوں کی تعداد اگرچہ کم ہے ، لیکن ان کے اثرات بہت وسیع ہوئے ہیں - مستعملہ حروف تہجی کی تحقیق سے بھی ان کے اثرات کا عام اندازہ ہوجاتا ہے - میخی•(Cuneiform) ، یونانی (اور اسی سے ماخوذ کردہ لاطینی) ، آرمی + (Aramaic) ، عربی ، شلدی ، اور چینی حروف تہجی کے وسیع استعمال سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ ان سب تمدنی زبانوں میں سے ہر ایک کا حلقۂ اثر کیا تھا —

مختصر یہ ہے کہ زبانوں کی تحقیق میں ہم جن تین قسموں کے واقعات پر نظر ڈالتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں - سب سے پہلی چیز ہر زبان کا تسلسل ہے جو اس کی ہیئت ظاہری میں نظر آتا ہے ، اور جس کی بنا پر زبانوں کی خاندانی واری تقسیم کی جاتی ہے - دوسری بات وہ اثرات ہوں جن کی وجہ سے لسانی تغیرات پیدا ہوئے (اس میں شک نہیں کہ ان اثرات کا اب تک کوئی کامل احصاء نہیں ہوسکا ہے ، اور زیر بحث تصنیف سے بھی یہ کمی پوری نہ ہوسکے گی ، لیکن ان اثرات کی اہمیت بہت زیادہ ہے) تیسری چیز تہذیب و تمدن کی زبانوں کا اثر ہے - دوسری زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ کے متعلق زیادہ تر معلومات ان زبانوں ہی سے فراہم ہوتی ہے —

• قدیم بابلی اور آشوری حروف تہجی جو صورت میں میخوں کی طرح ہوتے ہیں ایران میں استخر اور تخت جمشید کے اکثر کتبے اسی زبان میں ہیں ، اور جرمنی کے مستشرقین نے انہیں شناخت کرلیا ہے (و)

+ آرمی - یعنی آرمیا کی زبان یہ ملک فلسطین کے شمال و مشرق میں تھا - (و)

زبانوں کی تحقیق میں خواہ یہ فرض کرلیا جائے کہ ابتدا میں مشترکہ زبانوں کی توسیع ہوئی اور انہیں سے خاص خاص خاندان السنہ وجود میں آئے ، یا چاہے یہ تسلیم کیا جائے کہ زبانوں میں مستعار اجزا کا ایک طویل سلسلہ پایا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس کس تمدن نے کیا کیا اثرات چھوڑے ، لیکن واقعہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کی معلومات کو ایک زبان سے دوسری زبانوں تک لے جانے والے دو زبردست عامل وہی ہیں جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے : یعنی ایک ابتدائی مشترک زبان اور ایک ایسی زبان جس سے الفاظ مستعار لئے گئے -

جو زبان عام طور پر پھیلتی ہے وہ اس جماعت کی زبان ہوتی ہے جس میں نظام معاشرت (یا اقتدار) موجود ہوتا ہے ، اور جس زبان (یا زبانوں) سے الفاظ مستعار لئے جاتے ہیں وہ ایسی زبانیں ہوتی ہیں جن کے ذریعے سے تہذیب و تمدن کی بولیاں سفر کرتی ہیں —

زبانوں کی تمام (ضم اور بین) مثالوں میں ہمیں یہی مذکورہ بالا دو عوامل کام کرتے نظر آتے ہیں تہذیب کا اثر انہی کی وساطت سے منتقل ہوتا ہے اور شدت اور شہرت کے ساتھ عمل کرتا ہے لیکن زبانوں کی تمام مثالیں واضح نہیں ہوتیں ، اور پیچیدہ تر زبانوں سے بھی سابقہ ہوسکتا ہے —

زبانوں کے مختلف خاندان مرتب کئے گئے ہیں ان سب میں ایک ہی قسم کا تاریخی ارتقا فرض کر لیا گیا ہے یعنی کسی مشترکہ زبان کا وسیع حلقے میں پھیلنا اور ربط قائم رکھنے والے اثرات کے کمزور ہوتے ہی اس زبان کی تقسیم - مشترکہ زبان کی توسیع کا نظریہ اس قیاس پر مبنی ہے کہ ایک ایسی قوم جو اپنی مخصوص تہذیب رکھتی ہو اور اپنی قوت اور جدت سے واقف ہو ، پہلے سے موجود تھی ، اور اس کی شہرت اور سطوت اس کی زبان کے پھیلنے کا سبب بنی تھی --

اس قسم کے واقعات (یعنی کسی قوم کی شہرت کی وجہ سے اس کی زبان کی اشاعت) پہلے بھی دیکھے جاچکے ہیں ، اور آج بھی نظر آتے ہیں - مشترکہ زبانوں

کا پھیلنا خصوصیات عالم میں داخل ہے - مثلاً عام فرانسیسی زبان نے پرانی بولیوں کو میدان سے ہٹا کر انہیں مٹا دیا ہے - انگریزی زبان ساری دنیامیں پھیلتی جا رہی ہے - ہندی-یورپی زبانوں کی زبردست توسیع کا خاص سبب یہ ہے کہ ان زبانوں کی بولنے والی آبادیاں تنظیم اور تفوق کی خاص حس رکھتی ہیں ' اور اسی سبب سے ان کی زبانوں نے دوسری زبانوں کی بہت بڑی تعداد کی جگہ خود لے لی ہے ' جیسا کہ اطالیہ میں لاطینی زبان کا حشر ہوا - اسی طرح سے اگر کوئی شخص تاریخ کا مطالعہ کرے تو وہ سامی زبانوں مثلاً آشوری ' بابلی ' عبری ' فنیقی ' آرمی زبانوں اور (ساتویں صدی عیسوی سے) عربی زبان کی توسیع کی وجہ سمجھ سکتا ہے —

لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زبانوں کی توسیع ہر جگہ اسی اصول پر ہوئی ہے- یہ بھی ممکن ہے کہ مصائب کے زمانوں میں آبادیوں کے خلط ملط ' (مثلاً حملوں ' جنگوں وغیرہ میں ' ۱۲ - مترجم) اور زیادہ پیچیدہ حالات کی وجہ سے زبانوں کی توسیع ممل میں آئے - علاوہ برین موازنے اور مقابلےسے جو اعمال کسی ایک عام زبان کی توسیع میں کام دیتے ہیں ' مثلاً ہندی-یورپی ' سامی ' فنی - یوگری ' ہندی-ایشیائی (Indonesian) ' بانتو • (Bantu) وغیرہ میں ' ان کا ہر زبان کی توسیع پر انطباق کرنا درست نہیں ہے - مثلاً یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا کبھی امریکی زبانوں کی ' جنہیں اب تک بہت کم لوگ جانتے ہیں ' اور جن کی تقابلی تحقیق بہت کم کی گئی ہے ' کوئی مکمل اور جامع تقابلی صرف و نحو تیار ہوسکے گی ؟ اب تک جو کچھ تحقیق ان زبانوں کے متعلق کی گئی ہے ' اس کا نتیجہ تو کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے —

جن زبانوں کا ظاہری نظام اس قسم کا ہوتا ہے کہ ان کے الفاظ سے پیچیدہ مشتقات نہیں بنائے جاسکتے مثلاً مشرق بعید کی زبانیں ' یا بعض سوڈانی بولیاں '

• بانتو = جنوبی افریقہ کی زبانوں کا خاندانی نام- (و)

اس میں ہمیں کئی کئی زبانوں کے خلط ملط کی سچی مثال نظر آتی ہے - بر خلاف اس کے لاطینی کی طرح کی کوئی زبان دوسری زبانوں میں خلط ملط نہیں ہو سکتی - لاطینی نظام کا استعمال یا تو پوری طرح ہوگا یا سرے ہی سے نہ ہوگا اگر لاطینی نظام کا استعمال کیا جائے گا تو چاہے کسی زبان کا ذخیرۂ لفظی اس میں شریک کر دیا جائے زبان لاطینی ہی کہلائے گی - اگر یہ نظام استعمال نہ کیا جائے تو چاہے لفظی ذخیرہ سارا لاطینی ہی کا کیوں نہ ہو پھر بھی زبان ہرگز لاطینی نہ کہلائے گی - ہاں اگر اناسی ● (Annamese) زبان کی طرح کی کوئی زبان ہو جس کے صرف و نحو کی ساری کائنات یہ ہے کہ نہ بدلنے والے الفاظ کو کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ جمع کیا جائے تو اس کا کسی دوسری زبان کے ساتھ خلط ملط ہو جانا بے شک قرین قیاس ہو سکتا ہے - پس معلوم ہوا کہ بعض زبانیں ایسی ہوتی ہیں جن کی خاندان واری تقسیم اصلی نہ ہو - یعنی نظام زبان کے متعلق مواد اور معلومات کی کمی کی وجہ سے نا ممکن ہوتی ہے بلکہ اس اصول کا انطباق تک نہیں ہو سکتا ہم نے یہی مناسب خیال کیا ہے کہ بجائے اس کے خاندان واری تقسیم کی اس کوتاہی کی طرف مجہول کر دیں ورنہ اصلیت یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس مواد کافی ہو تو سب زبانیں بلا لحاظ اس امر کے کہ ان کے بولنے والے تہذیب و تمدن کے کن مدارج میں ہیں سمٹ کر چند ابتدائی مشترک زبانوں کے ذیل میں آجاتی ہیں اور جتنی زیادہ ان کی تحقیق کی جائے اتنی ہی زیادہ یہ بات نظر آتی ہے -

---

چونکہ خاندان واری تقسیم السنہ میں مختلف اقسام کے تاریخی واقعات کے اظہار کی کوشش کی جاتی ہے اس لئے اس میں یک جنسی اور یکسانیت نہیں پائی جا سکتی اور اسی وجہ سے " تعلق " السنہ " یا " السنہ متعلقہ " کا مفہوم ایک لسانی مجموعے

● انام کی زبان - انام ہندوستان کے مشرق میں ایک جزیرہ ہے - (و)

یا بولی میں کچھہ ہو تا ہے ' تو دوسرے لسانی مجموعے یا بولی میں کچھہ اور -
زبانوں کی ایک جامع اور مانع تقسیم کر کے انہیں علحدہ علحدہ خاندانوں میں
رکھنے کی کوشش کر نا خود اس امر کی دلیل ہے کہ ایسی کوشش کر نے والا شخص اب
تک خاندان واری تقسیم السنہ کا اصول ہی نہیں سمجھا ہے —

علاوہ بریں اکثر صورتوں میں ' جو مواد ہمارے پاس موجود ہے وہ نا کافی
ہے - چاہے افریقہ ' امریکہ یا آسٹریلیا کی بحث درپیش ہو ' ہمیں کثرت سے ایسی
زبانیں نظر آئیں گی جن کے نظام کو بہت ناقص طریقے سے بیان کیا گیا ہے ' یا
سرے سے بیان ہی نہیں کیا گیا ہے - پس ان زبانوں کی تقسیم اور درجہ بندی کا
اگر کوئی ذریعہ ہمارے پاس باقی رہتا ہے تو وہ صرف ذخیرۂ الفاظ یا اصوات کی
مشابہت ہے ' اور ظاہر ہے کہ ثبوت کی حیثیت سے یہ آخرالذ کر طریقہ اتنا مفید
نہیں ہے جتنا کہ مخصوص نحوی اور صرفی جزئیات کی مشابہت ' جس کے ذریعہ
سے ہم ہندی ' یورپی ' سامی ' فنی ' یوگری ' بانٹو ' اور دیگر خاندان السنہ کی
حقیقی اور اصلی تشخیص کرچکے ہیں - بعض اوقات طریقۂ اصوات کی یکسانی سے
بھی زبانوں کا تعلق ظاہر ہو تا ہے - مثلاً ہندی۸یورپی خاندان میں وہ حروف
حلقی (Laryngal Consonants) بہت کم پائے جاتے ہیں جو سامی زبانوں میں
بہت عام ہیں - اس قسم کی مشابہت سے اگرچہ کوئی حقیقی ثبوت نہیں ملتا '
لیکن کچھہ نہ کچھہ اشارے ضرور ملتے ہیں - اور جب صوتی اشاروں کے ثبوت کی
تائید مزید ذخیرۂ الفاظ خصوصاً ایسے الفاظ کی مشابہت سے ہو جو پرانے ہیں '
اور مستعار نہ لئے گئے ہوں ' تو اس صورت میں تعلق السنہ بہت ممکن اور قرین
قیاس ہو تا ہے —

خاندان واری تقسیم السنہ میں جا بجا جو جگہیں چھوٹی ہوی نظر آتی
ہیں ان کا سبب زیادہ تر بیان کا نقص اور تقابلی تحقیق کی کمی ہے -

اس تقسیم کی اصلی اہمیت اسی صورت میں ظاہر ہو سکتی ہے جب زیادہ گہری تحقیق کی جائے —

مکمل اور گہری تحقیق کے نہ ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زبانوں کے اکثر تعلقات جو آج محض قیاس کی بنا پر قائم کر لئے گئے ہیں، اب تک ثبوت طلب ہیں علاوہ بریں بہت سی زبانوں کا جو بیان کیا گیا ہے وہ ناقص ہے۔ افریقہ، امریکہ، اور آسٹریلیا کی بہت سی زبانوں کے متعلق تو ہمارے پاس ذخیرۂ الفاظ کے سوا اور کچھ مواد ہی نہیں ہے۔ ان کی صرف ونحو سے اب تک کوئی واقف ہی نہیں ہے۔ اور اگر کہیں کہیں بیانات ذرا مکمل نظر آتے ہیں تو وہاں مقابلے اور موازنے کا کام اب تک شروع نہیں ہوا ہے۔

زبانوں کے جو بڑے بڑے خاندان اب تک قائم کئے جا چکے ہیں، ان کے تعلق کے متعلق بحث و تمحیص اس موجودہ کتاب کی حد نظر سے باہر ہے۔ ایسے واقعات فراہم کئے جا چکے ہیں جن سے سامی اور ہندی۔یورپی، فنی۔یوگری او ہندی۔یورپی خاندانوں کا باہمی تعلق ثابت ہوتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں مشابہت اور موافقت اصلی معنوں میں نظامات السنہ میں نہیں بلکہ ذخیرۂ الفاظ میں پائی جاتی ہے۔ یہ نظریہ کہ ہندی۔یورپی زبانوں، قدیم ایشیا کی زبانوں مثلاً لیشیا اور کیریا (Lycian and Carian) کی زبانیں، قفقاز کی بولیوں، فنی یوگری، حامی۔سامی (Hamito-Semitic) * زبانوں وغیرہ میں دور

---

* حام (Ham) حضرت نوح کے فرزند تھے، حامی زبانوں [؟] زبانوں کا وہ مجموعہ مراد لیا جاتا ہے جو شمالی افریقہ میں پایا جاتا تھا مثلاً مصری، قبطی زبانوں — (ا و)

رشتہ پایا جاتا ہے بعید از قیاس نہیں ہے ' اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سب زبانیں ایک ہی عام زبان کی بدلی ہوئی شکلیں ہوں --

لیکن اس مفروضۂ عام زبان کی خصوصیات اس قدر مبہم طور پر ظاہر ہوتی ہیں کہ کوئی قطعی دعوی کرنا اور اس موقع پر اس کی بحث اٹھانا قبل از وقت ہے - اس کا ثبوت اس وجہ سے اور مشکل ہو جاتا ہے کہ بعض خاندانوں (مثلاً ہندی۔یورپی) کا پیچیدہ نظام نسبۃً ایک جدید تر زمانے کی چیز ہے ' اور سامی یا فنی۔یو گری خاندانوں میں اس کے اجزا کا موجود ہونا بہت بعید از قیاس ہے - یہ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ اگر دو زبانوں میں نحوی اور صرفی اشکال کا تسلسل نہ پایا جائے تو ان کے لئے " السنۂ متعلقہ " کی اصطلاح استعمال کرنا ایک بے معنی چیز ہو جاتا ہے - اس کے علاوہ ' ایک اور پر زور وجہ اس بات کی موجود ہے کہ انسانی زبان کے وحدت آغاز ' اور خود ابتداے زبان کے مسئلہ کو یونہی غیر فیصل چھوڑدیا جاے —

انسانوں کے مختلف مجموعوں میں ' بدنی ' عضو یاتی اور نفسی حالات کچھ ایسے یکساں ہیں کہ ہمیں ہر جگہ انسانی ساخت کی وہی نمایاں خصوصیتیں موجود نظر آتی ہیں۔سب انسان بحیثیت مجموعی ایک سے صوتی طریقے کام میں لاتے ہیں' اور مختلف طریقوں سے لفظوں کے مجموعے بنا کر بات چیت کرتے ہیں - جزئیات میں البتہ فرق ہوتا ہے ' لیکن لسانی طریقوں کی اساس کل جنس انسانی میں ایک ہی ہے - مگر یہ ثابت کرنا کسی قدر دشوار ہے کہ ایسی جزوی مشابہتیں جو خاص خاص واقعات کی بنا پر ہمیں ماضی کے خاص خاص نظامات کی طرف نہیں لے جاتی ہیں ' زبانوں کا تعلق اور رشتہ ثابت کر سکتی ہیں یا نہیں - موجودہ کتاب میں ہم صرف اسی تعلق کو مستند سمجھیں گے جو تقابلی صرف ونحو کی بنا پر یا کم از کم عام صرفی اور نحوی خاکوں کی بنا پر قائم کیا گیا ہو ' یا پھر ' اگر قطعی نحوی ثبوت فراہم نہ ہوسکے ' تو طریقۂ اصوات کے مربوط اور نمایاں

مشابہت رکھنے والے مجموعوں سے ثابت ہوتا ہو۔

کم از کم اتنی بات تو اب بھی ثابت ہو سکتی ہے کہ اکثر زبانیں خاص خاص خاندانوں کی تھوڑی سی تعداد میں آجاتی ہیں۔ مثلاً تمام یورپ اور ایشیا کے کچھ حصے کی تقریباً سب زبانیں ہندی۔یوروپی مجموعے میں آجاتی ہیں۔ ہاٹن ٹاٹ * Hottentot کو چھوڑ کر افریقہ کی اور سب زبانیں بانتو خاندان کی رکن ہیں؛ اسی طرح سے تمام حبشی اقوام کی زبانوں کے باہمی تعلق کا کچھ نہ کچھ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اسی کو دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ تاریخی زمانے † میں، یا تاریخی زمانے کے آس پاس، عام اور مشترکہ زبانوں کی ایک مختصر سی تعداد بڑے بڑے حصوں میں رائج تھی۔ اس امر پر متعجب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زبانیں ترسیل خیال کی غرض سے بنتی ہیں، اور جتنے زیادہ لوگ آپس میں ان کے ذریعے سے تبادلۂ خیال کر سکیں، اتنی ہی زیادہ زبانیں مفید سمجھی جاتی ہیں اور جب تاریخی تغیرات اور نئی زبانوں کے استعمال کی وجہ سے لسانی انتشار ‡ واقع ہوتا ہے تو لوگ برابر اس کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔

علاوہ بریں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جو زبانیں فی الحقیقت باقی ہیں، یا جن کے متعلق تحریری شہادتیں موجود ہیں، صرف وہی رائج تھیں، اور ان کے علاوہ اور زبانیں موجود ہی نہ تھیں۔ بعض کم و بیش ضخیم کتابوں سے یہ بعض

---

* Hottentot جنوبی مغربی افریقہ کی ایک دہقانی قوم اور اس کی زبان۔ یہ نسل اب ناپید ہوتی جارہی ہے۔ (و)

† تاریخی زمانہ = وہ زمانہ جس کے متعلق تاریخی شہادتیں موجود ہوں، تازہ ترین تحقیق نے تاریخی زمانہ ۴۰۰۰ سال قبل مسیح کو قرار دیا ہے، اور سمیری قوم کے آثار دریافت کئے ہیں، اس سے پہلے کا زمانہ "زمانۂ ماقبل تاریخ" کہلاتا ہے۔ (و)

‡ یعنی کسی رائج الوقت زبان کا میدان سے ہٹنا اور ترسیل و تبادلۂ خیال میں رکاوٹوں کا پیدا ہونا۔ (و)

دوسری شہادتوں سے اس امر کا پتہ ملتا ہے کہ بہت سی زبانیں جو پہلے بولی جاتی تھیں، تاریخی زمانے میں مٹ گئیں۔ اطالیہ میں آسکن (Oscan) اور امبرین (Umbrian) • کی طرح جو دونوں لاطینی زبان سے تعلق رکھنے والی بولیاں تھیں اور بہت سی زبانیں جن کے کتبے آج تک موجود ہیں، مٹ گئیں مثلاً اترسکن (Etruscan) † ، ونیشین (Venetian) ‡ ، مسےپی ان (Messapian) $ ، صقلی (Sicilian) § وغیرہ —

ایشیائے کوچک کی تمام قدیم زبانیں جو اپنی تصنیفات کی وجہ سے کم و بیش معروف ہیں مثلاً بابلی زبان، حطیمی ¶ زبان (Hittite) کے ریا (Caria) ، لیڈیا (Lydia) ، لیشیا (Lycia) اور فروجیا ‖ (Phrygia) کی زبانیں سب کی سب فنا ہوگئیں اور کسی ایک نے بھی اپنی یادگار نہ چھوڑی، شامی زبان (Syriac) کی یادگار کے طور پر البتہ کچھ بولیاں باقی ہیں جو کہیں کہیں بولی جاتی ہیں جس طرح سے بعض نسلیں مٹ گئیں، اسی طرح سے اکثر خاندان السنہ بھی فنا ہو گئے، اور ان کے فنا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ قدیم روایتیں بھی مٹ گئیں جن کی مدد سے ان مردہ زبانوں کی پسماندہ زبانوں کے باہمی تعلق کا کچھ پتہ ملتا —

• یہ دونوں زبانیں پہلے اطالیہ میں بولی جاتی تھیں، آسکن جنوبی اطالیہ میں اور امبرین وسط اطالیہ میں رائج تھی، یہ دونوں لاطینی الاصل ہیں۔ (و)

† Etruria کی زبان (و)

‡ وینس (بندقیہ) کی زبان — (و)

$ Messapia کی زبانیں (و)

§ جزیرہ صقلیہ کی زبان۔ یہ سب زبانیں سلطنت روم کے مختلف حصوں میں رائج تھیں —

¶ حطیمی (عبرانی لفظ ہے) — ایک طاقتور قوم تھی جو شمالی شام میں آباد تھی، یہ غالباً سامی الاصل نہ تھی۔ اس قوم کی زبان حطیمی کہلاتی ہے — (و)

‖ یہ سب کے سب ایشیائے کوچک کے حصے تھے۔ (و)

زبانوں کے مجموعے کا آج ہمیں پتہ نہیں چلتا ممکن ہے کہ وہ کسی ایسے قدیم مجموعے کی باقیات ہوں جس کے دوسرے اجزا اور نمائندے آج موجود نہیں ہیں ' اور جس کے متعلق سوائے ایک زبان کے جو اتفاقاً باقی رہ گئی ہے اور کوئی یادگار بھی باقی نہیں ہے ۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ زمانۂ ما قبل تاریخ کو دیکھتے ہوئے زمانۂ تاریخی بہت ہی تھوڑا ہے ۔ خاندان واری تقسیم السنہ میں زبانوں کے ان مجموعوں کو جو گزشتہ چند ہزار سال کے تاریخی تغیرات کا نتیجہ ہیں ' از سر نو ترتیب دیا جاتا ہے —

اس قسم کی ترتیب اور تقسیم سے ہمیں اس بات کا خفیف سا خفیف اندازہ بھی تو نہیں ہوتا کہ زمانۂ تاریخی سے پہلے جو ہزاروں سال گزرے ہیں یعنی اس قدیم زمانے میں جب انسان کے پہلے پہل زبان کو حیات اجتماعی اور صنعتی اور تمدنی ارتقاء کا وسیلہ بنایا تھا ' کیا واقعات پیش آئے تھے اگر یہ واقعہ ہے کہ ہم تمام مختلف زبانوں کی درجہ بندی نہیں کر سکتے : اور ہماری تحقیق اگر کہیں تھوڑی بہت کام آتی ہے تو صرف مختلف مجموعوں کی تقابلی صرف و نحو کے مطالعہ میں اور اس صنف میں بھی ہم بجز سامی، ہند یوروپی، ہندی ایشیائی اور بانتو خاندانوں کے اور کسی کے متعلق کچھ نہیں جانتے ہیں ۔ تو ان سب باتوں سے یہ لازم آتا ہے کہ انسانی زبانوں کی وحدت یا کم از کم ان زبانوں کے جو آج معروف ہیں ' آغاز اور ابتدا کے مسئلہ کو اٹھانا کچھ زیادہ سود مند نہیں ہوسکتا ۔

لسانیات کی اصطلاحیں بھی اکثر واضح اور مستقل نہیں ہیں ' اور مناسب یہ ہے کہ پہلے حسب ذیل اصطلاحات کی تعریف کردی جائے۔ زبان ' مقامی بولی ' یا محاورہ یا گفتگو ۔ خاص زبان ' بازاری بولی (Slang) —

مذکورہ بالا اصطلاحات میں ' معنوں کے اعتبار سے عام تر اصطلاح " زبان " کی ہے ۔ اس اصطلاح کے مفہوم میں وہ تمام لسانی ذرایع اور وسائل داخل ہیں جو

انسانوں کا ایک خاص گروہ استعمال کرتا ہے' اب چاہے اس گروہ کی کثرت یا تمدن اور معاشرت کے اعتبار سے اس کی اہمیت کچھ ہی کیوں نہ ہو - اب ایسے مجمعوں کی تعداد جن کے افراد بغیر سیکھے ہوئے دوسرے مجمع کی زبان نہ سمجھ سکیں جتنی ہوگی اتنی ہی زبانیں بھی ہوں گی- افہام کی یہ حد اکثر صورتوں میں قطعی بھی ہوا کرتی ہے - چینی ' عربی ' یا انگریزی بولنے والا شخص ایسے شخص کے لئے جو صرف فرانسیسی جانتا ہو ناقابل فہم ہے ' لیکن برخلاف اس کے پکارڈی (Picardy) * کے کسی دیہات کی طرز گفتگو پیرس کے رہنے والوں کے لئے پوری نہیں تو کم از کم آدھی قابل فہم ضرور ہے- ظاہر ہے کہ " پوری طرح قابل فہم " اور " قطعی ناقابل فہم " ان دونوں حدوں کے درمیان بے شمار مدارج ہوسکتے ہیں - اگر ایک ایسا گروہ ہو جو دور دور تک پھیلا ہوا ہو (مثلاً مقامی فرانسیسی بولیاں استعمال کرنے والا گروہ) تو اس صورت میں قرب و جوار کے باشندے ایک دوسرے کی گفتگو کو اگر بالکل نہیں تو کم و بیش ضرور سمجھ لیتے ہیں ' لیکن دور دراز کے علاقوں کے باشندے ایک دوسرے کی بولی بالکل نہیں سمجھتے - جو شخص نارمن † زبان بولتا ہو وہ ‡ Franc Comtois یا $ Walloon زبان ہرگز نہیں سمجھ سکتا —

محاورہ یا گفتگو سے وہ لسانی ذرایع مراد ہوتے ہیں جو کسی ایسے مقامی گروہ میں مستعمل ہوں جو خود کسی بڑے اور وسیع گروہ کا جز ہو - اس کی مثال وہ فرانسیسی محاورے اور بولیاں ہیں جو شمالی فرانس' جنوبی فرانس' پراولساں (Provencal)' گیس کن (Gascon) وغیرہ میں بولی جاتی ہیں جیسے

---

* فرانس کا ایک صوبہ ہے— (و)

† فرانس کے صوبہ Normandy کی زبان — (و)

‡ ایک قدیم فرانسیسی صوبے Franche Compte کی زبان — (و)

$ بلجیم کے وہ باشندے جو فرانسیسی الاصل ہیں ' نیز اُن کی زبان — (و)

اٹلی کے مختلف حصوں میں استعمال ہونے والی اطالی زبان —

زبان اور مقامی محاورہ کی دونوں اصطلاحوں میں یہ فرق ہے کہ زبان کے معنوں میں ایسے مستقل اسانی طریقے داخل ہوتے ہیں جو تمام تر ہمارے علم میں ہوں۔ مقامی محاورے میں یہ نہیں ہوتا۔ مثلاً فرانس کی مقامی بولیوں میں سے ہر بولی ایک مقامی طرز ادا رکھتی ہے اور یہ طرز ادا مختلف افراد میں مختلف ہوتا ہے۔ یہ مقامی بولیاں ایک وسط پر درمیانی حد کے ادھر ادھر ڈھلکتی رہتی ہیں۔ کچھ نہ کچھ قواعد کی پیروی تو ان میں بھی کی جاتی ہے، لیکن یہ قواعد منضبط نہیں ہوتے۔ برخلاف اس کے فرانسیسی زبان ایک عام یا مشترکہ زبان ہے، جس کے قواعد منضبط ہو چکے ہیں، اور جو اپنی مخصوص ادبی روایات بھی رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اصطلاح " زبان " کتنے مختلف مفہوم پر حاوی ہے —

جب کوئی زبان جڑ پکڑتی ہے تو ... اور ... کی بدولت اس میں بولنے والوں کی معاشرتی حیثیت، پیشے وغیرہ کے اعتبار سے بھی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، مثلاً بول چال کی زبان، تحریری زبان وغیرہ۔

اس امر پر عام طور سے سب متفق ہیں کہ اگر ایک لسانی گروہ بہت وسیع ہو، تو اس کی خاص خاص بولیوں میں کچھ نہ کچھ خصوصیتیں ضرور پائی جاتی ہیں، اور جو لوگ اس علاقے کے چند علاقوں کی زبان بولتے ہیں وہ خود کو اسی ایک ذیلی گروہ میں داخل سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مختلف مقامی بولیاں ایک ہی مجموعے کے اجزا ہیں۔ مثلاً مختلف فرانسیسی بولیوں کو جیسے Wallon : Picard ، Lorraine ، Champenois : Norman وغیرہ ایک ہی حلقہ میں داخل کیا جاتا ہے۔ France : Comptois : Bourguignon

لیکن یہ درجہ بندی مبہم ہے، اس لئے کہ عام طور پر ہم کسی مقامی بولی کی حد متعین

نہیں کرسکتے اس لئے کہ مقامی بولیوں کی ہر خصوصیت اپنی اپنی جگہ پر نرالی ہوتی ہے۔ مقامی بولی کی پہچان یہ ہے کہ اس کی بعض بعض خصوصیتیں اگرچہ ایک دوسرے سے مشابہت تام نہیں رکھتیں ' لیکن کچھ نہ کچھ ملتی جلتی ہیں ۔ دوسری پہچان یہ ہے کہ خود اس مقامی بولی میں جو مختلف اب و لہجے داخل ہیں ان سب میں کچھ نہ کچھ مشترک خصوصیتیں ضرور ہوتی ہیں —

کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی زبان ' یا ایک ہی بولی بولنے والے لوگوں میں مقامی اختلافات کے علاوہ ایسے افراد کے مجموعے بھی موجود ہوتے ہیں جو الگ خصوصیتیں رکھتے ہیں ' مثلاً ایک پیشے کے افراد' یا ایک درجہ کے افراد ۔ ان کی زبان کو ہم نے "مخصوص یا خاص زبان" کہا ہے ۔ اس قسم کی " خاص زبانیں " ویسے عام طور پر اپنی ساخت یا تلفظ کے اعتبار سے معمولی زبان سے الگ نہیں ہوتیں ' اور اگر ان کی کچھ علحدہ خصوصیتیں ہوتی بھی ہیں تو تمام تر ان کے ذخیرۂ لفظی میں ۔

زبانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے لفظی ذخائر کو جن میں اصل یا مشترک زبان کے لفظی ذخائر بھی مسخ ہو کر شامل ہوتے ہیں ' بازاری بولی (Slang) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ یہ اصطلاح عام طور پر جرائم پیشہ لوگوں یا مشتبہ افراد کی زبان کے لئے استعمال کی جاتی ہے ' لیکن کبھی کبھی اس کے مفہوم کو وسیع بھی کردیا جاتا ہے ' مثلاً فوجی بارکوں ' اور مدرسوں کی مخصوص بولیوں کو بھی بازاری کہہ دیا جاتا ہے ۔ جب کسی پیشے یا خاص خاص گروہوں کے افراد اپنی اپنی الگ اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں تو انہیں بھی ' خاص زبان ' کہا جاتا ہے' جیسے خاص خاص پیشوں یا کھیلوں کی اصطلاحیں ۔ اسی طرح سے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زبانوں کو معمولی صحت کے ساتھ نہیں بولتے بلکہ ناقص طور پر استعمال کرتے ہیں ۔ ان کی وجہ سے زبانوں کی جو مسخ شدہ اشکال پیدا ہو جاتی ہیں ' ان کا احاطہ بھی ہمیں کرنا چاہئیے ۔ مثلاً نو آبادیات کے حبشی غلام اپنے آقاؤں کی ہسپانوی یا فرانسیسی زبان کو کبھی صحیح طریقے سے ادا کرنے کی کوشش نہیں

کرتے ۔ جزائر مغربی کی زبانیں صرف براے نام فرانسیسی یا ہسپانوی ہیں ۔ انہیں ایسی ہسپانوی یا فرانسیسی زبان کہنا چاہئے جو صرف و نحو سے بے نیاز ہوگئی ہے ، جس کا تلفظ کمزور ہو گیا ہے اور جس کا ذخیرۂ لفظی گھٹ کر بہت تھوڑا رہ گیا ہے ۔ مشرق اقصیٰ کے مختلف بولیاں بولنے والے لوگ جب یورپی لوگوں کے ساتھ تعلقات رکھتے ہیں تو ایک طرح کی مسخ شدہ انگریزی بولتے ہیں جسے 'پی جن' (Pidgin) انگریزی کہا جاتا ہے ۔ سواحل بحر قلزم پر بھی اسی قسم کی مختصر اور مسخ شدہ زبانیں پائی جاتی ہیں ، جنہیں سابر (Sabir) کہتے ہیں ۔

اس قسم کی زبانوں میں صرف و نحو کا حصہ کم سے کم ہوتا ہے اور ان میں ہر قسم کا خلط ملط پایا جاتا ہے ۔ ایسی زبانوں کو اگر وہ رواج اور استعمال میں اگر متعین ہوچکی ہوں تو خاندان واری تقسیم السنہ میں ایک علحدہ حیثیت دینی چاہئے ۔ اس تقسیم کی بنیاد تاریخی مواد پر رکھی جائے اور مختلف صورت حالات کے اعتبار سے اس کے مواد بھی مختلف ہونے چاہئیں ۔

اس موقع پر مصنوعی زبانوں جیسے وولاپک (Volapuk) ، اسپرانتو • (Esperanto) ، ایدو (Ido) وغیرہ کی بحث نامکن ہے ۔ ان زبانوں میں سے کوئی بھی اب تک نہیں چلی ہے ، اور اگر کہیں انہیں کچھ کامیابی ہوئی بھی ہے تو صرف اس حیثیت سے کہ یہ ایسی زبانوں کے بولنے والوں کے درمیان وسیلہ بنی ہیں ، جن میں یہ ایک درمیانی واسطہ کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ ان تینوں میں سے صرف اسپرانتو اور ایدو ہی کسی قدر ترقی یافتہ ہیں ، اور ان کا ذخیرۂ لفظی ایسا رکھا گیا ہے جو یورپ کی بڑی بڑی زبانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد میں مشترکہ طور پر پایا جاتا ہے ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا سرمایۂ لفظی در اصل تمام تر

• یہ زبانیں "جگت بھاشائیں" (Universal languages) کہلاتی ہیں ، ان کے متعلق ملاحظہ ہو مترجم کا مضمون " جگت بھاشا" جو رسالۂ اُردو کی کسی گذشتہ اشاعت میں شایع ہوا تھا ۔ (م)

لاطینی الاصل ہے ' اور یہ مصنوعی زبانیں ' رومانی زبانوں کے بہت لگ بھگ ہیں غرض کہ ہر جگہ سے ہر پھر کر ہم اسی خاندان واری تقسیم السنہ ہی کی طرف آجاتے ہیں۔

آئندہ صفحوں میں جو بیانات ملیں گے اُن سے ثابت ہوجاے گا کہ اس قسم کی تقسیم اب تک ناقص اور غیر مکمل ہے ' نیز اس کی وجہ بھی معلوم ہو جاے گی کہ یہ ہمیشہ ایسی ناقص کیوں رہے گی - زبانوں کی کوئی اچھی ' خاندان واری تقسیم کرنے کے لئے ' سب سے پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ ہم ہر علاقے کی لسانی تاریخ سے واقف ہوں اور ان تمام اثرات پر ہماری نظر ہو جو کسی زبان کے رائج ہونے کے وقت سے لے کر اب تک اپنا اپنا کام کرتے رہے ہیں - اس واقفیت کے باوجود ' اب تک لسانی تاریخ کے بعض جدید ترین واقعات کے متعلق ہماری معلومات بہت مبہم اور سرسری ہے - مثلاً فرانس ہی کو لیجیے ' ہم سب جانتے ہیں کہ گالش (Gaulish) زبان کلٹ (Kelt) قوم کی فتوحات کی وجہ سے پھیلی ' اور ایک ہزار سال قبل مسیح سے اس کا رواج ہے- اسی طرح سے ' ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس ملک (فرانس) میں لاطینی زبان کا رواج سن مسیحی کے ابتدائی سالوں سے شروع ہوا ' لیکن یہ ہم بالکل نہیں جانتے کہ گالش نے کن کن زبانوں کو بے دخل کیا اور رومن فتوحات کے وقت اس کے علاوہ اور کون کون سی زبانیں بولی جاتی تھیں - ان زبانوں کے بارے میں جو گال قوم کی فتوحات سے پہلے رائج تھیں ہمیں مطلق کسی قسم کا علم ہی نہیں ہے ' اور اس بات کا ثبوت کہ گال (Gaul) میں گالش زبان سے پہلے بھی کچھ زبانیں رائج تھیں صرف اسی قدر ہے کہ گال میں بعض بعض مقامات کے نام ایسے ہیں جن کی تعبیر کلٹی (Keltic) زبان سے نہیں کی جاتی ' اور دراصل وہ کلٹک ہیں بھی نہیں --

ہندی یوروپی السنہ کی جو تقابلی صرف و نحو تیار ہوئی ہے' وہ فی الحقیقت ایک نمونہ ہے اس بات کا کہ لسانیات کے تاریخی مواد کس ترتیب کے ساتھ منظم کرنے چاہئیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں بعض نمایاں خامیاں ضرور ہیں ' اور لسانی تاریخ میں

جابجا ایسی جگہیں اب تک چھوٹی ہوئی ہیں ' جنہیں پر کرنا پڑے گا ' لیکن ان خرابیوں کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ ہندی یورپی السنہ کے متعلق جو تحقیقی اور قابل قدر کام اب تک ہوچکا ہے ' وہ نہیں اور ابھی ممکن نہیں ہے ۔ اور لسانی تاریخ میں ، تقریباً ہر طرف ابھی بہت کچھ کام باقی ہے ۔ چنانچہ ہماری اس موجودہ کتاب کو بھی نتائج کے خلاصے کی بجائے تحقیق کا ایک طرح کا نظام العمل سمجھنا چاہئے ۔ جو کام ابھی باقی ہے وہ بہت بڑا اور عظیم الشان ہے اور اس کا سرانجام پانا صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ ماہرین لسانیات کے لئے معتدبہ وسائل اور ذرائع مہیا کئے جائیں ۔

تبصرے

ادب

مذہب و اخلاق

تعلیم

تاریخ و معاشیات

متفرقات

جدید رسالے

ادب

مضامین چکبست

(پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی کے مضامین کا مجموعہ ۔
انڈین پریس الہ آباد ۔ صفحات ۳۳۲ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے)

اس سے قبل مرحوم کی نظموں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے ۔ اب یہ مجموعۂ مضامین اسی مطبع نے صفائی اور خوش اسلوبی کے ساتھ شائع کیا ہے انڈین پریس الہ آباد کی یہ ادبی خدمت قابل شکر گزاری ہے کہ اس نے یہ پاکیزہ اور قابل قدر مضامین تلف ہونے سے بچا لیے ورنہ ان کا تلف ہونا اردو زبان کا صریح نقصان تھا ۔

پنڈت برج نرائن چکبست صرف اہل زبان ہی نہ تھے بلکہ انہوں نے زبان کا غور سے مطالعہ کیا تھا ۔ اُردو زبان اور شاعری کے دلدادہ تھے ۔ خود بہت اچھا کہتے اور اچھے کہنے والوں کی قدر کرتے تھے ۔ اردو میں آتش، میر انیس اور غالب کے بیحد مداح تھے ۔ ان کے دل میں اپنے وطن کا درد بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ان مضامین میں بعض مقامات پر اپنے زمانے کے نوجوانوں کی حالت پر افسوس کرتے ہیں کہ وہ فیشن کے دلدادہ ہیں اور سنجیدہ مضامین پر غور نہیں کرتے ۔ مگر اُن کا اصل ذوق ادبی ہے ۔ اس مجموعے میں سوائے تین مضمونوں کے جو دادا بھائی نوروجی، تاریخ اور ذات کی تفریق پر ہیں، باقی تمام مضامین اہل قلم اور اہل سخن پر ہیں ۔ ایک اچھا کام یہ کیا ہے کہ بعض کشمیری شعرا اور مصنفین پر بھی تنقیدی اور تحسینی مضمون لکھے ہیں ۔ اس سے اُن کی قوم پرستی ہی نہیں ظاہر ہوتی بلکہ یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ

کشمیری حضرات نے اُردو زبان کی نظم و نثر میں بھی وہی کام کیا ہے جو فارسی میں کیا تھا اور اس سے اُردو زبان کی ہر دل عزیزی ثابت ہوتی ہے۔ یہ مضامین پنڈت دیا شنکر نسیم، سالم، پنڈت تربھون ناتھ سپرو ہجر، پنڈت رتن ناتھ در، سرشار، لچھمی رام حافظ، پنڈت بشن نرائن در، پنڈت برج ناتھ سرسوتی پر ہیں۔ ان میں سے بعض اصحاب اُردو کے نامور اہل قلم گزرے ہیں۔ جن کا کلام ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ ان کے علاوہ عالی مضامین داغ، گلزار نسیم، اودھ پنچ، منشی سید محمد سجاد حسین، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد، منشی جوالا پرشاد برق، بہار ... (تصنیف پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی) اُردو ہندی پر ہیں، یہ سارا مجموعہ دیکھنے کی چیز اور پڑھنے کے لائق ہے —

چکبست مرحوم کو زبان پر بڑی قدرت ہے، اپنے مطالب بہ صفائی اور بعض اوقات رنگینی سے بہت اچھی طرح ادا کرتے ہیں۔ طرز بیان دلکش ہے، اُردو کے شعرا کا بہت اثر معلوم ہوتا ہے۔ تنقید نگاری کا بہت اچھا سلیقہ ہے اور اس مجموعے میں زیادہ تر تنقیدی مضامین ہیں۔ لیکن چکبست کا زمانہ اودھ پنچ کے زور شور کا زمانہ تھا اور اس کا اثر ان پر آخر دم تک رہا اور یہی وجہ ہے کہ وہ تنقید میں اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ چنانچہ پنڈت تربھون ناتھ سپرو "ہجر" کے حال میں انہوں نے ان کے مسدس کا کچا چٹھا کا ذکر کیا ہے اور اس کے شستہ الفاظ، ترکیب کی چستی، زور و تاثیر وغیرہ کی بے انتہا تعریف کی ہے اور اسی ضمن میں فرماتے ہیں —

"مولانا حالی کا مسدس بھی اسی رنگ میں ہے، مگر چونکہ مولانا ممدوح کے دل میں شاعری کی آگ نہیں روشن ہے، لہذا ان کے مسدس میں اس جوش و خروش کا اظہار نہیں جو کچھ چٹکی کا خاص جوہر ہے" —

ایک تو اس سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ مولانا حالی نے "ہجر" کی تقلید میں اپنا مسدس لکھا تھا حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ "ہجر" نے اپنا مسدس مولانا حالی کے مسدس کے اتباع اور تقلید میں لکھا۔ دوسرے جب ہم ان بندوں کو پڑھتے ہیں جو اس تعریف کی تائید میں پیش کئے گئے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ حضرت چکبست نے یہ کیسے لکھ دیا اور اس وقت وہ کس عالم میں تھے۔ لیکن یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے، اچھے اچھے صاحب بصیرت ملکی اور وقتی حالات سے ایسے متاثر ہوجاتے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے گویا آنکھوں پر پردہ پڑگیا ہے —

لسان و مطالعۂ لسان

(مترجمہ جناب حمیداللہ خاں صاحب یوسف زئی،
پروفیسر فارسی، گورنمنٹ کالج اجمیر - صفحات ۳۴۱
قیمت چار روپے آٹھ آنے)

لسانیات پر اُردو میں کوئی کتاب نہیں - انگریزی زبان میں بھی جو کتابیں ہیں وہ بھی کسی قدر پرانی ہیں - اس علم کے حاصل کرنے کے لئے جرمن زبان کا جاننا ضروری ہے - پروفیسر حمیداللہ خاں صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے پروفیسر 'وھٹنی' کی کتاب کا ترجمہ اُردو زبان میں کردیا - یہ اُس کتاب کا صرف پہلا حصہ ہے - ترجمہ بہت صاف ہے اور بلا تکلف سمجھ میں آتا ہے، البتہ بعض بعض جگہ جملوں کی ساخت انگریزی ہوگئی ہے اور سمجھنے میں الجھن پیدا ہوتی ہے، لیکن ایسے مقامات بہت کم ہیں اور اس میں بہت کچھ مجبوری بھی ہے - اصطلاحات بھی وہی ہیں جو انجمن ترقی اُردو نے وضع کی ہیں یا اُن اصول پر وضع کی گئی ہیں جو انجمن نے قائم کئے ہیں —

پڑھنے والوں کی نظر میں ایک بات ضرور کھٹکے گی کہ کتاب میں ہر جگہ مثالیں انگریزی زبان کی ہیں جو لامحالہ انگریزی حروف میں لکھنی پڑی ہیں - اس لئے اردو داں اصحاب اس سے مستفید نہیں ہوسکتے - فاضل مترجم کو بھی اس بات کا خیال تھا اور انہوں نے بطور دفع دخل مقدر اس کا جواب اِن الفاظ میں دیا ہے :—

"اس ترجمے پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جو مثالیں دی گئی ہیں اور اُن سے جو اصول اخذ کئے گئے ہیں ان کو اردو سے کوئی تعلق نہیں - یہ اعتراض تمام و کمال صحیح نہیں - مثالیں بے شک انگریزی سے لی گئی ہیں، لیکن جو نتیجے نکالے گئے ہیں وہ ہمہ گیر و جامع ہیں........ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب اصول ہمہ گیر ہیں تو پھر مثالیں ہی کیوں نہ بدل دی گئیں کہ اس وقت جو غرابت و تنافر پایا جاتا ہے دور ہوجاتا، مگر ترجمے کی نسبت میرا اصول جداگانہ ہے - میں اس کو خلاف دیانت سمجھتا ہوں کہ ترجمے میں دخل دے کر اصل کی صورت مسخ کردی جائے" —

ہمارے خیال میں یہ جواب بھی تمام و کمال صحیح نہیں - مثالیں اُصول کی جان ہیں، کیونکہ مثالوں ہی سے اصول اخذ کئے گئے ہیں اور پڑھنے والا جب تک مثالیں

نہ سمجھی کا اُصول کے سمجھنے میں اُسے ضرور دقت ہوگی۔ اور یہ خلاف دیانت نہیں بلکہ عین دیانت داری ہے کہ اس سے مصنف کا منشا زیادہ واضح اور صاف ہوجاتا ہے اور ترجمہ مسخ نہیں ہوتا بلکہ اس کی خوبی اور افادے میں اضافہ ہوتا ہے۔ بہر حال کام بہت اچھا ہے اور لائق قدر ہے اور امید ہے کہ جن لوگوں کو زبان کی تحقیق کا شوق ہے وہ اس کے مطالعے سے ضرور حظ اُٹھائیں گے —

کتاب مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں ٹائپ (اردو کے حروف) میں چھپی ہے۔

طرزِ امیر

(مؤلفہ جناب مولوی امیر احمد صاحب علوی، بی۔ اے، ڈپٹی کلکٹر ۔ مجسٹریٹ و جج بمقام جھانسی۔ صفحات ۱۳۰ ؛ قیمت ایک روپیہ)

مولوی امیر احمد صاحب علوی کی یہ نئی تالیف ہے۔ اس میں منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی کا منتخب کلام اور اُن کی شاعری پر تبصرہ ہے اور شروع میں مختصر سی سوانح عمری ہے۔ اگرچہ منشی صاحب صحیح خاندانی صوفیا سے تعلق رکھتے تھے اور درویش صفت آدمی تھے لیکن اودھ کی شاعری کے آخری زمانے میں شاعری کا خاص رنگ ایسا چھایا ہوا تھا کہ وہ اس سے بچ نہ سکے۔ قابل مؤلف نے اس کتاب میں اُن حضرات کے اعتراض کی تردید کی بڑی کوشش کی ہے جو لکھنؤ کی شاعری کو مبتذل کہتے ہیں نیز بڑے شد و مد سے اس خیال کی بھی تردید کی ہے کہ منشی صاحب نے آخر میں اپنی قدیم روش کو چھوڑ کر داغ کا رنگ اختیار کرلیا تھا۔ اس ضمن میں داغ اور امیر کی شاعری کا پرانا قصیدہ نکال لیا ہے اور دونوں کی ہم قافیہ و ردیف غزلیں اور ہم مضمون اشعار پیش کرکے تنقید کی ہے۔ منشی صاحب کے دامن پر جو بھرتی کے اشعار کا اعتراض تھا اُس کے جواب کی کوشش میں دوسرے نامور شاعر بھی آگئے ہیں۔ اگرچہ یہ مباحثہ اور مقابلہ بہت دلچسپ ہے لیکن ان توازنوں سے کسی ایک شاعر کی فضیلت دوسرے پر ثابت نہیں ہوسکتی۔ اصل معیار ہر شاعر کا منتخب کلام ہے اور فاضل مؤلف نے یہ بڑا اچھا کام کیا ہے کہ آخر میں منشی صاحب کا منتخب کلام درج کردیا ہے جو تقریباً کتاب کا نصف حصہ ہے۔ اس کے علاوہ یوں بھی کتاب کے ضمن میں بہت سا کلام آگیا ہے۔ اس کے مطالعے سے حضرت امیر کی شاعری کا بہت صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ مؤلف کتاب کی رائے آپ کی شاعری کے متعلق یہ معلوم ہوتی ہے:—

"منشی صاحب کے قصائد کی بابت صرف اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ خاقانی ملک حضرت ذوق دہلوی کے قصیدوں کے بعد انہیں کا درجہ ہے۔ غزلیات میں تصوف کی چاشنی تیز ہے۔ صفائی بندش کی حلاوت سے کوئی شعر خالی نہیں۔ نازک تشبیہات اور استعارات سے دیوان لبریز ہے۔ زلف و کاکل، خط و خال کی طرف اپنے ہم عصروں کی طرح کافی توجہ ہے لیکن جذبات اور واردات سے بیگانگی نہیں۔ متانت و تہذیب کے ساتھ معاملہ بندی ہے۔ رندی وسیہ مستی کے افسانے ہیں، لیکن حد اعتدال سے تجاوز نہیں۔ صحت زبان سارے دیوان کا طرۂ امتیاز ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں اشہب قلم کو جولاں دیا ہے اور قادرالکلامی کا معجزہ دکھایا ہے" —

گو یہ رائے دیوان مراۃ الغیب کے متعلق ہے۔ مگر اُن کی تمام شاعری کے متعلق سمجھنی چاہئے۔ اس میں مبالغہ ضرور ہے، لیکن امیر کے مداح اس سے کم پر کبھی راضی نہ ہوں گے —

غالب

(یعنی مرزا غالب کی زندگی اور کلام کی تنقید۔ تالیف جناب ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ بزبان انگریزی صفحات ۹۹، قیمت ۳ روپے)

کسی شاعر نے جل کے کہا تھا کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد"۔ آج اگر مرزا غالب زندہ ہوتے تو اس کتاب کو دیکھ کر ضرور کہہ اٹھتے کہ "شعر مرا بہ ڈاکٹر کہ برد" تنقید کیا ہے، اچھا خاصا پوسٹ مارٹم ہے۔ جن لوگوں نے مرزا صاحب کی شاعری کی داد دی ہے اُن سے سخت بیزار ہیں اور یہ گویا اُن کا جواب اور مرزا کی شاعری کا صحیح موازنہ ہے —

کتاب کے سات باب ہیں۔ جن میں سے کئی باب اس سے قبل کئی اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں —

پہلا باب جو نو صفحے کا ہے بطور مقدمہ کے ہے۔ اس کے شروع ہی میں فرماتے ہیں کہ غالب کے اُردو کلام کی ساری کائنات کچھ اوپر اٹھارہ سو مصرعے ہیں، جو بہت ہی قلیل ہے اور دوسرے نامور شعرا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ تاہم موجودہ نسل نے اُسے وہ درجہ عطا کیا ہے جو کسی دوسرے شاعر کو نہیں دیا"۔ ہے تو بڑی

ناانصافی! اس کے بعد انہوں نے بجنوری اور حالی کی خبر لی ہے۔ بجنوری کی تحریر کو وہ پایہ کی بہ زیادہ نہیں سمجھتے۔ رہے مولانا حالی' ان کی نسبت ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال ہے کہ وہ سوانح عمری لکھنا نہیں جانتے' ترتیب غلط' نتائج غلط' اور پھر وہ اردو شعرا میں غالب کا درجہ قائم نہیں کرسکے اور نہ غالب کی حقیقت کو پہنچے۔ اس تمام بحث کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس کام میں بہت مشکلات ہیں لہذا متعدد اہل علم مل کر یہ اہتمام کریں تو غالب کی زندگی اور کلام کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے —

دوسرے باب میں اس کام کے لئے جو سامان فراہم کرنے ہیں ان پر بحث کی ہے۔ مثلاً دیوان کے مختلف ایڈیشن' دیباچے' مثنوی اور دیگر خطوط جو انہوں نے اپنے احباب کو لکھے اور وہ خطوط جو ان لوگوں نے غالب کے نام [illegible] لکھے ہوں گے؟ [illegible] رشتہ میں [illegible] جو خاص کر [illegible] کے بعد [illegible] دہلی اور لکھنؤ اس وقت ادب کے [illegible] نے اپنی تصانیف میں غالب کا ذکر کہاں کہاں کیا۔ آپس کی تحریروں میں [illegible] کے متعلق [illegible] غالب کے [illegible] اور وہاں کے ناگوار واقعے کے متعلق اس وقت کی تحریروں [illegible] غالب کی وفات پر اخبارات وغیرہ نے جو کچھ لکھا وہ جمع کیا جائے۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے لوگوں یا اہل فن کی ادبی تعلیم اور ادبی تنقید کے اصول سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ غرض غالب پر لکھنے کے لئے اس قسم کا تمام سامان مہیا ہونا چاہئے [illegible] کی —

تیسرے باب میں یہ بحث ہے کہ یہ تمام سامان جس کا ذکر دوسرے باب میں ہے سنہ وار جمع کیا جائے اور دیوان کی بھی ترتیب زمانی ہونی چاہئے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے [illegible] صاحب کا دیوان اسی اصول پر مرتب کیا ہے جو زیر طبع ہے۔ انہوں نے اس کے چار دور قائم کئے ہیں۔ پہلے دور کا کلام بھوپال کے نسخے تک (۱۸۲۱ء)؛ دوسرے دور کا کلام جو اس نسخے کے حاشیے پر درج ہے (۱۸۲۲ - ۱۸۳۳ء)؛ تیسرے دور کا کلام جو رام پور کے نسخے میں ہے (۱۸۳۳-۱۸۵۵)؛ چوتھا دور سنہ ۱۸۵۶ - ۱۸۶۹؛ یہی تقسیم اُن کے رقعات کی بتائی گئی ہے اور ایک نقشہ دیا ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس کس کو کتنے خط لکھے گئے اور جن کا سنہ معلوم ہوسکا ہے ان کے سنہ کا بھی اشارہ کردیا گیا ہے —

چوتھے باب میں غالب کی سوانح عمری کے متعلق جو مسائل پیدا ہوتے ہیں اُن پر بحث کی ہے۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ وہی باتیں ہیں جو پہلے آچکی ہیں۔ چونکہ غالب کی شاعری پر بحث کرنے کے لئے اس بات کا جاننا ضروری ہے کہ شاعری کیا چیز ہے۔ اس لئے آپ نے انگریز مصنفین اور شعرا کی تعریفات شعر بھی

جمع کردی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ شعر کیسے کہتے ہیں اور اسی پر باب ختم کردیا ہے —

پانچویں باب میں غالب کی بعض خصوصیات کا ذکر ہے۔ مثلاً اُن کے ذاتی خصائل، ان کا مذہب، حب وطن، تصوف۔ ڈاکٹر صاحب اس بات سے بہت خفا ہیں کہ غالب کو صوفی (یا شیخ وقت) یا منجم یا محب وطن کیوں کہتے ہیں۔ کون کہتا ہے؟ ڈاکٹر صاحب ہوا سے لڑتے ہیں۔ کوئی بھی مرزا صاحب کو صوفی یا شیخ وقت نہیں مانتا، ہاں اس سے انکار نہیں کہ اُن کے کلام میں تصوف کی چاشنی ضرور ہے۔ نہ کوئی انھیں منجم یا عالم یا محب وطن خیال کرتا ہے۔ ڈاکٹر سید محمود نے اپنے ایک مقدمے میں محب وطن ثابت کیا ہے لیکن اس پر کسی نے اعتنا نہ کی اور اسے محض تفنن سمجھے۔ اس پر قابل مصنف نے وہ طومار باندھا ہے کہ خدا کی پناہ۔ اور اسی کتاب میں نہیں بلکہ اس سے قبل اخبارات اور رسالوں میں کئی لوگ خامہ فرسائی فرما چکے ہیں۔ ہماری رائے میں تو یہ محض تضییع اوقات ہے۔ یہ امر سرے سے قابل اعتنا ہی نہیں —

چھٹے باب میں شاعری کی عظمت پر بحث کی ہے اور انگریزی شعرا کے کلام کے نمونے دیے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر صاحب بہک گئے ہیں۔ اس کی ضرورت اس موقع پر مطلق سمجھ میں نہیں آئی —

ساتویں باب میں غالب کے کلام کی تنقید ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ غالب کو عمر بھر جدت کا لپکا رہا اور اس کی صرف یہی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ اپنے طرز بیان اور خیال میں جدت کا اظہار کرے۔ اس کی شاعری تمام تر معمائی ہے یعنی اس کا تعلق دماغ سے ہے نہ دل سے۔ اس نے یہ مقصد حاصل کیا مگر شاعری کو غارت کرکے۔ اس کے اردو کلام میں معمائی ہے شاعری نہیں، جذبات سے خالی اور تخیل اور خیال بلندی سے معمور ہے۔ اپنے دعوے کی تائید میں اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ کہتے ہیں کہ لوگ سمجھتے نہیں اور لفظوں کو دیکھ کر واہ واہ کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر چار شعر لکھے ہیں :—

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا
جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

اور لکھا ہے کہ ان اشعار کو پڑھ کر بعض معصوم صفت حضرات وجد میں آجاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان میں بڑا فلسفہ ہے - اس کے بعد سوال کرتے ہیں " کیا درحقیقت ان اشعار میں فلسفہ یا کوئی چیز نئی ہے " - اس سوال پر سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں کہ فلسفہ کیا ہے اور کس چیز کو کہتے ہیں ؟ پھر ان اشعار کی انگریزی میں ترجمہ کی ہے جو بعد میں پر اضافہ ہے - افسوس ہے کہ جگہ کی قلت مانع ہے ورنہ وہ نقل کرنے کے قابل ہے - پھر ایک شعر لکھا ہے —

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

فرماتے ہیں کہ اس میں سوائے لفظوں کے گورکھ دھندے کے اور کیا رکھا ہے - ایک صوفی کہے گا کہ اس میں اس کا کوئی صوفیانہ عقیدہ نہیں اور ایک منطقی کہے گا کہ اس میں منطق کا نام نہیں —

" رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو " - اس قطعے کو نقل کرکے فرماتے ہیں کہ یہ ایک مخبوط الحواس شاعر کی بہشت ہے —

غرض یہ کہ نہ اس میں دنیا کے سمجھنے کی قابلیت تھی اور نہ زندگی یا خدا کی مخلوق میں حسن کے مشاہدے کا مادہ تھا - اس نے شاعر کی حیثیت سے ہم آپ کو دھوکا دے رکھا تھا - اس کے کلام میں نہ معنویت ہے نہ تناسب ہے ' اس کی زندگی بے معنی اور بے ترتیب تھی اور وہ ایک ایسا کلام چھوڑ گیا ہے جس میں کسی قسم کا کوئی تناسب نہیں —

اس تمام کتاب میں کہیں اُردو شاعری اور اُردو شعرا سے بحث نہیں کی گئی ہے اور نہ اس کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی ذاتی رائے کا خیال معلوم ہوتا ہے - انھوں نے شاعری اور شعر کی تعریف میں سب انگریزی اقوال نقل کئے ہیں ' نمونے بھی انگریزی کلام کے دئے ہیں ' جس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے اُردو شعرا کے کلام کو مطالعہ کرنے کی کبھی زحمت نہیں فرمائی - اُردو شاعری سے غالب کو الگ کرکے بحث کرنا اور پھر اُردو شاعری میں اس کا درجہ بھی قائم کرنا ایک مجنونانہ خیال ہے - ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ غالب کے مداحوں کی تحریریں " زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کی پسند خاطر ہوئی ہیں جن کی تعلیم دیسی طریقے پر ہوئی ہے اور جن کی حس جمالیات پر مغربی ادب کی چھلمٹ تک نہیں پڑی " - بے ادبی معاف ! ہمارا بھی خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ تحریر اگر ہے تو ایسے ہی لوگوں کی دلچسپی کا موجب ہوگی جو آپ کی طرح مغربی ادب کے تو رسیا ہیں مگر اُردو شاعری اور اس کے مختلف رنگوں اور اسلوبوں اور اس کی اندرونی حقیقت اور زبان کی نزاکتوں سے بالکل کورے ہیں۔

غالب کے متعلق صحیح رائے وہی شخص قائم کرسکتا ہے جو غالب کے ہم عصروں اور اُن کے خیالات اور اس وقت کے حالات سے بخوبی واقف ہو - نیز جس نے اس عہد تک کی اُردو شاعری کا مطالعہ غور سے کیا ہو اور ساتھ ہی زبان کے عیوب و صواب اور اس کی خوبیوں اور نزاکتوں کو بخوبی سمجھتا ہو - ورنہ غالب پر کچھ لکھنا چاند پر خاک ڈالنا ہے —

بلقیس

(مصنفۂ جناب سید محمد رشید الملک صاحب - ملیح آبادی - ملنے کا پتہ :-
دفتر ملیح آباد گزٹ - ملیح آباد ضلع لکھنؤ ' قیمت فی جلد چار آنے -
حجم ۵۴ صفحات ' لکھائی ' چھپائی ' کاغذ معمولی سائز ۱۸ × ۲۲)

یہ ایک نتیجہ خیز افسانہ ہے - جس میں تعلیم نسواں کے فوائد اور نتائج دکھائے گئے ہیں - جناب مصنف کا پیرایۂ بیان مؤثر اور بہت سلیس و سادہ ہے ' زبان کی غلطیاں البتہ پائی جاتی ہیں - اور بعض جگہ طرز تحریر میں قدامت نمایاں ہے - مگر نتیجہ بہت اچھا نکلا ہے - بلقیس ایک زنانہ اسکول کھولتی ہے اور اصلاح معاشرت کا بیڑا اُٹھاتی ہے - قصہ دلچسپ اور مفید ہے —

کلیات وطن

(مرتبۂ غلام معین الدین صاحب ' یوسفی ' ملنے کا پتہ :- مکتبۂ ابراہیمیہ
اسٹیشن روڈ نام پلی حیدرآباد دکن - لکھائی چھپائی ' کاغذ عمدہ
حجم سو صفحے - سائز ۲۰ × ۳۰ - قیمت ایک روپیہ سکۂ عثمانیہ -)

یہ جناب سید افتخار علی شاہ صاحب مدنی - چشتی - قادری - صابری - متخلص بہ ' وطن ' کا مجموعۂ کلام ہے - جو اُن کے خادم و مرید جناب یوسفی نے چھپوایا ہے - شروع میں شاہ صاحب مرحوم کی تصویر اور اُن کے حالات و تبصرۂ کلام پر ایک

۲۲ صفحے کا مقدمہ بھی ہے - جو مرتب صاحب نے نہایت محنت و جانفشانی سے قلم بند کیا ہے - شاہ صاحب ایک صوفی اور اللہ والے بزرگ تھے ' ان کا تمام کلام اس رنگ سے لبریز ہے - زبان صاف اور بندش چست ہے - اگرچہ زبان میں بعض الفاظ اور ترکیبیں دکھنی اکثر ہیں ' مگر یہ اس وجہ سے قابل اعتراض نہیں کہ شاہ صاحب خود دکھنی تھے اور صرف اپنے حال کو قال کی صورت میں ظاہر کرتے تھے - عقیدت مندان ' وطن ' کے لئے خاص کر یہ مجموعہ قابل قدر اور وطن کی بہترین یادگار ہے —

مذہب و اخلاق

حزب اللہ

(مولفۂ ابوالبرکات جناب سید محمد فضل شاہ صاحب
سجادہ نشین جلال پور و امیر حزب اللہ - حجم ۱۲۳
صفحات - لکھائی ' چھپائی ' کاغذ عمدہ - سائز ۲۰ × ۲۶
قیمت اور ملنے کا پتہ کہیں درج نہیں

سید صاحب موصوف الذکر ایک پر جوش مسلمان صوفی ہیں - انہوں نے اسلام کی تبلیغ اور خدمت کا عزم بالجزم کرکے ایک جماعت سچے کارکنوں کی قائم کی ہے ' جس کا نام انہوں نے ' حزب اللہ ' رکھا ہے - یہ رسالہ اسی جماعت کے اغراض و مقاصد اور شرائط و فوائد پر قلم بند کیا ہے - شروع میں بتایا ہے کہ اس قسم کی جماعت کے قیام کی دنیا میں کیا ضرورت داعی ہوئی اور دنیا میں جو قومیں زندہ رہنا چاہتی ہیں اُن کے لئے کیا طرز عمل اختیار کرنا لازمی ہے - مسلمانوں کے لئے کونسی شاہ راہ مفید اور قابل اختیار ہے - قرآنی آیات و احادیث سے جا بجا استدلال کیا گیا ہے -

عبارت میں فصاحت اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے - اہل دین اور اپنے مذہب سے محبت و عقیدت رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں —

تحفۂ خادم خلق

(مرتبۂ و مؤلفۂ جناب سیدن صاحب خادم خلق- ملنے کا پتہ :-
گجرات پنجاب - قیمت ایک روپیہ - حجم ۱۵۲ صفحات - لکھائی ‘
چھپائی ‘ کاغذ معمولی - تقطیع ۱۸ × ۲۲

مؤلف صاحب جلال پور کی جماعت حزب اللہ سے تعلق رکھتے ہیں - اسی سلسلے میں انہوں نے ایسے رسالے وقتاً فوقتاً شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے جو اخلاقی و مذہبی طور پر مفید ہوں اور یہ رسالہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے - خدا ‘ وحدانیت ‘ برکات روحانی ‘ وجود باری پر استدلال ‘ ہمت ‘ جفاکشی وغیرہ مختلف عنوانات قائم کرکے اُن پر بحثیں کی ہیں - مختصر نظمیں اور غزلیں بھی کہیں کہیں ہیں ‘ غرض چھوٹے چھوٹے اخلاقی و مذہبی مضامین کا ایک کشکول ہے - مسلمانوں کے لئے اس قسم کے رسالوں کے سود مند ہونے میں شک نہیں —

تعلیم

۱

اُردو کا قاعدہ

مرتبۂ قومی کتب خانہ - ریلوے روڈ لاہور - حجم ۲۰ صفحے
سائز چھوٹا - کاغذ رنگین اور موٹا - قلم واضح - قیمت سوا آنہ

اُردو کا یہ قاعدہ محمد نصیر صاحب ہمایوں بی - اے نے چھپوایا ہے - قلم جلی

اور واضح ہے ۔ عام قاعدوں سے کوئی خاص بات اس میں نہیں ہے' البتہ مختصر ہے خط اور کاغذ دونوں اچھے اور موزوں ہیں —

مبادیء نباتات

(مؤلفہ جناب جگ موہن لال صاحب' بی' ایس' سی' ایل' ٹی
صفحات ۱۰۳ ' قیمت ایک روپیہ ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ' حیدرآباد دکن)

علم نباتات پر یہ ابتدائی رسالہ کار آمد معلوم ہوتا ہے ۔ قابل مؤلف نے کوشش کی ہے کہ مطالب صاف زبان میں ادا کئے جائیں اور جہاں تک ممکن ہو اصطلاحات زیادہ نہ آنے پائیں ۔ شکلیں بھی دی ہیں اور تصویروں کو تصویر کے ساتھ اشکال میں بھی دکھایا گیا ہے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ بلاکوں کے چھاپے میں یہ چیزیں اچھی نہیں آئیں ۔ چھپائی بھی زیادہ اچھی نہیں۔ ابتدائی کتابوں کی چھپائی لکھائی اچھی ہونی چاہئے۔

تاریخ و معاشیات

وقائع عالم گیر

(مرتبۂ جناب چودھری نبی احمد صاحب سندیلوی ۔
مجلد ۔ صفحات تقریباً ۲۵۰ ۔ قیمت دو روپے ۔
انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد سے مل سکتی ہے)

عالم گیر کے متعلق عجیب اختلاف ہے' ایک گروہ تو اُسے ظالم' جابر' متعصب تنگ نظر اور تنگ دل کہتا ہے اور دوسرا اُسے اولیاء اللہ میں شمار کرتا ہے ۔ دونوں

اپنی راہ میں اعتدال سے گزر گئے ہیں ۔ چودھری نبی احمد صاحب نے تاریخی لحاظ سے بہت اچھا کام کیا ہے ۔ جس سے بعض غلط فہمیاں خود بخود رفع ہوجاتی ہیں ۔ انہوں نے خود عالمگیر ہی کے رقعات لئے ہیں اور اُن سے اس کے خصائل و عادات اور اس کا طرز انتظام دکھایا ہے ۔ ہر رقعہ یا فرمان کے ساتھ قابل مولف نے تمہید کے طور پر اُردو میں واقعۂ متعلقہ کا خلاصہ لکھ دیا ہے ۔ جس سے رقعہ یا فرمان کے سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے ۔ رقعات میں جو جو نام اشخاص یا مقامات کے آئے ہیں ' اُن کے متعلق بہت مفید تاریخی حاشیے لکھ دیے ہیں ۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر کس قدر باخبر ' نیز فطرتاً سخی ' عفو کرنے والا ' قواعد اور قانون کی سختی سے پابندی کرنے والا ' عادل اور بے لوث تھا —

کتاب کے ساتھ ایک سو چار صفحے کا ضمیمہ بھی ہے ' جو تاریخی معلومات کا مخزن ہے ۔ اس میں مختصر طور پر شاہجہاں ' اورنگ زیب عالمگیر ' داراشکوہ ' کام بخش ' شہزادہ معظم ' شاہزادہ اعظم اور عالمگیر کے بعض امرے عظام کے حالات ہیں ۔ اس کے بعد عالمگیر کے مدارالمہاموں کا تذکرہ ہے ۔ اس ذکر کے بعد عالمگیری امراے ملوک کی فہرست مع منصب و خدمات و دیگر مختصر حالات کے درج ہے ۔ پھر ایک فہرست صوبجات مع آمدنی دی ہے ۔ اس کے بعد اس عہد کی اصلاحات کی ایک فہرست ہے ۔ سب سے آخر میں مذہبی رواداری کے متعلق چند بیانات ہیں —

فاضل مؤلف نے ایک تاریخی خدمت کی ہے ' جو قابل شکرگزاری ہے ۔ اگرچہ اپنی تحریر میں ایک آدھ مقام پر غالباً بعض بے باک مصنفوں پر چوٹ کر گئے ہیں ' لیکن کہیں کوئی ایسی بات ان کی قلم سے نہیں نکلی جو دائرۂ پایۂ تہذیب سے خارج ہو ۔ کتاب مخالفین اور موافقین دونوں کے مطالعے کے قابل ہے

هندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کے معاشرتی حالات

(سلسلۂ لکچر ہندوستانی اکاڈیمی از جناب علامہ عبدالله یوسف علی صاحب سی ۔ بی ۔ ای ' ایم ۔ اے ' ایل ایل ۔ ایم ۔ صفحات ۱۱۴ قیمت ایک روپیہ)

هندوستانی اکاڈیمی (صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ) کا مقصد ہندی اور اردو زبانوں کے ادبوں کو ترقی دینا ہے ۔ اس مقصد کے حصول کے لئے منجملہ دیگر ذرائع کے

ایک ذریعہ لکچروں کا سلسلہ ہے۔ چنانچہ یہ کتاب اُن لکچروں کا مجموعہ ہے ' جو علامہ عبداللہ یوسف علی نے اس اکاڈیمی کی سرپرستی میں دیے ۔ فاضل مقرر نے ہندوستان کا ازمنۂ وسطیٰ راجہ ہرش کے انتقال یعنی تقریباً ساتویں صدی کے وسط سے سلطنت مغلیہ کے قیام یعنی تقریباً سولہویں صدی کے وسط تک قرار دیا ہے —

پہلا لکچر تمہیدی ہے ۔ دوسرا لکچر ساتویں صدی کے معاشرتی اور اقتصادی کوائف پر ہے ۔ تیسرے لکچر میں دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی اور چوتھے لکچر میں چودھویں صدی کی معاشرتی خصوصیات ہیں —

ان لکچروں میں فاضل لکچرار نے مستند عربی' انگریزی کتابوں سے مدد لی ہے اور ان کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد اس زمانے کے ہندوستان کی ' معاشرتی ' ادبی اور انتظامی حالات اور کوائف دو بڑی خوبی سے سلسلہ وار بیان کیا ہے ۔ اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو مستند قاعدہ طور پر اس طرح مرتب کی گئی ہے ۔ یہ لکچر بہت دلچسپ اور مفید ہیں اور صاف زبان میں ادا کئے گئے ہیں ۔ علامہ عبداللہ یوسف علی ایک نامور ادیب اور وسیع النظر فاضل ہیں ۔ اکاڈیمی بھی قابل تعریف ہے کہ اس نے ان سے یہ کام لیا ۔ لکچر اگرچہ مختصر ہیں مگر کام کے ہیں ۔ اکاڈیمی کی یہ پہلی کتاب ہے جو شائع ہوئی ہے ۔ امید ہے کہ اس کی سرپرستی میں ایسے بہت سے مفید کام ہونگے ...

متفرقات

آل پارٹیز کانفرنس کی رپورٹ

(اردو ترجمہ جو مکتبۂ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دہلی نے شائع کیا۔ صفحات ۲۰۸ قیمت ایک روپیہ چار آنے - تکملۂ رپورٹ قیمت ۸ آنے)

اس رپورٹ پر جو نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہے ' اس قدر بحث ہو چکی ہے کہ اب اس پر کچھ لکھنا لا حاصل ہے - اس رپورٹ کا نتیجہ کچھ بھی ہو لیکن یہ پڑھنے

کے قابل ہے کیوں کہ یہ پہلا دستور ہے جو ایک موثر مجلس نے ملک کی حکومت کے لئے مرتب کیا ہے ۔ مکتبۂ جامعۂ ملیہ کے کارکن قابل شکر گزاری ہیں کہ انہوں نے ایسا اچھا ترجمہ اس قدر جلد شائع کردیا اور کانگریس کے اجلاس سے بہت قبل اردو خواں طبقے تک پہنچا دیا —

مادر ہند

(اردو ترجمہ مدر انڈیا ، مصنفۂ مس میو ، از خالد کے ۔ بیگ ۔ جلد دوم
مطبوعۂ مطبع یوسفی فرنگی محل، لکھنو ۔ قیمت ایک روپیہ)

مس میو کی کتاب اس قدر شہرت پا چکی ہے اور اس کے اس قدر پر زور اور دنداں شکن جواب لکھے جاچکے ہیں کہ اب اس پر کچھ لکھنا فضول ہے ۔ لیکن یہ کتاب ہندوستانیوں کے پڑھنے کے قابل ہے اور ضرور پڑھنی چاہئے ۔ لکھنے والے کی نیت خراب ہو مگر اس میں اکثر واقعات صحیح ہیں ۔ جنھیں پڑھ کر اپنی حالت پر شرم آتی ہے ۔ اس کتاب کے مطالعے سے ہمیں بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو اب تک ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھیں ۔ جواب لکھنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم اپنی برائیوں کی اصلاح کریں —

فارسی بلگرام

لکچر از مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی مددگار معتمد
عدالت و کوتوالی و امور عامہ حیدرآباد دکن ۔ حجم ۵۶ صفحات ۔
لکھائی ، چھپائی ، کاغذ متوسط ۔ سائز ۱۸ × ۲۲ ۔ قیمت چھ آنے

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ۔ فارسی زبان میں ایک لکچر ہے ۔ جو جناب سید علی اصغر صاحب نے بلگرام کے فارسی ادب پر دیا ہے ۔ بلگرام ایک زمانے

تک ہندوستان میں گہوارۂ علم و ادب اور علما و شعراء، ادباء کا مولد رہا ہے۔ یہاں بڑے بڑے نامور شاعر، مصنف، علماء پیدا ہوئے اسی وجہ سے خطۂ بنگالہ یونانِ ہند کہا جاتا ہے۔ اب اگرچہ اس کی عظمت برائے نام رہ گئی ہے پھر بھی موجودہ زمانے میں اس نے اچھے اچھے لوگ پیدا کئے۔ یہاں فارسی ادب کے دونوں شعبوں نظم و نثر کے بڑے بڑے نامور علمبردار گزرے ہیں ان کے مختصر حالات اور تاریخ پر یہ اکثر مشتمل ہے۔ حیدرآباد کے شعبہ جامعہ معارف کے ایک جلسے میں پڑھا گیا تھا —

رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ*

متعلق اجلاس چہلم

سنہ ۱۹۲۷ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا چالیسواں اجلاس مدراس میں زیر صدارت جناب سر شیخ عبدالقادر ہوا تھا۔ یہ اس کی مکمل رپورٹ ہے۔ ضمیمے میں جسٹس شاہ سلیمان صاحب کا طویل خطبہ بھی درج ہے جو شعبۂ معاشرت کے صدر تھے —

جدید رسالے

فردوس

(ایڈیٹر جناب شیخ غلام مصطفیٰ صاحب حیرت۔ ملنے کا پتہ:- کوچۂ چابک سواراں لاہور۔ حجم ۴۰ صفحے لکھائی چھپائی متوسط، کاغذ معمولی، سائز ۱۸ × ۲۲۔ قیمت سالانہ ایک روپیہ آٹھ آنے۔ فی پرچہ چار آنے)

یوں تو یہ رسالہ تین سال سے نکل رہا ہے۔ مگر ہمیں ریویو کے لئے جو پرچہ موصول ہوا ہے وہ تیسری جلد کا چھٹا نمبر ہے۔ یعنی بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء۔ اس دوران میں اس نے بہت سے انقلابات کا مقابلہ کیا۔ ایڈیٹر صاحب کو بہت سی

پرچا نہیں کا سامنا رہا - لیکن یہ سخت جان زندہ رہا اور ہے - شذرات کے بعد سب سے پہلے غزلیں اس میں جگہ پاتی ہیں ' اور پھر دو ایک افسانوں اور ادب لطیف کے چند نمونوں اور غزلوں کے بعد یہ ختم ہوجاتا ہے - غزلیں اور مضمون متوسط درجے کے ہیں۔

کیمیا

(ایڈیٹر سید عشرت حسین صاحب ' نقوی ' ملنے کا پتہ :- نمبر ۱۳۳ امین آباد لکھنؤ - لکھائی چھپائی متوسط - کاغذ معمولی - سائز اردو رسالے کا - حجم ۷۲ صفحے - قیمت سالانہ چار روپے - فی پرچہ آٹھ آنے)

شکر ہے کہ ادب اُردو سے دلچسپی رکھنے والوں میں اب عملی فنون اور کار آمد ادب کا مذاق پیدا ہو گیا ہے - اور اہل قلم حضرات بھی اِدھر متوجہ ہو رہے ہیں - یہ رسالہ لکھنؤ سے ملک کے نامور ادیب و اخبار نویس جناب سید جالب دہلوی ایڈیٹر روزنامۂ ہمدم کی نگرانی میں نکلنا شروع ہوا ہے - پیش نظر رسالہ اس کا دوسرا نمبر اور جون سنہ ۱۹۲۸ ع کا ہے - اس میں اکثر مضامین مفید اور کار آمد ہیں - ہندوستان میں کاروباری زندگی بسر کرنے والوں کو مفید مشورے دیے گئے ہیں ' عملی تجاویز بتائی گئی ہیں - مضامین عام فہم اور سلیس زبان میں ہیں —

رسالۂ اردو کے خریداروں کے ساتھہ خاص رعایت

رسالہ اُردو کے خریداروں کو انجمن ترقی اردو کی شایع کی ہوئی کتابیں فی روپیہ چار آنے کمی قیمت کے ساتھہ دی جائیں گی ۔ امید ہے کہ ناظرین اس رعایت سے فائدہ اٹھائیں گے ۔

دیگر مقامات کی کتابیں جو بطور ایجنسی انجمن میں فروخت ہوتی ہیں ان کی قیمتوں میں کوئی کمی نہیں کی جا سکتی —

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

اپنے ان مہربان معاونین کی فہرست مرتب کر رہی ہے جو اس بات کی علم اجازت دیدیں کہ آئندہ جو کتاب انجمن سے شائع ہو ' وہ بغیر ان سے دوبارہ دریافت کئے تیار ہوتے ہی ان کی خدمت میں بذریعہ وی پی روانہ کردی جایا کرے ۔ ہمیں اُمید ہے کہ قدردانان زبان اردو ہمیں عام طور پر اس قسم کی اجازت دیدیں گے کہ ان کے اسمائے گرامی اس فہرست میں درج کر لئے جائیں اور انجمن سے جو نئی کتاب شایع ہو فوراً بغیر دوبارہ دریافت کئے روانہ کر دی جایا کرے ۔ یہ انجمن کی بہت بڑی مدد ہوگی اور آئندہ اسے نئی نئی کتابوں کے طبع کرنے میں بڑی سہولت ہوجائے گی ۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے معاونین جو اردو کی ترقی کے دل سے بہی خواہ ہیں اس اعانت کے دینے میں دریغ نہ فرمائیں گے —

ان معاونین کی خدمت میں کل کتابیں جو آئندہ شائع ہوں گی وقتاً فوقتاً چوتھائی قیمت کم کر کے روانہ ہوں گی —

المشتہر

انجمن ترقی اردو ۔ اورنگ آباد (دکن)

انجمن کے مطبوعات

—— (ذکر میر) ——

ہندوستان میں کوئی ایسا صاحب ذوق ہوگا جو اُردو کے خدائے سخن حضرت 'میر' کے نام اور کلام سے نا آشنا ہو ان کے کلام کا پاکیزہ انتخاب عرصہ ہوا کہ انجمن نے شائع کیا تھا جو ملک میں بہت مقبول ہوا - اور کئی بار چھپ چکا ہے - اب خاص اہتمام سے میرصاحب کی یہ نادرۂ روزگار سوانح عمری طبع کی گئی ہے - جو خود انہیں کے پر سوز و گداز قلم کی تراوش ہے - جس میں انہوں نے اپنے حالات زندگی اور اس وقت کی فضا نیز آخری دور مغلیہ کی تصویر نہایت دل کش انداز سے کھینچی ہے - اور انجمن نے اپنے مخصوص و خوش نما ٹائپ میں چھاپی ہے - شروع میں جناب مولوی عبدالحق صاحب مد ظلہٗ معتمد انجمن کا مقدمہ بجائے خود قابل دید اور کتاب کی جان ہے - جلد خوب صورت دیدہ زیب' حجم ۱۸۰ صفحے قیمت دو روپے —

—— (بزم مشاعرہ) ——

گذشتہ ماہ تیر (مئی و جون) میں عالی جناب مہاراجہ کشن پرشاد 'شاد' مدظلہ العالی صدر اعظم دولت آصفیہ دکن نے اورنگ‌آباد میں شرف ورود فرمایا تھا - جناب معظم کی تشریف آوری پر اور دل چسپ ہنگاموں کے علاوہ ایک نہایت پرتکلف' دل فریب مشاعرہ بھی حضرت موصوف کی صدارت میں بمقام ملبرہ ہوا - اس مشاعرے کا گلدستہ نہایت خوش نما' نظر فریب دو رنگوں میں طبع کیا گیا ہے - شروع میں جناب صدر مد ظلہ کی پاکیزہ تصویر اور جناب معنوی صدیقی کے قلم کا دل پذیر دیباچہ بھی ہے - سر ورق بھی خوب صورت اور شاندار ہے - آخر میں وہ قصائد بھی شامل کردیے گئے ہیں جو اورنگ‌آباد کالج میں پڑھے گئے تھے - نفاست پسند ارباب ذوق کے لئے بہت تھوڑی تعداد میں یہ گلدستہ طبع ہوا ہے - جلد منگوائیے قیمت آٹھ آنے —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

———(تاریخ اخلاق یورپ)———

اس کتاب کے اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم ، تبحر ، تحقیق و صداقت کا مرادف ہے - یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن - اصول اخلاق - مذاہب و خیالات کا مرقع ہے - مترجمہ مولوی عبدالماجد صاحب بی - اے' جلد اول مجلد ۳ روپے جلد دوم مجلد دو روپے' ۸ آنے —

———(ہماری شاعری)———

مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب' ایم - اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی نے رسالۂ اُردو میں شاعری پر ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جو عام طور پر بہت پسند کیا گیا تھا اب رضوی صاحب نے اس میں بہت کچھ اضافہ کرکے کتابی صورت میں کردیا ہے - اور انجمن ترقی اُردو نے اسے نہایت عمدہ طور پر یورپی کتاب دو رنگوں میں (لکھنؤ میں) طبع کرائی ہے - پورے کپڑے کی خوشنما جلد ہے - حجم دو سو صفحے' قیمت دو روپے —

———(کلیات ولی)———

ولی دکنی کے نام سے کون اُردو داں واقف نہ ہوگا - اسے اُردو شاعری کا باوا آدم کہتے ہیں اور یہی گویا ہماری شاعری کا قدیم اور ممتاز ترین علم بردار ہے - اس کا کلام اس زمانے کی زبان اور شاعری کا بہترین اور کامل مرقع ہے —

یہ کلیات جناب ' احسن ' مارہروی نے نہایت محنت اور قابلیت سے مرتب کیا ہے - اور انجمن ترقی اردو کے جدید ترین مطبوعات میں ہے - اب تک ولی کے جو دیوان کہیں کہیں چھپے اور ملتے ہیں - اکثر غلط اور نامکمل ہیں - یہ کلیات ۱۷–۱۸ قدیم' قلمی' نایاب نسخوں سے مقابلہ اور تصحیح کرکے کئی سال کی لگاتار محنت و کاوش سے مرتب کیا گیا ہے —

اس قادرالکلام اُستاد کا کلیات تقریباً تمام اصناف سخن پر حاوی اور چار سو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے - شروع میں مرتب صاحب کا ایک بسیط اور قابل قدر مقدمہ ہے جس میں موصوف نے صاحب دیوان کے حالات و سوانح نہایت تحقیق اور کمال محنت سے فراہم کرکے جمع کئے ہیں اور کلام پر تبصرہ بھی فرمایا ہے -

کلیات کے آخر میں ایک بسیط فرہنگ ہے جس میں ان تمام قدیم' متروک' اجنبی' ہندی' دکنی الفاظ کا حل ہے جو کلام ولی میں جا بجا آئے ہیں - آخر میں پونے دو سو صفحے کا ایک ضمیمہ اختلاف نسخ ہے جو نہایت محنت و عرق ریزی سے مرتب کیا گیا ہے اس میں تمام نسخوں سے مقابلہ کرنے پر جو جو اختلاف نظر آیا ہے' دیوان کی

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

ہر غزل کے نمبر کا حوالہ دے کر بتادیا ہے - یہ ضمیمہ ارباب فن و تحقیق کے لئے خاص طور سے قدر کی چیز ہے - اور کئی ماہ کی مسلسل محنت سے تیار ہوا ہے - ان تمام خوبیوں کے علاوہ انجمن نے اپنے مشہور عمدہ ٹائپ میں مضبوط سفید چکنے کاغذ پر طبع کیا ہے ' قابل دید اور اس لائق ہے کہ ہر لائبریری اور قدر دانان اردو کے ہر کتب خانے میں اس کا ایک ایک نسخہ موجود رہے - حجم تقریباً آٹھ سو صفحات ' قیمت مجلد ۵ روپے غیر مجلد ۴ روپے —

—— (مثنوی خواب و خیال) ——

حضرت میر درد دہلوی (رح) کے چھوٹے بھائی میر اثر کی یہ لاجواب مثنوی نایاب تھی ' بہت کوششوں کے بعد بھی پتہ نہ چلتا تھا ' اُردو کی خوش نصیبی سے انجمن ترقی اردو کو دستیاب ہوگئی ' اور اب خاص اہتمام کے ساتھ عمدہ ٹائپ میں اعلیٰ درجے کے کاغذ پر ' طبع کی گئی ہے ' جس پر انجمن کے فاضل معتمد جناب مولوی عبدالحق صاحب نے ایک زبردست ناقدانہ مقدمہ تحریر فرما کر اس مثنوی کے خصوصیات اور محاسن کو نمایاں کیا ہے - یہ نادر مثنوی آج تک ناپید تھی ' تذکروں میں کہیں کہیں اس کا ذکر آ جاتا ہے' حضرت میر درد کے اشعار اور کلام کے علاوہ اس میں مصنف کی غزلیں بھی جا بجا آ ئی ہیں ' جو قابل دید اور نہایت لطیف و پاکیزہ ہیں - یہ مثنوی اُردو میں ایک قابل قدر اضافہ اور انجمن کی طرف سے قدر دانان اردو کی خدمت میں اس سال کا جدید علمی ہدیہ ہے' جلد بھی مضبوط عمدہ اور جدید طرز کی بنوائی گئی ہے - حجم دو سو صفحے سے زائد ' قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ —

—— (انتخاب کلام میر) ——

ملک الشعرا میر تقی میر کے نام اور کلام سے کون قدر دان اردو واقف نہیں ' یہ انہیں کے کلام کا بہترین انتخاب ہے - جو جناب مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سارے کلیات کا عطر کھینچ لیا ہے ' یہ انتخاب ملک میں بہت مقبول ہو چکا ہے اور کئی یونیورسٹیوں نے اپنے نصاب تعلیم میں شامل کر لیا ہے —

مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اب تیسری بار انجمن ترقی اردو پریس نے اپنے مشہور ' نفیس ٹائپ میں چھاپکر شائع کیا ہے - کاغذ چکنا ' نہایت عمدہ' حجم دو سو صفحات سے زیادہ ' جلد نفیس اور مضبوط - شروع میں فاضل مرتب کا زبردست و دلچسپ مقدمہ ہے ' قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

(قواعد اردو)

یہ کتاب جناب معتمد صاحب انجمن ترقی اُردو کی بیش بہا تالیف ہے، اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ زبان اُردو کے قواعد پر اب تک اس سے بہتر، سہل، جامع کتاب تصنیف نہیں ہوی - ملک میں بیحد پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی اور نہایت مقبول ہوی - جامعۂ عثمانیہ کے نصاب ایف اے میں داخل ہے - اب جناب مولف و مرتب کی بیحد کاوش، اور غور سے نظر ثانی، ترمیم و اضافہ کے بعد دوبارہ چھاپی گئی ہے - شروع میں اُردو زبان اور اس کے ادب پر ایک جواب بسیط مقدمہ بجائے خود قابل دید ہے۔ انجمن نے اپنے پریس میں، عمدہ ٹائپ میں چھپوائی ہے، کاغذ بہت عمدہ جلد نہایت نفیس اور مضبوط، قیمت مجلد دو روپے ۸ آنے —

(جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق)

سرکار نظام نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ممالک محروسۂ سرکار عالی و جاپان کے تعلیمی نظام کے مطالعے اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا۔ نواب صاحب موصوف نے وہاں رہ کر اس عجیب و غریب ملک کے حالات اور خاص کر تعلیمی نظم و نسق کو نہایت غور اور تحقیق سے مطالعہ فرمایا - کتاب کے ابتدائی حصے میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فاضلانہ بحث کی ہے - جو ہمارے اہل وطن کے لئے سبق آموز ہے - اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ہے - ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے جو علاوہ دلچسپ ہونے کے پراز معلومات بھی ہے- خاص کر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے جو ملک کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں - حجم ۴۸۲ صفحے - قیمت فی جلد مجلد ۳ روپے —

(سرگذشت حیات (یا) آپ بیتی)

اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نشو و نما کی داستان نہایت دلچسپ طرز پر بہت ہی سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے- حیات کی ابتدائی حالت سے لیکر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ہے اور تمام تاریخی مدارج کو اس سہل طریقے سے بتایا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سمجھہ سکے اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آگئی ہے مگر بیان کی سلاست میں فرق نہیں آیا - یہ کتاب جدید معلومات سے لبریز ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا لازم ہے (حجم ۳۰۰ صفحے) قیمت فی جلد مجلد ۲ روپے ۸ آنے —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

—— (تذکرۂ شعرائے اُردو) ——

مؤلفہ میر حسن دہلوی - میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں - اُن کی مثنوی 'بدر منیر' کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اُردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو - یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ہے - یہ کتاب بالکل نایاب تھی' بڑی کوشش سے بہم پہنچا کر طبع کی گئی ہے - میر صاحب کا نام اس تذکرے کی کافی شہادت ہے - اس پر مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے جو قابل پڑھنے کے ہے - قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۴ آنے غیر مجلد ایک روپیہ ۹ آنے —

—— (تاریخ تمدن) ——

سر ٹامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے - الف سے (ی) تک تمدن کے ہر مسئلے پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے - اس کے مطالعے سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے - حصۂ اول غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنے - مجلد دو روپے - حصۂ دوم مجلد دو روپے ---

—— مقدمات الطبیعیات ——

یہ ترجمہ ہے مکر انگلستان کے مشہور سائنس داں حکیم ہکسلے کی کتاب کا جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے - اس میں بظاہر فطرت کی بحث درج ہے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے - قیمت غیر مجلد ۲ روپے - مجلد ۲ روپے ۸ آنے —

—— (القول الاظہر) ——

امام ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف (فوز الاصغر) کا اُردو ترجمہ ہے - یہ کتاب فلسفۂ الٰہیات کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انہیں اصول کو منطبق کیا ہے - قیمت غیر مجلد ۸ آنے - مجلد ایک روپیہ —

—— (القمر) ——

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

جدید انکشافات ہوئے ہیں ، ان سب کو جمع کردیا ہے - طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے - قیمت غیر مجلد ۱۰ آنے مجلد ایک روپیہ —

—— (فلسفۂ تعلیم) ——

ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلۂ تعلیم کی آخری کتاب ہے - غور و فکر کا بہترین کارنامہ - والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت - تربیت کے قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے - اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے - قیمت مجلد ۲ روپے - غیر مجلد ایک روپیہ ۱۲ آنے —

—— (دریائے لطافت) ——

ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہے - اردو صرف و نحو اور محاورات اور الفاظ کی پہلی کتاب ہے، اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں - قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنے مجلد ۲ روپے —

—— (طبقات الارض) ——

اس فن کی پہلی کتاب ہے - (۳۰۰) صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند کئے ہیں - کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مترادفات کی فہرست بھی منسلک ہے - قیمت غیر مجلد ۲ روپے - مجلد دو روپے ۸ آنے —

—— (مشاہیر یونان و روما) ——

ترجمہ ہے - سیرت نگاری اور انشا پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے - ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمے سے فیض حاصل کیا ہے - وطن پرستی اور بے نفسی عزم و جواں مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے - قیمت جلد اول غیر مجلد ۳ روپے - مجلد ۴ روپے جلد دوم مجلد ۲ روپے ۸ آنے —

—— (اسباق النحو) ——

ملک کے ادیب کامل مولانا حمید الدین صاحب بی - اے کی تالیف ہے - اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے - قیمت حصۂ اول غیر مجلد ۹ آنے - حصۂ دوم مجلد ۴ آنے —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

—————(علم المعیشت)—————

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم - اے نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے - معیشت پر یہ کتاب جامع ومانع ہے - مبہم و مشکل مسائل کو پانی کردیا ہے ' اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں - اشتراکیت کا باب قابل دید ہے' حجم ۸۸۵ صفحے ' قیمت مجلد ۵ روپے آٹھ آنے —

————— تاریخ یونان)—————

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ - اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے - ایف اے کلاس کے طلبا جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں ' اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے قیمت مجلد ۲ روپے —

—————(رسالۂ نباتات)—————

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے - علمی اصلاحات سے معرا - طلبائے نباتات جس مسئلے کو انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اس رسالے میں مطالعہ کریں - قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے —

—————(دیباچۂ صحت)—————

اس کتاب میں مطالبات صحت پر مثلاً (ہوا ' پانی ' غذا ' لباس ' مکان وغیرہ مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے - زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دلپذیر ہے' ملک کی بہترین تصنیف ہے - اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا - حجم ایک ہزار صفحے - قیمت مجلد چار روپے —

—————(نکات الشعراء)—————

یہ اُردو کا تذکرہ استادالشعرا میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہے - اس میں بعض بعض شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں - نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں- مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدرالصدور امور مذہبی سرکار عالی نے اس پر ایک عالمانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے - قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں -

(فلسفۂ جذبات)

کتاب کا مصنف هندوستان کا مشہور نفسی ہے - جذبات کے علاوہ ناس کی هر ایک کیفیت پر نہایت ایمانت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہے - معلمان تعلیمات اسے مفید پائیں گے - قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے - غیر مجلد دو روپے —

(وضع اصطلاحات)

یہ کتاب ملک کے نامور انشا پرداز اور عالم مولوی وحیدالدین سلیم مرحوم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعے کے بعد تالیف کی ہے بقول فاضل مؤلف " یہ بالکل نیا موضوع ہے - میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی زبان میں" - اس میں وضع اصطلاحات کے هر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں - مخالف و موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی ' مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے سابقوں اور لاحقوں - اُردو مصادر اور ان کے مشتقات - غرض سیکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آ گئی ہیں - اُردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں - لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کردی ہیں - اور ہمارے حوصلے بلند کردیے ہیں - اس سے پہلے ہم اُردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اس کی آئندہ ترقی کے متعلق دعوی کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے - مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا - اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے - تعداد صفحات (۳۰۵) قیمت مجلد تین روپے ۱۲ آنے —

(محاسن کلام غالب)

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا معرکۃالآرا مضمون ہے - اُردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے - جو اس شان کی لکھی گئی ہے - یہ مضمون اُردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا - صاحب نظر قدر دانوں کے اصرار سے الگ بھی طبع کیا گیا ہے - قیمت مجلد ایک روپیہ

(ملل قدیمہ)

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے - اس میں بعض قدیم اقوام ' سلطنت کلدانی ' اسوری ' بابل - بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت - عقائد - او صنعت و حرفت وغیرہ

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھ دیے ہیں - اردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہو سکیں اس لئے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے - حالات کی وضاحت کے لئے جابجا تصویریں بھی دی گئی ہیں - صفحے ۲۸۴ قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے —

——(بجلی کے کرشمے)——

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی' اے - نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعے کے بعد لکھی ہے - برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی گئی ہے - ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے کہاں سے آتی ہے' کیا کام آسکتی ہے - یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے - لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے بھی مفید ہے - قیمت ایک روپیہ بارہ آنے —

——(البیرونی)——

مصنفۂ مولوی سید حسن برنی صاحب بی اے - اس کتاب میں علامۂ ابوریحان بیرونی کے سوانحی حالات ہیں اور ان کی مشہور و معروف تصنیف کتاب الہند اور دیگر تصانیف پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے - یہ کتاب انجمن ترقی اردو میں باقی نہیں رہی تھی اب دوسرا ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی اور اضافۂ مضامین کے ساتھ نہایت عمدہ کاغذ پر چھپ کے تیار ہوا ہے - قیمت فی جلد مجلد دو روپے - غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ —

——(تاریخ ہند)——

ہندوستان کی یہ تاریخ مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے محکمۂ تعلیمات سرکار نظام کی فرمایش پر لکھی ہے اور مڈل اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے - اس وقت تک کوئی اور مختصر تاریخ ہند اس نقطۂ نظر اور ایسی خوبی سے نہیں لکھی گئی ہے - تعلیمی حلقوں کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اسے بہت پسند کیا ہے - چھوٹی سائز کے ۲۸۴ صفحے - قیمت ایک روپیہ ایک آنہ —

——(لغت اصطلاحات علمیہ)——

— جملہ اہم علوم کی اصطلاحوں کا ترجمہ ' جس میں حسب ذیل علوم داخل ہیں:

Astronomy , Botany ' Economics, History, (Constitutional,Greece

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

England etc, Logic, Algebra, Conics, Solid Geometry, Trigonometry, Differential Equations, Statics, Metaphysics, Psychology, Physics, Political Science, Archæology, Biology.

کئی سال کی مسلسل محنت اور مختلف ماہرین فن و ماہرین لسان کی کاوش و کوشش کا نتیجہ ہے - مصنفین و مترجمین کے لئے نا گزیر ہے —

حجم ۵۰۸ صفحے - قیمت مجلد چھ روپے —

یہ بیش بہا کتابیں بھی انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہیں

—— (دیوان غالب جدید و قدیم) ——

یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بے حد انتظار تھا - اس میں مرزا غالب کا قدیم و جدید تمام کلام موجود ہے - مرزا صاحب کا قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھ آ گیا اور ریاست بھوپال کی سرپرستی میں چھپ کر شائع ہوا ہے - مع مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم مجلد ۵ روپے غیر مجلد ۴ روپے (بلا مقدمہ مجلد ۳ روپے ۸ آنے - غیر مجلد دو روپے ۸ آنے) —

—— (حقیقت اسلام) ——

یہ کتاب جناب نواب سر امین جنگ بہادر ' کے ' سی ' آئی ' ای ' سی ' ایس ' آئی ' ایم ' اے ' بی ' ایل ' ایف ' آر ' ایس ' چیف سکریٹری گورنمنٹ نظام و صدر المہام پیشی کی بے نظیر تصنیف نوٹس آن اسلام کا بامحاورہ اور سلیس ترجمہ ہے - اس کتاب میں مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھ موجودہ خیالات سائنس سے اسلام کی تطبیق اور اس کی صداقت کا بیان کیا ہے - فاضل مصنف نے ان تمام مشکل مسائل کی حقیقت کو جن میں اکثر تعلیم یافتہ جوانوں یا غیر مسلموں کو شبہات واقع ہوتے ہیں ' زمانہ حال کے ترقی یافتہ خیالات کی روشنی میں نہایت دلاویز طریقے اور حکیمانہ استدلال سے بیان کیا ہے جس سے مصنف ممدوح کے وسیع مطالعہ ' فلسفیانہ طبیعت اور غور و خوض کا پتہ ملتا ہے —

کتاب بہت عمدہ کاغذ پر چھپی ہے - مجلد بارہ آنے میں مل سکتی ہے —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

——(تاریخ زوال روما)——

یہ گبن کی مشہور تاریخ کے ابتدائی (۷) ابواب کا ترجمہ ہے - اصل کتاب اپنی خوبیوں کے اعتبار سے محتاج تعریف نہیں - قیمت فی جلد غیر مجلد سوا روپیہ —

——(تاریخ عرب)——

مصنفۂ موسیو سدیو فرانسیسی - عربوں کے متعلق یہ کتاب ان تمام تاریخوں کا نچوڑ ہے جو یورپ و ایشیا کے کتب خانوں کی زینت ہیں مسلمانوں کی ترقیوں اور عربوں کے کمالات کا آئینہ ہے - ساتھ ہی یورپ کے کذب و افترا کا بہترین جواب - قیمت مجلد چرمی ۷ روپے ۸ آنے —

——(یادگار غالب)——

یعنی مرزا اسداللہ غالب دہلوی کے مفصل حالات زندگی اور ان کے اقسام نظم و نثر، اُردو فارسی پر تفصیلی ریویو اور انتخاب - مولفۂ شمس العلما مولانا الطاف حسین صاحب 'حالی' مرحوم - قیمت مجلد ۳ روپے —

——(شعر و شاعری)——

شمس العلما خواجہ الطاف حسین 'حالی' مرحوم کے اُردو دیوان کا لا جواب مقدمہ جس میں شعر و 'شاعری' پر نقادانہ بحث کی گئی ہے - تنقیدی حیثیت سے اُردو زبان میں اب تک ایسا مضمون نہیں لکھا گیا ہے - قیمت مجلد ۲ روپے، غیرمجلدسوا روپیہ -

——(موازنۂ انیس و دبیر)——

میر انیس کی شاعری پر تفصیلی ریویو اور میر انیس ومرزا دبیر کا موازنہ - مولفۂ مولانا شبلی نعمانی، قیمت فی جلد مجلد چار روپے - غیر مجلد تین روپے —

——(وکرم اُروسی)——

کالیداس کے مشہور ناٹک کا اُردو ترجمہ مع ایک بسیط مقدمہ کے جس میں ہندو ڈرامے کی تاریخ اور نوعیت پر مفصل بحث کی گئی ہے - مرتبۂ مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی - اے مرحوم - قیمت مجلد دو روپے - غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

——— (خطوط شبلی) ———

علامۂ شبلی مرحوم کے یہ وہ لاجواب اور نادر خطوط ہیں جو موصوف نے بمبئی کی مشہور تعلیم یافتہ خواتین عطیہ بیگم صاحبہ فیضی اور زہرا بیگم صاحبہ فیضی کے نام وقتاً فوقتاً کمال اخلاص و محبت اور انداز خاص کے ساتھ لکھے تھے۔ یہ جواہر پارے اُردو میں مولانا کے کمال انشا پردازی کی نایاب یادگار ہیں۔ طرز نگارش اس قدر لطیف اور پاکیزہ ہے کہ شروع کرکے ختم کئے بغیر کتاب کا چھوڑنا دشوار ہے۔ شروع میں جناب مولوی عبدالحق صاحب، بی۔اے معتمد انجمن ترقی اُردو کا ایک نہایت لطیف و محققانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ جس نے ان خطوط کے جذبات اخلاص و محبت اور ندرت ادبی کو بے نقاب کردیا ہے۔ مرتبۂ مولوی محمد امین صاحب مارہروی و جناب نفیس بھوپالی۔ قیمت ایک روپیہ —

——— (دیوان غالب مطبوعۂ جرمنی) ———

غالب کے کلام کی قدر اور جو مانگ ہے ہر صاحب ذوق جانتا ہے، اُن کے دیوان کا ایک اڈیشن نفاست پسند طبائع کے لئے جرمنی کے مشہور کاویانی پریس میں جامعۂ ملیہ نے چھپوایا تھا جو ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ دوسری بار پھر اسی اہتمام و نفاست سے طبع ہوا ہے۔ ٹائپ، کاغذ، چھپائی، جلد، سائز ہر چیز دیدہ زیب و دلفریب ہے۔ قیمت چار روپیہ —

——— (محشر خیال) ———

یہ سید سجاد انصاری مرحوم وکیل بارہ بنکی کے چند دلکش ادبی و اصلاحی مضامین اور نظموں کا مجموعہ ہے جو شوکت ادبیہ دہلی نے خاص اہتمام سے چھپوایا ہے۔ سجاد انصاری صاحب خوش فکر و خوش گفتار ادیب تھے، اُن کے مضامین میں خاص قدرت و ادبیت اور کلام میں خاص کیف اور بلند خیالی و جذبات نگاری ہوتی ہے۔ یہ مجموعہ مرحوم کی جوانمرگی کی یادگار ہے، جس کو سید منظور حسین صاحب نے مرتب کیا ہے۔ لکھائی چھپائی بہت پاکیزہ، سائز مختصر، جلد نہایت نفیس، اوپر سنہری حروف میں کتاب کا نام بھی لکھا ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ —

——— (چمن) ———

یہ نہایت چھوٹا سا حسین و جمیل مجموعہ اساتذۂ اُردو کے پاکیزہ کلام کا انتخاب ہے۔ کارڈ سائز پر نہایت اعلیٰ طباعت و نفاست کے ساتھ عید کے موقعہ پر دوست احباب کو پیش کرنے کے لئے بہترین ادبی تحفہ ہے۔ قیمت ۵ آنہ —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

—— (دیوان حالی) ——

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی مرحوم کے قطعات غزلیات ، قصیدے ، مرثیے ، ترکیب بند ، رباعیاں ، تاریخیں اور متفرق اشعار قیمت تین روپیہ —

—— (میٹریکولیشن کا نصاب اُردو) ——

مجلس نصاب اردو جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد دکن کی ہدایت کے مطابق مولانا مولوی عبد الحق صاحب بی - اے (علیگ) آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو نے مرتب کیا - قیمت دو روپے —

—— (معراج العاشقین) ——

حضرت مخدوم ابوالفتح صدرالدین سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز (رح) کی تصنیف ہے - اس میں حضرت کے بعض مواعظ و ارشادات قدیم اردو یعنی دکنی اردو میں لکھے ہیں- مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کی تصحیح و ترتیب اور مقدمے کے ساتھ چھپی ہے - قیمت ۶ آنے —

—— (وقائع عالمگیر) ——

حضرت اورنگ زیب سلطان عالمگیر کے وقائع زندگی جو خود ان کے مکاتب اور مستند مورخین کی روایات پر مبنی ہیں - اور جن سے ان کے حقیقی کیرکٹر رواداری ، عدل جوئی اور تشرع مذہبی کا کافی ثبوت ملتا ہے - مرتبۂ چودھری نبی احمد صاحب سندیلوی - مجلد ۲ روپے —

—— (افغان بادشاہ) ——

اعلیٰ حضرت غازی امان اللہ خاں کی عظیم الشان جدوجہد داستان حیات اس کتاب لاجواب کو محمد حسین خاں بی - اے (علیگ : ڈائرکٹر جنرل پبلک انسٹرکشن افغانستان نے بڑی عرق ریزی سے مرتب کیا ہے- شائقین سیر و تاریخ کے لئے خصوصاً اور کافۂ مسلمین کو عموماً لازم ہے کہ اس کتاب کو غور سے مطالعہ فرما کر استفادہ کریں - قیمت فی جلد دو روپے آٹھ آنے —

—— (پریم پچیسی) ——

ملک کے مشہور انشا پرداز منشی پریم چند صاحب کے نہایت دلچسپ افسانوں

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

کا مجموعہ ۔ حصۂ اول ڈیڑھ روپیہ حصۂ دوم ڈیڑھ روپیہ —

— عروس ادب —

مولوی سید ظفر الحسن صاحب دہلوی بلگرامی کے اخلاقی ادبی تاریخی اور سیاسی مضامین کا مجموعہ ۔ حجم ۲۲۴ صفحہ سائز ۲۶ × ۲۰ کاغذ سفید عمدہ ۔ لکھائی چھپائی بہت خوشنما ۔ قیمت بے جلد دو روپے —

— (خیالات ارونگ) —

مشہور امریکن مصنف واشنگٹن ارونگ کے بعض دلچسپ مضامین کا بامحاورہ اردو ترجمہ از مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا وکیل ہائی کورٹ ضلع میرٹھ ۔ قیمت ۸ آنے —

— سیر المصنفین (—

جس میں مصنفان اردو کے حالات زندگی اور اردو زبان کی عہد بعہد کی ترقی و تبدیلی کا ذکر کیا گیا ہے مصنفہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی اے میرٹھ قیمت دو روپے

— مصنوعی بیوی —

مشہور مقبول مغربی ناولسٹ آر ۔ ایچ ۔ ... کے ایک نہایت دلچسپ انگریزی ناول میک بی لیو وائف کا اردو ترجمہ مولوی ... حسن صاحب لطفی قیمت ۱۲ آنے —

— خواتین انگورہ) —

مؤلفہ ملا توحیدی صاحب ۔ ترکی کی مشہور و معروف خواتین کے کارنامے ۔ اس کتاب سے آپ کو معلوم ہوگا کہ موجودہ جنگ و جہاد میں ترکی خواتین نے کس جوش اور قابلیت سے حصہ لیا ہے ۔ قیمت ۱ روپیہ —

— (جہاں آرا بیگم) —

جہاں آرا بیگم بنت شاہجہاں کی سوانح عمری جو نہایت مستند تاریخوں سے لکھی گئی ہے ۔ مؤلفہ مولوی ضیاءالدین احمد برنی صاحب بی ۔ اے قیمت ۸ آنے —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

(دار المصنفین اعظم گڑھ)

تاریخ فقه — ۳ روپیه
خلفاء راشدین — ۳ روپیه ۸ آنه
مہاجرین — ۴ روپیه
سیرۃ النبی حصۂ اول — ۳ روپیه
سیرۃ النبی حصۂ دوم — ۳ روپیه ۸ آنه
سیرۃ النبی حصۂ سوم — ٦ روپیه
شعر العجم مکمل ۵ حصے — ۱۳ روپیه
الکلام — ۲ روپیه
اسوۂ صحابه مکمل دو حصے — ۸ روپیه
انقلاب الامم — ۲ روپیه
مکالمات برکلے — تیرہ روپیه
سیر الصحابیات — ۲ روپیه ۳ آنه
روح الاجتماع — ۲ روپیه
ابن رشد — ۳ روپیه
گل رعنا — ۵ روپیه
سیر الانصار حصۂ اول — ۳ روپیه ۸ آنه
سیر الانصار حصۂ دوم — ۳ روپیه ۸ آنه
شعر الہند حصۂ اول — ۴ روپیه
شعر الہند حصۂ دوم — ۴ روپیه

(جامعه ملیه دهلی)

تاریخ نجد — ۱ روپیه
عربوں کا تمدن — ۲ روپیه ۸ آنے
تاریخ فلسفۂ اسلام — ۳ روپیه
تاریخ الدولتین — ۲.۰ روپیه
سیرۃ الرسول — تیرہ روپیه
خلافت راشده — ۲ روپیه
خلافت بنی امیه — تیرہ روپیه

۲ روپیه

خلافت عباسیه
خلافت عباسیۂ بغداد — ۲ روپیه
خلافت عباسیۂ مصر — ۲۰ روپیه
موتی معاشیات — ۱ روپیه
دنیا کے بسنے والے — ۴ آنه
قواعد عربی — ۲ روپیه
اسلامی تہذیب و قومی تعلیم — ۴ آنه
ترکوں کی کہانیاں — ۴ آنه
تاریخ ہند قدیم — ۱ روپیه

(الناظر پریس - لکھنؤ)

فسانه جوش — ۱ روپیه
مجموعه قصائد موسن — ۱۲ آنه
گوتم بدھ — ۴ آنه
مسالک النظر فی نبوت
۴ آنه
سید البشر
حکایة لیلی مجنوں — ۴ آنه
مقاتل غریب مغربی معمل خانے — ۴ آنه
وکرم اروسی — ۱ روپیه ۸ آنه
فلسفیانه مضامین مولانا ماجد صاحب
۱ روپیه ۸ آنه
تاریخ عرب مجلد — ۷ روپیه ۸ آنے
موازنۂ انیس و دبیر — ۳ روپیه
مقدمۂ شعر و شاعری — ۱ روپیه ۴ آنه
اصول النسخ — ۴ آنه
مسلمانان اندلس — ۱ روپیه
اسرار رنگون — ۱ روپیه
خوان دعوت — ۱ روپیه
مصلوبی شوہر — ۴ آنه

نوٹ کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں—

الاحسان	۸ آنه
ارض نیرنگ	۴ آنه
حیات نظامی	۳ آنه
خطاب	۴ آنه
میلاد حمدی	۴ آنه
فریاد امت	۳ آنه

(نظامی پریس بدایوں)

قاموس المشاهیر جلد اول	۲ روپیه
قاموس المشاهیر جلد دوم	۲ روپیه
محاسن غالب مجلد	۱ روپیه
دیوان غالب مشرح مجلد	۲ روپیه ۸ آنه
دیوان جان صاحب مجلد	قیمت ۲ روپیه
دیوان درد	۱ روپیه ۴ آنه
دیوان غالب (الحمیدی ایڈیشن)	قیمت ۲ روپیه
خطوط سر سید قسم اول	۲ روپیه
خطوط سر سید قسم دوم	۲ روپیه
لیکچر گرامی مجلد	۲ روپیه ۸ آنه
انتخاب اردو مجلد	۲ روپیه
قصائد ذوق	۳ روپیه
مراثی انیس جلد اول مجلد	۱۰ روپیه
مراثی انیس جلد دوم قسم دوم	۸ روپیه

(تصنیف نورالہی و محمد عمر صاحبان)

محمودہ الملٹن کے سوا	۱ روپیه
ناٹک ساگر (یعنی دنیاے ڈراما کی تاریخ) مجلد ۵ روپیه غیر مجلد ۳ روپیه ۸ آنے	
آس توبہار	۸ آنه
عذر ذی موت	۴ آنه
قزاق	۸ آنه
ٹکڑے دل	۸ آنه

نوٹ کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں—

اردو

حصہ ۳۴ جلد ۹ اپریل سنہ ۱۹۲۹ ع

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین



مرزا نوشہ غالب کا آخری خط

دیگر از خویشتم خبر نبود تکلف بر طرف
ایں قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

ہجوم غم سے فراغ نہیں - عبارت آرائی کا دماغ نہیں اگرچہ گوشہ نشین و خانماں خراب ہوں لیکن بحسب رابطہ ازلی کثیرالاحباب ہوں - اطراف و جوانب سے خطوط آتے ہیں ادھر سے بھی ان کے جواب لکھے جاتے ہیں جو اشعار واسطے اصلاح کے آتے ہیں بعد اصلاح بھیجدیے جاتے ہیں —

ان صاحبوں میں سے اکثر ایسے ہیں کہ نہ میں نے انکو نہ انہوں نے مجھے دیکھا ہے - محبت دلی و نسبت روحانی سہی لیکن صاحبان بلاد دور دست کیا جانیں میرا حال کیا ہے- ہفتاد و یک سالہ عمر کی کتاب میں سے فصل آخر کی حقیقت یہ ہے کہ دس پندرہ برس سے ضعف سامعہ اور قلت اشتہا میں مبتلا ہوا اور یہ دونوں علتیں روز افزوں رہیں - حس حافظہ کا بطلان علاوہ' جوں جوں عمر بڑھتی گئی یہ امراض بھی بڑھتے گئے - قصہ مختصر اب سامعہ کا حال یہ ہے کہ ایک تختہ کاغذ کا مع دوات' قلم سامنے دھرا رہتا ہے' جو دوست آتے ہیں پرسش مزاج کے سوا

اور کچھ کہنا ہوتا ہے وہ لکھ دیتے۔ میں ان کی تحریر کا جواب زبانی دیتا ہوں۔ غذا کی حقیقت یہ ہے کہ صبح کو آٹھ دس بادام کا شیرہ، دو پہر کو سیر بھر گوشت کا پانی، دو گھڑی دن رہے دو یا تین تلے ہوئے کباب۔ نسیان حد سے گذر گیا، رعشہ، دوران و ضعف بصر یہ بزران نو آمدہ سے ہیں۔ میر تقی مرحوم کا مطلع ورد زبان ہے —

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

خط بکس میں یا کتاب میں رکھ دیتا ہوں اور بھول جاتا ہوں آگے اپنے لیئے خط لکھتا تھا اب رعشہ یوں بھی نہیں لکھنے دیتا۔

صاحب اکمل الاخبار اور صاحب اشرف الاخبار نے جو ہمیشہ مجھ سے ملتے جلتے رہتے ہیں اور میرا حال جانتے ہیں از روے مشاہدہ میرے کلام کی تصدیق کرکے اسی اعتذار کو اپنے اخبار میں چھاپا ہے۔ کل دیگر صاحبان مطبع اور راقمان اخبار اگر اسی عبارت کو اپنے اخبار کے اوراق میں درج کریں گے تو فقیر ان کا احسانمند ہوگا۔ اس نگارش کی شہرت سے مقصود یہ ہے کہ میرے احباب میرے حال سے اطلاع پائیں اگر خط کا جواب یا اصلاحی غزل دیر میں پہونچے تو تقاضا اور اگر نہ پہونچے تو شکایت نہ فرمائیں۔ میں دوستوں کی خدمت گزاری میں کبھی قاصر نہیں رہا اور خوشی خوشنودی سے کام کرتا رہا جب بالکل نکما ہوگیا نہ حواس باقی نہ طاقت، پھر اب کیا کروں بقول خواجہ وزیر م:-

میں وفا کرتا ہوں لیکن دل وفا کرتا نہیں

اگر کسی صاحب کو میری طرف سے کچھ رنج و ملال ہو تو خالصاً للہ معاف فرمائیں - اگر جوان ہوتا تو احباب سے دعائے صحت کا طلبگار ہوتا ' اب جو بوڑھا ہوں تو دعائے مغفرت کا خواہاں ہوں) —

غالب

[یہ خط ہمیں جناب مقدر مرزا پوری نے عنایت فرمایا ہے جس کے ہم بہت شکر گزار ہیں]—

مرزا غالب کی تصویر جو اس کے ساتھ دی گئی وہ دھلی کے عجائب خانے سے (جو قلعۂ معلیٰ) میں ہے حاصل کی گئی ہے ہم جناب اشفاق علی صاحب سپرنٹنڈنٹ عجائب خانہ کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اس کی نقل دینے میں ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی - یہ تصویر مرزا غالب کے کسی ہم عصر مصور نے کھینچی ہے اور بالکل صحیح تصویر ہے اب تک جو تصویریں مرزا صاحب کی طبع ہوئی ہیں وہ زیادہ قابل اعتماد نہیں] -

دکھنی کا اثر شمالی ہند پر

از

جناب مولوی سید محی الدین قادری صاحب "زور"

یہ مضمون اس پرچہ کا پانچواں حصہ ہے جس کا خلاصہ اس سال "حیدرآباد کانفرنس" کے سالانہ اجلاس میں (بمقام [illegible] - انگلستان) "دکھنی زبان اور ادب" پر پڑھا گیا تھا اور جو حسب ذیل سات حصوں پر منقسم ہے۔ (۱) دکھنی کا آغاز (۲) شمالی اور دکھنی ہندوستانیوں کی علیحدگی (۳) شمالی اور دکھنی کے اختلافات کا آغاز اور اس کے نتائج (۴) دکھنی کا عہد زریں (۵) دکھنی کا اثر شمالی ہند پر (۶) دکن میں دکھنی کی بے وقعتی (۷) دکھنی کا مستقبل —

اورنگ زیب کی فتح دکن کے بعد جب کچھ عرصے کے لئے شمال اور دکن میں ملاپ ہوگیا اور دکن کے لوگ شمال اور شمال کے دکن آنے جانے لگے تو دونوں کو اپنی زبانوں کے اختلاف کا احساس ہوا۔ لیکن چونکہ دکن والوں نے اس میں خاصہ ادبی کام کیا تھا، شمال والوں نے معلوم کیا کہ ہم اس بارے میں دکن سے بہت پیچھے ہیں۔ وہاں کسی شخص نے بول چال کی زبان میں شعر شاعری کی طرف توجہ نہیں کی تھی اور جو ایک دو مثالیں ملتی ہیں انہیں اس زمانے کے قدیم تذکرہ نویس ناچیز اور عوام شاعری کا نمونہ نہیں سمجھتے، بلکہ کہتے

ھیں کہ لفنن کے طور پر لکھے گئے تھے —

مرزا معز موسوی خاں فطرت، اورنگ زیب کے زمانے کے ایک فارسی شاعر تھے، ان کا یہ اُردو شعر تذکروں میں ملتا ہے۔

از زلف سیاہ تو بدل دوم پڑی ہے   در خانہ آئینہ گٹ جوم پڑی ھے

مرزا معز کے ساتھ ایک اور شاعر قزلباش خاں ' امید ' کے بھی اردو شعر ملتے ھیں جس کا ایک نمونہ یہ ھے —

بادل دی بیتی آج مری انکھوں پڑی   غصہ کیا و کالی دیا اور دگر اری

اس قسم کے شعروں کے علاوہ اورنگ زیب کے زمانے کے چند اور اردو شعر بھی ملتے ھیں جو جعفر علی (زٹلی) کی تصنیف ھیں ۔ یہ زیادہ تر فحش ھیں تاھم کتب خانۂ انڈیا افس (لندن) کے ایک مخطوطہ میں بعض ایسے بھی پائے گئے ھیں جنھیں کوئی سنجیدہ کہہ سکتا ھے ۔ ان کی چند مثالیں ھم یہاں درج کرتے ھیں تاکہ دکن کے اثر سے پہلے کی اردو شاعری کی نوعیت معلوم ھو سکے —

اورنگ زیب کی مدح میں لکھا ہے —

زھے دھاک اورنگ شاہ ولی   در اقلیم دکھن پڑی کھل بلی

دریں پیر سال و ضعیف بدن   سپاہی دھما چو کڑی در دکھن

زھے شاہ شاھاں کہ گاہ وغا   نہ ھالد نہ ڈالد نہ جنبد ز جائے

برآورد لشکر بسا دھوم دھام   کہ ھل چل پڑی بر سر روم و شام

مہا سور جودھا بلی بے بدل   چو البرز قایم چو پربت اٹل

اورنگ زیب کی وفات کا مرثیہ —

اذل بے اکل ھوا سنسار سارا   بخوں طیار شد سر پیچ تارا

کہاں اب پائیے ایسا شہنشاہ   مکمل اکمل و کامل دل آگاہ

صد اے توپ و بندوں است ھر سو   چھٹا چھٹ و پھٹا پھٹ است ھر سو

بہر سو مار مار و دھاڑ است   اجھل چال و تہر خنجر گذار است

غرض شمالی ہند کے اہل سخن کو دکنی ادب سے مرعوب ہونا پڑا اور چونکہ اس اثنا میں

۱ - وہ فارسی شاعری کی تقلید سے اکتا گئے تھے ۔ ایک غیر ملک کی زبان میں کمال حاصل کرنے کے لئے انہیں خاص محنتیں کرنی پڑتی تھیں اور اس کے بعد بھی وہ ایرانی شاعروں کے مقابلے میں خود کو ہمیشہ کمزور پاتے تھے ۔ ساتھ ہی چونکہ فارسی ان کی اپنی زبان نہ رہی تھی وہ اپنی طرف سے الفاظ میں کے نئے نئے طریقے اختیار کرنے سے قاصر تھے ۔ انہیں ہر وقت یہ دھڑکا رہتا تھا کہ کہیں ایرانی استاد ان کی شاعری کو غلط نہ قرار دیں ۔ چنانچہ اس زمانے میں محاوروں وغیرہ کے استعمال پر اکثر ایرانی اور ہندوستانی شاعروں میں جھگڑے رہتے تھے جن کی مثالیں قدیم تذکروں میں کثرت سے موجود ہیں ۔

۲ - فارسی کی قدر کرنے والی سلطنتیں کمزور ہوتی جا رہی تھیں ۔ خود حکمراں شاعر نہیں تھے اور وہ سیاسی کمزوری کی وجہ سے شاعروں کی قدر کرنے کے قابل رہے تھے ۔ اکبر ، جہانگیر کے درباری امیروں کی طرح اورنگ زیب اور اس کے بعد کے امرا فارسی شاعروں کی خاطر خواہ قدر کرتے تو بہت ممکن تھا کہ فارسی اور کچھ زمانے تک چل سکتی

۳ - چونکہ فارسی میں ہندوستانی شاعروں کے نئے خیالات ادا کرنے کے لئے نئے طریقے محدود تھے اور اس کے علاوہ اس میں اپنی مقامی خصوصیات اور فطری حالات کو بے دھڑک ظاہر کرنا معیوب سمجھتے تھے اس لئے وہ فطرتاً کسی ایسی چیز کے متلاشی تھے جس کے ذریعے سے وہ بے تکلفی کے ساتھ اپنے مطالب ادا کر سکیں

چنانچہ جب انہوں نے دکھنی کو دیکھا جو ان کے لئے فارسی سے زیادہ قریب تھی اور جس کے ذریعے سے ان کی تمام فطری خواہشیں پوری ہو سکتی تھیں تو فارسی کو چھوڑنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ اس سے اس قدر بیزار ہو گئے اور

حقارت کی نظروں سے دیکھنا شروع کیا کہ جب کوئی سودا یا میر جیسا بڑا شاعر فارسی میں لکھتا تو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے رتبے سے اتر کر یہ کام کر رہا ہے —

شمالی ہند میں ریختہ گوئی کی ابتدا اور فارسی کے ترک کرنے کا سبب میر نے شاعرانہ طریقے سے بڑا پر لطف پیش کیا ہے - وہ کہتے ہیں —

خوگر نہیں کچھ یہ نہیں ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اس زمانے میں جو دکھنی شاعر شمال گئے ان کی ٹھیک مقدار فی الحال نہیں معلوم کی جا سکتی - اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کافی مقدار وہاں گئی ہوگی - چنانچہ صرف ایک 'مصحفی' کے تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ دکھنی شاعر شمال آئے تھے - جہاں انھوں نے خاصی قدر و منزلت حاصل کی - اس کا ثبوت تذکرہ اعظم الدولہ 'سرور' سے بھی حاصل ہوتا ہے —

'مصحفی' کے تذکرے سے تیس کے قریب شمالی ہند کے ایسے شاعروں کے نام ملتے ہیں جو دکھن گئے تھے - اگر اس زمانے کے اور تذکروں کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے تو یقین ہے کہ اس مقدار میں اور بھی اضافہ ہو سکے گا - تاہم یہاں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شمالی ہند میں شاعروں نے جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں سے جتنے بھی اس وقت تک نظر سے گذرے ہیں ان میں ڈیڑھ سو کے قریب ایسے شاعروں کے نام ملتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح دکھن سے تعلق رکھتے ہیں —

یہ تو شاعروں کا ذکر تھا ' اُس زمانے میں دکن کے بہت سے ایسے لوگ بھی شمال گئے جو شاعر نہیں بلکہ اہل ذوق تھے - یہ لوگ دکھنی کی بہت سی کتابیں

اپنے ساتھ شمال لے گئے - چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں شاہان اودھ کے کتب خانوں میں دکھنی کی اچھی خاصی کتابیں جمع ہوگئیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس قدر جلد دکھنی ادب شمال میں مقبول ہوگیا تھا کہ اُس کے بعض اجزا شاہی کتب خانوں تک بھی پہونچ سکے - اس کا ثبوت اس طرح سے بھی ملتا ہے کہ یورپ کے مختلف کتب خانوں میں جو قدیم دکھنی مخطوطے ہیں اُن میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے کاتب شمالی ہند کے باشندے تھے اور جنہوں نے وہیں محمد شاہ کے ابتدائی زمانے میں ان دکھنی کتابوں کو نقل کیا تھا —

قدیم تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی مجلسوں میں دکھنیوں کے اشعار عام طور پر قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے - لوگ دکھنی شاعروں کی اتنی آؤبھگت کرتے تھے کہ انہیں ایک دفعہ سے زیادہ وہاں جانے کی خواہش رہتی تھی - ولی نے تین دفعہ سے زیادہ دہلی کا سفر کیا اور پھر بھی جی نہیں بھرا - وہ ایک جگہ پکار اٹھتے ہیں کہ —

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین — جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

دہلی کے شاعر ولی کی غزلوں پر غزلیں لکھنا باعث کمال سمجھتے تھے - اور انہی کے مشورے سے اپنے مشاعروں کے لئے مصرع طرح حاصل کرتے تھے - اگر چہ اب شمال کے اُس زمانے کے شاعروں کے کلام عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے تا ہم دیوان زادہ حاتم سے (جو اس زمانہ کی تنہا یادگار ہے اور جس کا ایک نفیس بلکہ اصلی نسخہ اس وقت انڈیا آفس میں محفوظ ہے) اس کی شہادت ملتی ہے - خود دیباچے میں ' حاتم ' نے ' ولی ' کی استادی کا ذکر کردیا ہے اور لکھا ہے کہ میں انہیں کی طرز پر لکھتا ہوں - اس کے علاوہ اشعار میں متعدد جگہ ولی کی استادی کا اعتراف کرتے ہیں - اُن کے موجودہ مختصر سے انتخاب میں بھی تیرہ غزلیں ایسی ہیں جن پر صراحت سے لکھدیا ہے کہ ' ولی ' کی طرز اور تقلید میں لکھی گئی ہیں - بعض شعروں میں وہ ' ولی ' سے مخاطب بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ' ولی '

کی موجود گی ہی میں لکھے گئے ہیں —

تذکرہ قاسم (مخطوطہ انڈیا آفس) میں 'ولی' کی تعریف کرنے کے بعد اُس زمانے کے ایک شاعر کا مصرعہ اپنے خیالات کی شہادت کے طور پر نقل کیا گیا ہے - لکھا ہے :—

" پیرخان' کمترین' کہ خدایش دیا مرزد بسیار بہ موقع و بجا گفتہ کہ

' ولی پر جو سخن لاوے اُسے شیطان کہتے ہیں "

معلوم ہوتا ہے کہ اول اول شمال کے فارسی شاعروں نے ' ولی ' کی مخالفت بھی کی تھی - چنانچہ ناصر علی کے متعلق ' ولی ' لکھتے ہیں —

اُچھل کر جا پڑے جوں مصرع برق   اگر مطلع لکھوں ناصر علی کوں

اُسی زمانے کے ایک اور تذکرے میں . یعنی تذکرہ ' بےجگر' جس کا مخطوطہ - جو غالباً مصنف ہی کا مسودہ ہے . انڈیا آفس (لندن) میں موجود ہے) ولی کی نسبت لکھا ہے :—

" در حقیقت کسیے کہ اسپ در میدان ہندی دوانید آں بود و فی‌الواقع شخصے کہ آب رفتہ باز در جوے ایں زبان ہندی رسانید ' ہمان بود - چوں در سنہ اثنا جلوس محمد شاہی دیوان او بدہلی رسید موزوں طبعان بلند فکر و عالی‌تلاشان ہمعصر مثل حاتم و آبرو و فغاں وغیرہ بہ تبتبع زبانش پیرو و ہمزبان شدند " —

ایک اور تذکرہ " طبقات سخن " میں ' آبرو ' کے ذکر میں لکھا ہے کہ :—

" چوں دیوان ہندی شاہ ولی‌اللہ گجراتی بہ عصر محمد شاہ بدہلی رسید تتبع آں شد "

' مصحفی ' نے اپنے تذکرے میں خود حاتم کا قول اُن کے ذکر میں نقل کیا ہے. جس سے معلوم ہوتا ہے کہ 'ولی' کا کلام دہلی میں بےحدمقبول ہوگیاتھا وہ کہتے ہیں:—

" روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سنہ دویم فردوس '

آراسته دیوان "ولی" در شاهجهان‌آباد آمده و اشعارش
بر زبان خورد و بزرگ جاری گشته، تا دو سه کس که مراد از
"ناجی" و "مضمون" و "مضمون" و "آبرو" باشد بنائے شعر
هندی را بایہام گوئی نہادہ داد معنی یابی و تلاش
مضامین تازہ میدادیم " —

"ولی" کے علاوہ جن دکھنیوں نے دلی میں شہرت حاصل کی اُن میں فقیراللہ "آزاد" اور "فراقی" دکھنی بھی شامل ھیں - میر حسن اپنے تذکرے کے آغاز میں یہ لکھنے کے بعد کہ —

" باید دانست کہ ریختہ اول از زبان دکھنی است "

فقیراللہ آزاد کا حال لکھتے ھیں اور پھر اُس کی شاعری کی تعریف یوں کرتے ھیں :—

" همراہ فراقی دکھنی در شاهجهان آباد آمدہ بود، طبع
درد مندے داشت، و بسیار بہ صفا حرف می زند
خدا بش بیامرزد "

غرض شمال والوں نے بہت جلد فارسی شاعری کو ترک کردیا اور دکھنیوں کی تقلید شروع کی - اُن کے شاعروں کو استاد مانا، اُن کی غزلوں پر غزلیں لکھیں، اور حتی‌الامکان اس بات کی کوشش کی کہ دکنی زبان اور محاورے میں شاعری کریں اور نہ صرف یہی، جو شخص دکھنی طرز کے خلاف لکھتا اس کو زجرو توبیخ کی جاتی اور اُس کی شاعری غلط سمجھی جاتی - چنانچہ اُس زمانے کے ایک مشہور دہلوی شاعر ...... شاہ مبارک "آبرو" ...... نے اس کے متعلق جو نصیحت کی تھی اس کو حاتم نے اپنے " دیوان زادہ " کے دیباچے میں نقل کیا ھے :—

وقت جن کا ریختہ کی شاعری میں صرف ھے
ان ستی کہتا ھوں بوجھو حرف میرا ژرف ھے

جو کہ لاوے ریختہ میں فارسی کے فعل و حرف
لغو ھیں کے فعل، اُس کے ریختہ میں حرف ھے

دکھنی اثر کے بعد شمال میں جن ھندو اور مسلمان شاعروں نے فارسی شاعری ترک کرکے فوراً دکھنی طرز میں شروع کردی اُن کی تعداد خاصی ھے اور تذکروں میں ان کے متعلق خاصہ مواد موجود ھے۔

لیکن شمال والوں کا یہ رجحان زیادہ دیر تک نہیں قائم رہ سکا - دکھنی بھی فارسی کی طرح اُن کی اپنی زبان نہ تھی - اس میں بھی خیال ادا کرنے کے لئے انھیں تکلف کرنا پڑتا تھا - اب انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنی سادہ اور بول چال کی زبان میں فارسی اجزا ملاکر شاعری کریں - اگرچہ پہلے پہلے بعضوں نے اس کی مخالفت بھی کی لیکن چونکہ یہاں کے لئے فطری چیز تھی وہ اس تبدیلی میں کامیاب ھوگئے اور بہت جلد اردوے معلیٰ کی زبان میں شعر و شاعری شروع ھوگئی۔ اس کا آغاز 'مظہر' نے کیا اور اس کی ترقی 'ناسخ' کے زمانے تک جاری رھی - اس تبدیلی کا ذکر 'حاتم' نے جن کو شمال میں دکھنی کے عروج اور زوال دونوں کا دیکھنا نصیب ھوا تھا، اپنے دیوان کے دیباچے میں وضاحت سے بیان کردیا ھے کہ -

> "درین ولا این تربیت طلب از دہ دوازدہ سال .... اکثر الفاظ را از نظر انداختہ لسان عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد، و روزمرۂ دھلی کہ میرزایان ھند و فصیح گویان اند در محاورہ دارند منظور داشتہ - سوائے آں، زبان ھر دیار تا بہندوی کہ آں را بھاکا گویند موقوف نمودہ، فقط روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند بود اختیار کردہ"-

اور اس کے بعد لکھا ھے کہ اس انتخاب میں قدیم (دکھنی) طرز کے اشعار میں نے نہیں درج کئے ھیں، اگر کوئی ملیں تو مجھے معاف کیجئے -

اس تبدیلی کو بعض لوگوں نے پسند نہیں کیا - تذکرہ مخزن نکات میں خود

ر نے جن کا ایک شعر ریختے کو دکھنی زبان کی ایک لہر سی بات ظاہر کرنے میں ہور ہے اور جو آئندہ نقل کیا جئے گا، اس تبدیلی کے متعلق اپنے خیالات کا طرح اظہار کیا ہے وہ قابل غور ہیں ۔ وہ پہلے ان شاعروں کے نقائص اس طرح ر کرتے ہیں جنہوں نے دکھنی کی تقلید کا آغاز کیا تھا ۔

در سواد سلوک سخن مخفی و محتجب نیست
که از عہد عبداللہ قطب شاہ گرفتہ تا زمانۂ بہادر شاہ
شاعران دکنی که شعر ریختہ گفتہ اند نسق کلام
این ها بسیار مربوط و معقول است ۔ هر چند اکثر الفاظ
غیر مانوس گوش ما مردم مستعمل ایشان است لیکن چونکه
موافق زبان دکھن راست و راست است پیش همه کس راه
بده دارد و نه این که بعضی از شعرای ابتدای زمانۂ
محمد شاہ باعتقاد خود تلاش الفاظ تازہ و ایہام نمودہ
شعر را از مرتبہ بلاغت انداختند تا بمعنی چه رسد ۔ غرض
نا گفتہ بہ مصرعہ ۔۔ خطائے بزرگان گرفتن خطا است "۔

طبقہ دوم کے شاعروں مثلاً حاتم، و تاجی و مظہر کے ذکر کے بعد طبقہ سوم ے میر، سودا اور سوز وغیرہ کا ذکر شروع کرنے سے پہلے ان کے فارسی کی طرت ہ کرنے کی نسبت حسب ذیل خیالات کا اظہار کرتے ہیں :-

مخفی و محتجب نماند که آنچه الحال اشعار و احوال
شعرائے متاخرین نوشتہ می آید طرز کلام این ها مانا بروپہ شعر
فارسی است ۔ چنانچہ جمیع صنایع شعری قرار دادۂ اساتذہ
اصلاات است بکار می برند و اکثرے از ترکیبات فرس که موافق
محاورہ اردوے معلیٰ مانوس گوش می نمایند جوازالاذہان* (؟)

---

* جوازالمعانی ، اتالیق /

می دانند - الا ترجمہ زبان مغل بہ ریختہ کردن مفہوم است
چہ دریں صورت صحت زبان یکے از ہر دو نمی ماند - اگر
بعضے از اصطلاح کہ زبان زد مردم فصحاے این دیار بودہ کردہ
آمد چنداں مضائقہ ندارد-اما ایہام و تقلید کساں طبقۂ اولیٰ
کہ یک مصرعۂ شاں ریختہ و دیگرے فارسی است و در بعضے
مقام ریختہ و فارسی را بالفاظ غیر مانوس مخلوط ہم منظوم
ساختہ محض می نگارند - بہر حال حوالہ این مبحث طویل
الذیل موقوف بر سلیقۂ شاعر باید نمود - بیش ازیں بر صداع
سامعاں نباید افزود کہ اگر در خانہ کس است اشارتے ہم
بس است" -

مظہر نے جو دکھنی اثر کو دور کرکے فارسی آمیز زبان میں شاعری شروع کی اس کے بہت سے ثبوت تذکروں میں ملتے ہیں جن کا تفصیلی بیان 'مظہر' کی شاعری کے ذکر میں کسی اور موقع پر کیا جائے گا - یہاں اس امر کا اظہار غالباً ضروری ہے کہ دکھنی کے رواج کی طرح دکھنی کا رد عمل بھی بڑی سرعت سے شروع ہوگیا -

شمال والوں کو دکھنی اثر کے زایل کرنے میں جلد کامیابی اس لئے بھی حاصل ہو گئی کہ اس کو زایل کرکے شمال کے روز مرہ میں شاعری کرنے کی کوشش میں حصہ لینے والے 'میر' 'سودا' اور 'قایم' جیسے بڑے بڑے شاعر بھی تھے - چنانچہ ان تینوں کے بعض وہ شعر ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں جن میں اس امر کی طرف اشارے ہیں :-

'سودا' :- کہے تھا ریختہ کہنے کو عیب ناداں بھی
سو یوں کہا میں کہ دانا ہنر لگا کہنے
بسان مہر یہ روشن ہے سارے عالم پر
جہاں میں جیسے کہ میں شعر تر لگا کہنے

سخن کو ریختے کے پوچھے تھا کون 'سودا'
پسند خاطر دلہا ہوا یہ فن مجھ سے
کب اس کو گوش کرے تھا جہاں میں اہل کمال
یہ سنگ ریزہ ہوا ہے دُرِ عدن مجھ سے

'مہر':-

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے
ریختہ کاہے کو تھا اس رتبۂ عالی میں 'مہر'
جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا

'قایم':-

'قایم' میں ریختہ کو دیا خلعت قبول
ورنہ یہ پیش اہل سخن کیا کمال تھا
'قایم' میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی

اُردو کا ایک سندھی شاعر

از

(جناب محمود احمد صاحب عباسی)

سندھ کے سفر کا یوں تو پہلے بھی کئی مرتبہ مجھے اتفاق ہوا تھا، پرانی بستیوں کی سیر بھی کی تھی اور آثار قدیمہ کی زیارت بھی، لیکن ٹھٹھہ اس مرتبہ سے پہلے کبھی نہ جاسکا تھا - اب جو کراچی کا سفر پیش آیا، واپسی میں ٹھٹھہ بھی جانا ہوا - صوبۂ سندھ میں شاید یہ سب سے زیادہ قدیم بستی ہے، کراچی سے اس طرف تقریباً ۶۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے —

پہلی صدی ہجری کے آخر میں محمد بن قاسم ثقفی نے جب سندھ فتح کیا ہے تو غالباً سنہ ۹۳ ھ میں ٹھٹھہ پر قبضہ ہوا .... اسلامی تسلط کے بعد ہی سے یہ شہر اسلامی علوم اور تمدن کا گہوارہ رہا - بڑے بڑے صاحب خوان، علما و فضلا، محدثین و مصنفین اس کی خاک سے اٹھے جس طرح عربی کتابوں میں 'کچھ' کو 'قصہ' 'بھروچ' کو 'بروص' لکھا گیا ہے اس کا نام بھی عربی کتابوں میں آپ کو ططہ یا ططا اور فارسی کتب میں تتہ یا تہتہا لکھا ہوا ملے گا - جن محدثین و مصنفین کے ناموں کے ساتھ قدیم کتب تاریخ وغیرہ میں ططاوی یا تتوی آپ کو ملتے ہیں وہ اسی ٹھٹھہ کی سکونت کا پتہ دیتے ہیں —

آج ٹھٹھہ اگرچہ ایک چھوٹے سے قصبے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اپنے زمانۂ عروج میں یہ بہت بڑا اور مشہور شہر، مختلف حکمراں خاندانوں کا پایہ تخت

اور علما و فضلا کا مسکن تھا - اب تو دریائے سندھ بھی بستی سے کئی میل کے فاصلے پر بہتا ہے لیکن آثار بتاتے ہیں کہ چند صدی پیشتر آبادی سے بالکل متصل موجیں مارتا تھا جس سے اُس زمانے کے مقام آبادی کی رونق اور باغات کی سرسبزی و شادابی دوبالا ہوگی -

ٹھٹھ سے زیادہ سندھ کے کسی اور مقام پر شاید اس کثرت سے آثار قدیمہ نہ ہوں گے - کوہ مکلی آبادی سے متصل ایک مرتفع پہاڑی مقام ہے، جس کا سلسلہ میلوں تک چلا گیا ہے - یہ مقام آثار قدیمہ کے شائقین کا زیارت گاہ اور چشم بینا کے لئے عبرت پذیری کا نہایت متاثر کن مرقع ہے قبروں، تربتوں اور مقبروں کا میلوں تک ایک شہر خموشاں بسا ہوا ہے - فن تعمیر، سنگ تراشی اور کاشی کے کام (Encaustic tiles) کے، جس کے لئے سندھ مشہور ہے، یہاں اعلیٰ نمونے ملتے ہیں - سندھی زبان میں مکلی کے لغوی معنی "مکہ خوردہ" کے ہیں، اس کا دور چھ میل سے کم نہیں، عام شہرت کے اعتبار سے اس شہر خموشاں کے ساکنوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہے - چوتھی صدی ہجری تک کی قبر تو نظر سے گذری، معلوم نہیں کون کون اور کیسے کیسے ارباب فضل و کمال، صاحبان تاج و تخت یہاں ملتفظ نقش صور ہیں، بعض کے سنگ تعویذ پر نام کندہ ہیں، بعض کے مقبرے عالیشان ہیں لیکن اکثر گمنام و بے نشان - ان میں ایک مقبرہ حضرت سید محمد حسن المعروف بہ مردان شاہ بن سید محمد الحسینی الشیرازی المتوفی سنہ ۸۹۳ ھ کا، جن کے اخلاف میں اردو کے ایک سندھی شاعر سید ضیاءالدین متخلص بہ 'ضیا' کچھ نمونۂ کلام قارئین اردو کی ضیافت طبع کے لئے ذیل میں درج کیا جاتا ہے

سید ضیاء الدین 'ضیا' گیارھویں صدی ہجری کے اوائل میں سادات ٹھٹھ ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو خوش حالی و فارغ البالی کے ساتھ دولت علم و ا... سے بھی مالا مال تھا - میر علی شیر قانع مصنف تحفۃالکرام جو اس زمانے کے مشہور مصنف تھے اور جن کی مختلف تصانیف کی تعداد ۴۲ تک بتائی جاتی

ضیاء کے برادر عمزاد تھے۔ خاندانی رواج کے مطابق ضیاء نے عربی فارسی کی مروجہ تعلیم پائی۔ طبیعت کو شعر سے مناسبت تھی فارسی میں مشق سخن کرنے لگے۔ "دیوان ہندی" کے دیباچے میں خود فرماتے ہیں :-

> "فقیر اضعف العباد ضیاء الدین المتخلص بہ 'ضیا' ولد سید عزت اللہ شیرازی ساکن بلدہ تھتھا ...... از دیوان غزلیات در زبان فارسی و قصائد و مناقب بسیار کہ ہنوز اورا ترتیب دیوان ندادہ و یک مثنوی در عشقیہ رانجھن وھیر تصنیف کردہ در حضور گزرانیدہ بالفعل دیوان بزبان ہندی تصنیف نمودہ اند"

'ضیاء' کے کلام اور تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میران سندھ میں سے میر تھارہ● خان کے درباری شاعر تھے۔ اکثر غزلوں تک میں کوئی نہ کوئی شعر اس کی تعریف میں ضرور ہوتا ہے۔ اپنا یہ "دیوان ہندی" بھی میر موصوف کے حضور میں پیش کیا ہے۔ ان کا یہ دیوان ہندی غزلیات، مستزاد، ترجیع بند، قصائد، مخمس، مسدس وغیرہ پر مشتمل ہے۔ تاریخ اتمام گیارھویں صدی کے آخری سنین ہے۔ ضیاء کے کلام میں کوئی خاص قدرت، چاشنی یا سلاست نہیں، زبان بھی اسی عہد کی زبان ہے، متروک اور ثقیل الفاظ بھی کثرت سے ہیں لیکن اس اعتبار سے کہ دو ڈھائی صدی پیشتر اردو زبان کا سکہ سندھ جیسے دور دراز صوبے میں بھی چلتا تھا اور ایک سندھی نژاد شاہجہان آباد دہلی کی پرورش یافتہ زبان میں کلام موزوں کرتا ہے ضرور قابل قدر ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو لیکن یہ اشعار میں نے سرسری طور سے لکھ لئے تھے، انتخاب میں کوئی خاص کوشش نہیں کی —

آج گلشن میں نو بہار آیا — مست کہو کس کوں اپنا یار آیا

● مراد میر تھارہ خان میر سندھ سے ہے —

کس کی طاقت نہیں ہے دیکھے اسے   جس نے دیکھا ہے بیقرار آیا

عشق بازوں میں ہے نظیر ہے کا   مثل فرہاد شیریں کار آیا

نام ہے کا دو جگ میں اس کا بلند   حسن کے بن میں شہسوار آیا

نے فراموش ہے کا دل سوں وہ   نام اس کا جو یادگار آیا

کشور حسن کا ہے منصب دار   زلف کے دیس کا فوجدار آیا

مطلع روشن ضیاء کا مصرع سمج
نو ہر … صورت … آبدار … آیا

(دیگر)

رات دلبر کو خواب میں دیکھا   جلوہ تھا ماہتاب میں دیکھا

دس ہزاروں دو جگ میں ہو کامیاں   ذرہ سا آفتاب میں دیکھا

ہے کی اس کی حدیث طولانی   نسخۂ انتخاب میں دیکھا

جو کیا ہوں سوال صورت اس سے   معنی اس کا جواب میں دیکھا

ہوں پریشاں مو بمو اس کا   زلف کو پیچ و تاب میں دیکھا

مصحف روے اس سے نکالی فال   حال دل کا کتاب میں دیکھا

بیخودی دل کی ذوق بہ مستی   نشہ اس کا شراب میں دیکھا

نور از جبہہ مہر تہارہ خاں*   جلوہ کر ماہتاب میں دیکھا

شیخ سب ہمیں 'ضیاء' جو دیتا ہے
معنیٔ حق بو تراب میں دیکھا

(دیگر)

خاموش کیا بلبل از نالۂ جانکاہ   گلشن میں ہوا شور کسی غنچہ دہاں کا

باریک ہوا برگ سمن کا زخجالت   جب ذکر ہوا اسکے کبھو موئے میاں کا

---

* نام والیٔ سلطنت ——

ہر وقت ضیا رنگ گردورجہاں کا   یکجا ہے کہاں فصل بہاراورخزاں کا

(دیگر)

عشق کی رہ میں جو کہ باز ہوا   آ کے عشاق سر فراز ہوا
ہو کے پروانہ سان بمحفل راز   شمع مانند جان گداز ہوا
عاشقاں جان نثار کی تعریف   روح مجنوں چارہ ساز ہوا
ہے وہ خلوت نشین محفل قدس   عاشقاں میں جو با نیاز ہوا
بہرہ ور ہے کا عشق کی رہ میں   جیونکہ محمود پاکباز ہوا

عطار

از

(جناب سید حسن بُرنی صاحب بی اے، ال ال بی)

[یہ فرانسیسی مصنف کرادے وو Carra De Vaux کی کتاب مفکرین اسلام (Les Penseurs de l'Islam) کا چوتھا مضمون ہے جو ہم نے رسالہ اردو کے لئے براہ راست فرانسیسی زبان سے ترجمہ کیا ہے۔ اس سے پہلے خیام، حافظ اور سعدی پر جو مضامین شائع ہو چکے ہیں ناظرین کی نظر سے گذر چکے ہوں گے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مضمون بھی ان کے لئے مفید و دلچسپ ثابت نہ ہو؟ —

عام طور پر عطار کی تصانیف کے متعلق مصنفوں کے بیانات میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ہمارے فاضل دوست پروفیسر محمود خاں صاحب شیرانی نے اپنے مبسوط اور فاضلانہ مقالہ "تصانیف فرید الدین عطار" مطبوعہ جلد ۷ حصہ ۲۵ رسالہ اردو بابت جنوری سنہ ۱۹۲۷ء میں کامل تحقیقات کے بعد دکھایا ہے کہ بہت سی کتابیں جو فی الواقع دوسروں کی لکھی ہوئی ہیں غلطی سے عطار کے نام سے منسوب ہو کر ان کی کلیات میں شامل ہو گئی اور ان کے نام سے شہرت اور رواج پا گئی ہیں —

پروفیسر صاحب موصوف کا یہ خیال البتہ مسلم نہیں ہے کہ "تمام عطار کا کلام خود ان کے اپنے زمانہ میں مدون نہیں ہوا تھا" —

خوش قسمتی سے ہمارے ہاتھ میں خود عطار کا بیان اس کے متعلق

موجود ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عطار نے اپنی حیات ہی میں اپنا ہر قسم کا کلام مدون کردیا تھا —

ہمارے کتب‌خانہ میں کلیات عطار کا ایک مکمل نسخہ محفوظ ہے، جس میں ہمارے خیال میں عطار کی تمام صحیح اور حقیقی تصنیفات شامل ہیں - اور برخلاف اکثر دیگر متداول مجموعوں کے اس مجموعے میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو فی‌الواقع عطار کی تصنیف سے نہ ہو یہ نسخہ نہایت اہتمام سے لکھا گیا اور شاندار اور قیمتی لوحوں اور خوشنما سنہری جدولوں سے آراستہ ہے دیوان کے اخیر میں کاتب کا نام فیروز محمد بن سلیمان ساکن احمدآباد تحریر ہے اور سر ورق پر کسی صاحب نے اپنی خرید کی تاریخ سنہ ۱۰۲۲ ھ لکھی ہے - نسخے میں سنہ کتابت کہیں درج نہیں ہے۔ لیکن رسم الخط کو مد نظر رکھتے ہوئے دسویں صدی ہجری کے شروع زمانہ کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے —

اس مجموعہ کی ترتیب اس طرح پر ہے :—

(۱) تذکرۃالاولیاء جلد اول - (۲) تذکرۃالاولیاء جلد دوم - (۳) اسرار نامہ (۴) الہی نامہ (۵) منطق الطیر (۶) مصیبت نامہ (۷) خسرو وگل (۸) دیوان (۹) مختار نامہ —

اس مجموعے کے علاوہ ہمارے کتب خانے میں مختارنامہ کا ایک دوسرا نسخہ جو " رباعیات عطار " کے نام سے موسوم ہے، موجود ہے - مقابلہ کرنے سے معلوم ہوا کہ مختار نامہ کے دونوں نسخے باہم موافق نہیں ہیں " رباعیات " کے نسخے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عطار نے ردوبدل اور اضافے کے بعد مختار نامہ کو دوبارہ ترتیب دیا تھا —

مختار نامہ کے دونوں نسخوں کے شروع میں دیباچہ نثر پایا جاتا ہے جس میں عطار نے اپنی تصانیف کی ترتیب و تدوین بیان کی ہے - "رباعیات" کا پہلا صفحہ تلف ہوگیا ہے، لیکن خوش قسمتی سے وہ مقام جہاں تصانیف کا ذکر آتا ہے محفوظ ہے —

نسخهٔ مختارنامه مشموله کلیات

«اما بعد جمعی از صدیقان متخصص و احبای متقدم و رفقای هم نشین و [illegible] که چون آفتاب [illegible] داشتند و چون صبح [illegible] می‌زدند و چون آینه روی صافی می‌نمودند التماس کردند که چون [illegible] در عالم ظاهر گشت و اسرارنامه در جهان [illegible] شد و منطق الطیر [illegible] طیور الهی به محل [illegible] رسید و مصیبت نامه از حد غایت در گذشت و [illegible] شد [illegible] جواهرنامه و دیوان تمام [illegible] آمد و [illegible] و شرح القلب [illegible] هر دو [illegible] [illegible] [illegible] و [illegible] که در دیوان [illegible] است ، ضبط آن دشوار و از [illegible] [illegible] ([illegible] ترتیب [illegible] هرچند ترتیب آرد (دارد) [illegible] ندارد و [illegible] [illegible] [illegible] و طالبان به مقصود باز می‌گردند اگر [illegible] شود اختیاری دست دهد از نظم و ترتیب جمال دیگر گیرد و نظام این [illegible] و از لطف ایجاز رونق او زیاده گردد و بحکم دواعی اخوان این رباعیات گفته آمد و شعر هزار بود و قریب هزار و [illegible]

نسخهٔ مختارنامه موسومه «رباعیات»

......» و چون صبح نفس از صدق می‌زدند و چون شمع از سوز [illegible] و چون آینه روی از صفا درین معنی آورده بودند التماس کردند که چون [illegible] خسرونامه در عالم ظاهر گشت و اسرارنامه در عالم ظاهر شد و زبان مرغان طیور [illegible] ارواح را به محل کشف رسید و مصیبت نامه از حد غایت در گذشت و دیوان [illegible] تمام داشته [illegible] آمد) و جواهرنامه و شرح القلب که هر دو منظوم بودند [illegible] [illegible] نامنظوم [illegible] که [illegible] و [illegible] [illegible] [illegible] ابیاتی که در دیوان [illegible] است و ضبط آن دشوار و از [illegible] ترتیب باطل و از خلاصه [illegible] و [illegible] [illegible] دارد [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ماندند و طالبان به مقصود باز می‌گردند - اگر [illegible] شود اختیاری دست دهد از نظم و ترتیب نظام او بیفزاید و از حسن ایجاز رونق او زیاده گردد - بر حکم دواعی اخوان این رباعیات که گفته اند (آمد) شش هزار بود - احفظ [illegible] و [illegible] [illegible] و ناشسته روی و [illegible] نادانسته بدان عالم توان فرستاد پس هزار را بدان عالم [illegible] فرستادیم و از پنج هزار

و بعضی ماند که لایق این عالم نمود
بدان عالم فرستادیم که گفته اند
احفظ سرک ولو من ودک چونا شسته
روی و ناکرده غسل بدان عالم توان
فرستاد و پنج هزار که باقی ماند
درین مجموعه جمع گردانیدم و این
را مختار نامه نام نهاد و گمان آن
است که هیچ گویندهٔ را مثل این
ابیات دست نداده که اگر دست داده
در اوله روی نموده و بیرون آید روزگار
کم تر بوده - و این بیتها از سرکار
افتادگی آمده است نه از کار ساختگی
و به تکلف چنانکه آمد
بسودا رسیده —

......در مثنوی عطار مقالات اور اسرار
روح و روح عاشقان کماله ......

که باقی ماند این قدر که درین
مجموعه است اختیار کردیم و باقی
ابیات در دیوان است می طلب و چند
و چند نام این 'مختار نامه' نهادیم
و گمان آن است و این یقین است
که هیچ گویندهٔ را مثل این مجموعه
دست نداده است و اگر دست
داده روی نموده و این ابیات از
سرکار افتادگی در آمد است و از
سرکار ساختگی و از تکلف مبرا است
چنان که درآمده است می نوشته ایم
..... این دو مثنوی که از عطار یادگار
ماند یکی 'خسرو نامه' و 'اسرار نامه'
و مقالات طیور روم 'دیوان' و مصیبت
نامه' و 'مختار نامه'........

دونوں نسخوں کی عبارتیں مختلف ہونے کے علاوہ تحریف و تصحیف و دیگر اغلاط کتابت سے محفوظ نہیں ہیں - ان پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے اپنی رباعیات کو مضامین کے لحاظ سے مختلف عنوانات کے تحت میں ترتیب دیا تھا - ان کے علاوہ کچھ رباعیات دیوان میں شامل تھیں - رباعیات کی مجموعی تعداد چھ ہزار تھی - ایک ہزار سے زیادہ انتخاب کے قابل نہیں سمجھی گئیں - پانچ ہزار میں سے بھی انتخاب کیا گیا اور اس انتخاب کا نام مختار نامہ رکھا گیا ہماری شمار سے مختار نامہ کی رباعیات کی تعداد ڈیڑھ دو ہزار ہے —

مختار نامہ کی ترتیب سے پہلے حسب ذیل کتابیں تصنیف ہو چکی تھیں :—
(۱) خسرو نامہ (۲) اسرار نامہ (۳) منطق الطیر (۴) مصیبت نامہ
(۵) دیوان (۶) جواہر نامہ (۷) شرح القلب —

تذکرۃ الاولیا اور الہی نامہ کا اس میں ذکر نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں بعد میں لکھی گئیں - جواہر نامہ شرح القلب

کو صاف کرنے کی نوبت نہیں آئی اور جہاں تک تحقیق کیا گیا ہے جواہر نامہ اور شرح القلب کسی مجموعۂ کلیات میں یا علیحدہ دستیاب نہیں ہوئے۔ ہمارا خیال ہے کہ اسی وجہ سے جسے ہم نہیں جانتے ان کے صاف ہونے اور شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی —

نیز مختار نامہ کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختار نامہ کی تصنیف کے وقت عطار نے اپنی تصنیفات دو مثلثوں (یعنی تین تین کتابوں کے مجموعوں) میں ترتیب دی تھیں۔ ایک مثلث میں (۱) خسرو نامہ (۲) اسرار نامہ اور (۳) منطق الطیر یا "مقامات طیور" اور دوسرے مثلث میں (۱) دیوان (۲) مصیبت نامہ اور (۳) مختار نامہ شامل تھے۔ الٰہی نامہ اور تذکرۃ الاولیا کی دونوں جلدوں کو بھی شمار کرتے ہوئے عطار کی کلیات تین مثلثوں یعنی کُل نو کتابوں پر شامل ہوجاتی ہے اور یہ ترتیب خود عطار کی دی ہوئی ہے —

ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ عطار نے اپنی زمانۂ حیات ہی میں اپنے ہر قسم کے کلام کو مرتب و مدون کردیا تھا حتیٰ کہ رباعیات کو بھی مناسب عنوانات کے تحت میں یکجا کردیا تھا —

عطار کی تصانیف میں اس کا دیوان بہت کمیاب ہے۔ نولکشور نے ایک مجموعہ سنہ ۱۸۸۷ء میں کلیات عطار کے نام سے طبع کیا تھا، جس میں بعض دیگر تصانیف بھی شامل ہیں لیکن دیوان موجود نہیں ہے۔ پروفیسر شیرانی نے اپنے مضمون محولہ بالا میں مختلف کتب خانوں سے تصانیف عطار کے قلمی نسخوں کی فہرستیں درج کردی ہیں، جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان عطار کا ایک نسخہ انڈیا آفس میں محفوظ ہے اور اس کے علاوہ ہندوستان میں پروفیسر آکر کے مجموعۂ کلیات عطار میں دیوان بھی شامل ہے۔ ممکن ہے کہ کسی اور کتب خانہ میں بھی دیوان دستیاب ہوسکے —

بہرحال کلیات کا یہ مجموعہ جو ہمارے کتب خانہ میں موجود ہے گو نہایت قدیم اور بہت زیادہ صحیح نہیں لیکن کسی معتبر اور قدیم ترین اصل پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کسی آئندہ اشاعت میں عطار کی تصانیف پر ایک مفصل اور مبسوط مقالہ قلمبند کریں، فی الحال عطار کے خیالات ناظرین کے روبرو پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں]

عطار ، فریدالدین ، جو ممتاز شعراء اور عہد وسطیٰ کی اعلیٰ ہستیوں میں شمار ہوتا ہے ، سنہ ۱۱۱۹ ع سے سنہ ۱۲۳۰ ع تک زندہ رہا اور اس طرح اُس نے ایک سو دس سال مسیحی یا ایک سو چودہ سال ہجری کی عمر پائی ۔ ٭ اُس کی زندگی عبادت اور تصانیف کے شغل میں گذری ۔ اُس نے بہت کچھ لکھا ہے بیس ضخیم کتابیں ہیں اور ایک مشہور دیوان ہے جس میں چھوٹی چھوٹی نظمیں یکجا کردی گئی ہیں ۔ سن رسیدہ ہو جانے اور شہرت پا چکنے کے بعد عطار مغلوں کے حملے میں شہید ہوا ۔ پند نامہ عطار کے ایک ترکی ناشر نے شہادت کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے :—

" شیخ عطار کا مولد و مدفن شہر نیشا پور ہے ۔ ایک روایت کی رو سے اُس کی عمر ایک سو گیارہ برس اور دوسری روایت کی رو سے ۱۲۳ برس ہوئی ۔ جب مغل کفار نیشا پور پر قابض ہوگئے تو عطار محمل طوطی کے شکرستان جانے کا آرزومند ہوا ۔ مغلوں نے مسلمانوں پر ہر طرح کے ظلم و تشدد کئے ۔ ایک مغل سپاہی نے شیخ عالی مقام کو بھی گرفتار کرلیا ۔ ایک مسلمان نے شیخ بلند مرتبت کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ میں اس کے بدلے میں تجھے ایک ہزار دینار سرخ دیتا ہوں " ۔ لیکن شیخ نے سپاہی سے کہا " میں مسلمانوں میں بڑے رتبہ کا آدمی ہوں وہ مجھے چھوڑانے کے لئے بڑی قیمت دیں گے " ۔ مغل سپاہی نے انکار کردیا ۔ اس کے بعد کئی شخص گذرے اور سپاہی نے ان کے سامنے شیخ کو پیش کیا لیکن کوئی آمادہ نہیں ہوا ۔ مغل متعجب ہوا ۔ اتنے میں ایک شخص آیا جس نے کہا کہ " میں تجھے اس کے بدلے ایک توبرہ گھاس دوں گا تو اسے مجھے دے دے ۔ اس پر شیخ نے کہا " میرے یہی دام ہیں " اس پر مغل کو طیش آگیا اور اس نے شیخ کو جام شہادت پلا دیا اور

٭ دیکھو هارن کی تاریخ ادبیات فارسیہ مطبوعہ لائپزگ سنہ ۱۹۰۱ ع ص ۱۵۸ :—
(P.Horn, Gesch. der Persischen Litteratur)

مطبوعہ استنبول سنہ ۱۳۰۳ ھ صفحہ ۳

اس طرح شہر کا خاتمہ ہوا" - ایک مجذوب نے جو وہاں موجود تھا اور جس نے یہ سب ماجرا دیکھا تھا بحالت جذبہ خدائے تعالیٰ کو مخاطب کرکے کہا "اے اللہ! بزرگان دین اور حق پرست یکے بعد دیگرے حوالۂ آوروں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو رہے اور قتل کئے جارہے ہیں، تو انہیں بچانے کے لئے کچھ نہیں کرتا لیکن میں غصے سے بے تاب ہوں" - یہ کہکر اس نے خنجر ہاتھ میں لیا - بہت سے مسلمان اس کی ہمت سے متاثر ہوئے اور ہاتھ میں تلوار لے کر مغلوں پر حملہ آور ہوئے انہوں نے عثمانی قوم کو بد ترین مصیبت سے بچا لیا" —

جس کامیابی کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ محض مقامی اور عارضی تھی اس شہر کو جو ادبی تاریخ میں نیشاپور ہے فتح کے بعد مسمار کر دیا گیا اور باشندے قتل کر دیے گئے یاقوت نے جوکہ معاصر ہے لکھا ہے: "بیان کیا جاتا ہے کہ ترکوں (مغلوں) نے ایک بھی دیوار سالم نہیں چھوڑی - اس شہر کو تولی خان پسر چنگیز خان نے فتح کیا تھا - مورخ میر خاوند مصنف روضۃ الصفا) نے دو سنجیدہ اور پر زور صفحات نیشاپور کے محاصرے اور لوٹ کے متعلق تحریر کئے ہیں - یہ واقعہ کافی اہم تھا، شہر کے محاصرے کے وقت کئی سو مشینیں استعمال کی گئی تھیں - جو لوگ اس وقت مارے گئے اُن کی بہت بڑی تعداد لکھی ہے - لیکن عطار کا کوئی ذکر نہیں ہے —

پند نامہ ایک چھوٹی سی کتاب اخلاق و نصایح کی ہے، جو سادگی و اختصار میں شاعر کی دیگر تصانیف سے جن میں طول اور تشبیہات و استعارات پائے جاتے ہیں مختلف ہے - اس کتاب کا انداز تحریر یہ ہے کہ مختصر عنوانات کے تحت میں ابیات لکھے گئے ہیں لیکن خیالات کی ترتیب میں کوئی شدید اہتمام نہیں رکھا گیا ہے - اس کتاب کے مواعظ تمام تر صوفیانہ نہیں ہیں - مصنف نے عملی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے بعض اجزاء میں خوش خلقی تربیت، صحت کی نگہداشت تقریباً علم حفظا لصحت، مہمان نوازی ماں باپ کی تعظیم و توقیر سے بحث کی گئی ہے - متبعین فیھا غورث

طرح وہ اعداد کے استعمال کا بہت کچھ دلدادہ ہے مثلاً پانچ چیزیں شوم ہیں' تین
باتیں بد ہیں ' تین علامتیں جن سے جاہل پہچانا جاتا ہے' تین عادتیں جو نیک
نی کی علامت ہیں ' پانچ چیزیں جو ہمیشہ پانچ آدمیوں میں پائی جاتی ہیں -
، عادات کی وہ تلقین کرتا ہے وہ تقریباً ہمیشہ یکساں ہیں یعنی خاموشی
کم از کم گفتگو میں احتیاط' دنیا سے گوشہ گیری' قناعت - وہ تمام پند نگاروں سے
ہ کر فیاضی کی تعلیم دیتا ہے " خدا نے آسمان کے دروازے پر لکھ دیا ہے یہاں
ی کا گذر نہ ہے " --

اس چھوٹی سی کتاب پر ترکی زبان میں اسماعیل حقی اور شیخ ملا مراد نے
رحیں لکھی ہیں ، استنبول سنہ ١٠٠٣ ھ ، یہ کتاب ترکی مکتبوں میں تعلیم
یں بہت زیادہ مروج ہے • میں ذیل میں پند نامہ سے چند ابیات جو قناعت پر
کہے گئے ہیں درج کرتا ہوں :--

" اے میرے بیٹے ! ہمیشہ اپنی حالت پر قانع رہ - غریبی سے بڑہ کر دنیا
میں کوئی چیز اچھی نہیں ہے - ہر صبح و شام خدا سے عفو کی طلب کر ' اور جس
حال میں اپنے آپ کو پائے اپنا کام کئے جا - اپنے ساتھیوں کی غیبت نہ کر ' اور نہ
کسی کی برائی سوائے شیطان کے- چونکہ ہر روز دنیا میں نیا ہے اس لئے ہر روز اپنے
گناہوں کی مغفرت مانگ - جو خدا سے نہیں ڈرتا ' اُسے خدا ہر چیز سے ڈراتا ہے -

---

• پند نامہ کا ہمارے یہاں (فرانسیسی زبان میں) اب سے ایک صدی قبل
سلویسترو ساسی (پیرس سنہ ١٨١٩ء ترجمہ کرچکا ہے (JePend Nemk Silvstro desacy)
اسماعیل حقی اٹھارویں صدی عیسوی کا ایک ممتاز مصنف ہے جو سنہ ١٠٦٣ ھ میں
پیدا ہوا اور سنہ ١٣٢٧ ھ میں وفات پاگیا - اُس نے ترکی اور عربی زبانوں میں متعدد
کتابیں اور بعض قدیم تصانیف پر شرحیں لکھی ہیں - ملا مراد سلسلۂ نقشبندیہ کا
شیخ تھا اُس نے اپنی شرح شاگردوں کی تعلیم کے لئے لکھی تھی - میں نے خود بھی عرصہ
ہوا پند نامہ ایک خلاصہ کے ذریعہ سے جو براہ کرم میرے لئے حسن لیمی نے طیار
کیا تھا مطالعہ کیا تھا --

جہاں تک ہوسکے غریبوں کی حاجت روائی کر۔ روپیہ جو تیرے پاس ہے وہ صرف عارضی ہے۔ اگر تو اُسے اپنے پاس رکھیگا وہ تجھے رنج دیگا، جو تو خدا کی راہ میں دیگا وہی تیرا ہے، جو تو بچا کر رکھیگا وہ تیری روح کے لئے نقصان کا موجب ہوگا۔ دنیا ایک سرائے ہے، اگر ہوش رکھتا ہے تو اُس سے نکل جا۔ دنیا ایک پل ہے، اگر تو راستہ سے گذرنا چاہتا ہے تو اُس پر سے پار اُتر جا۔ جو شخص کہ اپنا مکان پل پر بناتا ہے عقلمند نہیں ہے بلکہ احمق ہے۔ خدا سے دولت نہ مانگ، اس لئے کہ مومن کے لئے مال و دولت زحمت و الم ہیں۔ مال اور اولاد (قرآن میں لکھا ہے) دشمن ہیں اگرچہ وہ تجھے اپنی آنکھوں کی روشنی معلوم ہوتے ہوں۔ اس آیت قرآنی پر غور کر اور اُسے ہوا سمجھ"۔—

تیسری بیت پر شارح نے ان نکتہ خیالات کا اظہار کیا ہے: یہ ضروری نہیں کہ بعض شیطان کے اور کسی کو نہ برا کہا جائے نہ کسی پر لعنت کی جائے۔ مثلاً نمرود، فرعون، شداد، ہامان، اور ابوجہل۔ شیطان دراصل ایک اسم ہے، جو بد دینی کو ظاہر کرتا ہے۔ خلیفہ یزید اس شعر کو پڑھ کر شراب پیتا تھا "اگر شراب مذہب احمد میں حرام ہے، تو عیسیٰ بن مریم کے مذہب میں جایز ہے"۔ ● شارح سودی آفندی لکھتا ہے "میں نے حافظ کو خواب میں دیکھا اور اُس سے کہا اے حافظ تو جو اپنی قابلیت اور معرفت میں بے نظیر ہے، تو نے یزید کے شعر کو کیوں لیا؟ حافظ نے جواب دیا "مسئلہ ذکر مت کر۔ مال کافر مسلمانوں کے لئے حلال ہے" ● —

● سودی کو اس کا غالباً اس موقع پر کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دیوان حافظ کے پہلے بیت کا عربی مصرعہ "الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا" یزید کے ایک شعر سے ماخوذ ہونا بتایا جاتا ہے۔ اس پر اعتراض تھا کہ حافظ نے یزید جیسے شخص کا کلام کیوں لیا۔ اس کے جواب میں کاتبی شیرازی کا ایک قطعہ ہے، جس میں اس نے حافظ کو خواب میں دیکھنا اور اس سے سوال کرنا اور بالآخر حافظ کا جواب دینا "مال کافر بر مومن حلال" بیان کیا ہے۔ (دیکھو مسٹر بشیر احمد صاحب ڈار کا مضمون حافظ شیرازی مطبوعہ رسالہ اردو جنوری سنہ ۱۹۲۹ ع ص ۳۴) سید حسن برنی

موسیو حسین آزاد نے اپنے مجموعۂ انتخابات " صبح امید " (L'Aube de l'Esperance) متن فارسی مع تراجم فرانسیسی مطبوعۂ لائپزگ و پیرس سنہ۱۸۸۱ع میں چند انتخابات عطار کے کلام کے بھی درج کئے ہیں ۔ ازاں جملہ اقتباسات اسرار نامہ سے ہیں ۔ وہ بالعموم نہایت عمدہ ' اور ہمارے بعض سربرآوردہ مغربی شعراء کے کلام کے ہم پلہ ہیں ۔ بعض متداول و معروف تشبیہات کے ساتھ بعض عالی شان و جلیل القدر خیالات پائے جاتے ہیں پہلا اقتباس' جو اس کتاب سے لیا گیا ہے انسان کی حقیر و بیمقدار حیثیت اور عالم کی جو کہ خدا کی علامت ہے' عظیم و پر جلال ہستی کو دکھاتا ہے :—

" مکھی سمجھتی ہے کہ قصاب اپنی دکان کا دروازہ اسی کے لئے کھولتا ہے"۔ یہ مکھی (فرانسیسی امثال نگار) لافانتین (La Fontaine) کے خلزیرہ کی پیشرو معلوم ہوتی ہے ۔ اس اقتباس میں بعض عجیب و غریب دکھیانہ خیالات پائے جاتے ہوں ۔ " بیرونی فلک کے بعض اجرام سماوی ہمارے کرۂ ارض سے ایک سو دس گنا ہیں ۔ تیس ہزار برس میں منطقۃالبروج اپنی جگہ پر لوٹتا ہے ۔ اگر کوئی شخص فلک بیرونی سے ہمارے کرۂ ارض پر پتھر پھینکے تو پانچ سو برس میں زمین پر پہنچیگا" ۔ اسی قسم کے خیالات گلیلیو (Galileo) نے اور بعد ازاں نیوٹن (Newton) نے چاند سے گیند پھینکنے کے متعلق ظاہر کئے تھے ۔ " زمین بمقابلہ ان نوفیلے گنبدوں کے ایسی ہے جیسے ایک خشخاش کا دانہ سمندر کی سطح پر اور تو اس دانے کے مقابلے میں کیا ہے ؟ " ۔ یہ ایک ایسا مقابلہ ہے ' جو تقریباً (فرانسیسی مفکر) پسکل (Pascal) کے خیالات سے ملتا ہے —

" میں کہتا ہوں : انسان کیا ہے ؟ وہ ایک حقیر چیز ہے ایک مشت خاک اور حیات دوروزہ ' ایک سانس اسے زندگی اور موت کے درمیان روکے ہوے ہے "۔ اسی خیال کو پسکل نے ریگ ذرہ اور قطرۂ آب سے ظاہر کیا ہے ۔ نظامی کے اس مصرع پر بھی غور کرو " ہستی اور غیر ہستی کے مابین ایک بال ہے " —

علاوہ ازیں انسان کے ضعف و عجز کا حسب ذیل پر لطف وجدت آمیز مقابلہ بھی قابل دید ہے :—

" آدمی یقین کرتا ہے کہ وہ بڑھ رہا ہے ۔ حقیقت میں اُس کی مثال ایک ایسے اونٹ کی ہے ' جو بندھی ہوئی آنکھوں سے چکی کے گرد گھومتا ہے ' اور جب اُس کی آنکھیں کھولی جاتی ہیں ' تو اپنے آپ کو وہیں پاتا ہے ۔ ایسی ہی ایک یہودی کی حکایت ہے جو جوا کھیلتا اور ہار جاتا ہے ' اور بالآخر اپنی آنکھوں کی بازی لگاتا ہے لیکن جب کہا جاتا ہے کہ وعدہ ایفا کرو تو بگڑ جاتا ہے ۔ یہ یہودی شاید شائلاک کا بھائی ہے ۔ موت کے متعلق ان خیالات جمیلہ کو بھی دیکھئے :—

" اس لمحہ پر جب کہ روح جسم سے جدا ہوتی ہے ' دو عالم ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں ۔ ایک طرف جسم بیحس ہوکر گرتا ہے دوسری طرف روح سکوت میں گرتی ہے ۔ کون جانتا ہے کہ وہ کیسے جدا ہوتے ہیں ؟ کہاں ہیں ؟ کہاں گئے ؟ اور کہاں آئے ہیں ؟ " —

عظیم و ماہر متصوفانہ نظم " چڑیوں کی مجلس " منطق الطیر ایک ایسے پلاٹ پر مبنی ہے جو تمام نظم پر حاوی ہے ' اور جس کا خلاصہ ہم نے ایک دوسری جگہ کیا ہے —

یہ نظم فی الواقع طیور کی جن سے روح مراد ہے ' سیاحت کو بیان کرتی ہے ' جو میدانوں کو عبور کرتی سفر میں زحمتیں برداشت کرتی ' اپنے آپ کو پاک کرتی اور بالآخر طے مراحل کے بعد سیمرغ کی خدمت میں بار یاب ہوتی ہیں ' جس سے مراد پرندہ آلہی یا فنا ہے ۔ یہ قصہ جسے علحدہ کرلینا اور جداگانہ شایع کرنا مفید ہوگا چاہیئے جداگانہ حکایات سے بھرا ہوا ہے ' جن میں اخلاقی یا روحانی تعلیمات دی گئی ہیں ۔ پرندوں کے ہر قصے کے ساتھ چھ یا سات دلچسپ حکایات

یہاں کی گئی ہیں، یہ حکایات اُس روح میں نہیں لکھی گئی ہیں، جو سعدی میں پائی جاتی ہے ۔ عطار کی حکایات ایک ایسے اخلاقی تصور کو جو زیادہ سخت ہے اور ایک ایسے مزاج کو جوکہ روحانیت میں انتہا سے بڑھ گیا ہے ظاہر کرتی ہیں ۔ عطار کی تصنیف کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پڑھنے والے کی قوت ادراک عمدہ نشو و نما اور تربیت پائے ہوئے ہو باوجود اس کے اس کتاب میں ایسے مقامات کافی تعداد میں دستیاب ہوتے ہیں جن کے شاعرانہ اور اخلاقی حسن کو اکثر ذہن محسوس کرسکتے ہیں :—

عطار اپنی ایک طویل حالت نزع میں کہتا ہے " اے میرے خدا ! میں اپنے آپ کو ہوا کے ہاتھوں میں چھوڑتا ہوں " شاعر نے اس قول کی تائید میں ایک علحدہ خطبہ قلمبند کیا ہے ، جسے میں کسی قدر مختصر پیرایہ میں درج کرتا ہوں ۔ یہ واضح ہوگا کہ یہ مضمون تقریباً مسیحی تعلیمات سے ملتا ہے " اے میرے آقا ! میں تجھ سے اس شخص کے وسیلے سے دعا کرتا ہوں جس نے تیرا کلام پہونچایا ہے ، جس کی شریعت کو میں نے قبول کیا ہے ، جس کا میں متبع ہوں ۔ جس سے میں محبت کرتا ہوں ۔ میں نے تیری خوشنودی کو خرید نا چاہا ہے ، لیکن تجھے کبھی نہیں بیچا ۔ بوڑھی اخیر گھڑی میں مجھے پھر خرید لے ۔ اے ان کے مددگار جو بے یار و مددگار ہیں ، میری مدد کر ۔ اے میرے خدا اس اخیر گھڑی میں اپنی مدد عطا فرما ، اس لئے کہ اس وقت کوئی میرا مددگار نہیں ہوسکتا ۔ میرے دوستوں کی آنکھیں اس وقت آنسوؤں سے بھری ہونگی ، جب کہ وہ اپنے ہاتھوں سے مجھے سپرد خاک کرینگے ۔ اس وقت مجھ پر مہر کا ہاتھ رکھ ، اور اپنی بخشش کے دامن میں چھپا لے —

ذوالنون ایک دن صحرا میں کچھ مردہ فقیر دیکھتا ہے۔ ایک آسمانی ندا اس سے کہتی ہے —

• ہم نے اس اقتباس میں لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے، بلکہ بعض اجزائے حکایت کا [illegible] مناسب لے لیا اور [illegible] کا خلاصہ ترجمہ کر دیا ہے۔ ہم نے اس سلسلہ حکایات کے ترجمہ میں اب تک اصل متن کے عبارات اپنی طرف سے پیش کرنے کی کوشش [illegible] ان کو معانی کی مطابق الفاظ سے دوالخون اور الفاظ کی اشکال کو [illegible] کی وضاحت کے لئے پیش کر دئے ہیں۔ یہ دونوں اقتباسات ہم نے اس نسخے سے لئے ہیں

گفت ذوالنون می شدم در بادیه — بر توکل بی عصا و زاویه
چون مرقع پوش را دیدم بره — جان بداده جمله بر یکجا بگاه
شور شد در دل بجوشم فتاد — آتشی بر جان بر جوشم فتاد
گفتم آخر این چه کار است ای خدای — سروران را صید اندازی زپای
هاتفی گفتا ازین کار آگهم — خود کشیم و خود دهیم [illegible] دهیم
گفت آخر چند خواهی کشت زار — گفت تا داریم دیت این است کار
در خزانه تا دیت می ماندم — می کشم تا تعزیت می ماندم
[illegible] — گرد عالم سر نگونش می کشم
بعد از آن چون محو شد اجزای او — پای سر گم شد ز سر تا پای او
مرده دارم آفتاب طلعتش — وز جمال خویش سازم خلعتش
چون او گنگ [illegible] گام — معتکف بر خاک این کویش کنم
سایه کردانمش در کوی خویش — پس بر آرم آفتاب روی خویش
چون بر آمد آفتاب روی من — کی بماند سایه در کوی من
سایه خود ناچیز شد در آفتاب — تو چه والله اعلم بالصواب
هرکه در وی محو شد از خود برست — زانکه نتوان بود جز با او بدست
محو شد از محو چند [illegible] مگوی — صرف کن جان خود و چیزی مگوی
مردمی باید نه سر او را نه پای — جمله گم گشته در او خود خدای
می ندانم درگهی زین بیش می — مرد را کو گم شود از خویشتن

"میں اُس شخص کو ، جسے دوست رکھتا ہوں ، اسی طرح مارتا، خون میں ڈالتا، اور دنیا کے چاروں طرف کھینچتا ہوں - جب کہ اُس کے جسم کے اجزا محو اور اس کے ہاتھ پیر گم ہوجاتے ہیں ، تو میں اسے اپنے چہرے کا آفتاب دکھاتا ، اور اپنے جمال کی خلعت سے ڈھک دیتا ہوں - اُسی کے خون کو اُس کے چہرے کا گلگونہ بناتا ہوں - میں اُسے اپنے کوچے کی خاک پر معتکف کردیتا ، اور اپنے کوچے میں سایہ بنادیتا ہوں - تب میں اُسے اپنے چہرے کا آفتاب دکھاتا ہوں ، اور اُس کی روشنی میں وہ سایہ جاتا رہتا ہے - جو شخص اپنے آپ کو محو کردیتا ہے ، اپنے آپ کو بچا لیتا ہے - اپنی جان کو محو کردے اور کسی دوسری چیز کو مت ڈھونڈھ - اپنی ہستی کو کم کرنے سے بڑھکر مجھے کوئی دوا معلوم نہیں" —

یہ اسمعیل کی اس ضرب المثل کی توضیح ہے —

● "جو اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے ، اپنے آپ کو کم کردیتا ہے"

"جب کہ زمین ثور کی پشت پر قائم ہوئی ، تو ثور ماہی پر اور ماہی ہوا پر ٹھہرے - لیکن ہوا کس چیز پر قائم ہے؟ وہ لاشے یا عدم پر قائم ہے، اور یہ کافی ہے اس طرح عدم پر عدم قائم کیا گیا ہے، اور یہ سب کچھ عدم محض ہے، اور کچھ نہیں" —

اسی نظم میں ایک ققنس کی موت کی ایک دلچسپ حکایت درج ہے ● اس

عطار نے اس دلکش حکایت کو منطق الطیر میں اس طرح لکھا ہے —

هست ققنس طرفه مرغی دلستان   موضع آن مرغ در هندوستان

سخت منقاری عجب دارد دراز   همچو نی دروی بسی سوراخ باز

هست در هر ثقبه آوازی دگر   زیر هر آواز او رازی دگر

چون بهر ثقبه بنالد زار زار   مرغ ماهی گردد ازوی بیقرار

جمله درندگان خاموش شوند   وز خوشی بانگ او بیهوش شوند

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

حکایت میں ہمیں ایک خالص یونانی روایت بازیاب ہوتی ہے —

ققنس ایک دلکش پرند ہے ' جو ہندوستان میں رہتا ہے اُس کے جفت نہیں ہوتی بلکہ وہ تنہا رہتا ہے - اُس کی ایک لمبی اور سخت منقار ہوتی ہے ' جس میں بہت سے سوراخ نَل کی طرح بنے ہوتے ہیں ' اور جن کی تعداد تقریباً ایک سو ہوتی ہے - ہر سوراخ میں سے ایک جدا آواز نکلتی ہے ' اور اُس کے راگ سے مرغ و ماہی اور درندے محو ہو کر رہ جاتے ہیں - ایک فیلسوف نے اُس کی آواز سے علم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۹)

فیلسوفی بود دمسازش گرفت — علم موسیقی ز آوازش گرفت
سال عمر او بود قرب هزار — وقت مرگ خود بداند آشکار
چوں بود وقت مرگ او دل خویش از — هیزم آرد گرد خود چند حصه بیش
در میان هیزم آید بیقرار — در دهد صد نوحهٔ خود زار زار
پس بدان هر ثقبهٔ از جان پاک (؟) — نوحهٔ دیگر کند نوعی دگر
در میان نوحه از اندوه مرگ — هر زمان بر خود بلرزد هم چو برگ
از نفیر او همه پرندگان — وز خروش او همه درندگان
سوی او آیند چون نظارگی — دل ببرند از جهان یکبارگی
از غمش آن روز در خون جگر — پیش او بسیار میرد جانور
جمله از زاری او حیران شوند — بعضی از بی قوتی بیجان شوند
پس عجب روزی بود آن روز او — خون چکد از نالهٔ و سوز او
باز چون عمرش رسد با یک نفس — بال و پر برهم زند از پیش و پس
آتشی بیرون جهد از بال او — بعد از آن آتش بگردد حال او
زود در هیزم فتد آتش همی — پس بسوزد هیزمش خوش خوش همی
مرغ و هیزم هر دو چون اخگر شوند — بعد اخگر نیز خاکستر شوند

موسیقی نکالا - ققنس ایک ہزار برس تک زندہ رہتا ہے - جب اس کی موت کا وقت قریب آتا ہے ' جس کا اُسے پہلے سے حال معلوم ہوجاتا ہے ' تو وہ ہر سوراخ سے ایک جدا نوحہ نکالتا ہے - اس نغمہ کو سن کر تمام وحوش جمع ہوجاتے ہیں - سب اُس کی موت میں مدد کرتے ہیں ' اور اُس سے مرنا سیکھتے ہیں - جب اُس کی زندگی میں صرف ایک سانس باقی رہ جاتا ہے ' تو وہ اپنے بال و پر ہلاتا ہے - اُس کی جنبش سے آگ پیدا ہوتی ہے اور وہ آگ فوراً ایندھن میں ' جو ققنس نے جمع کرلیا ہے ' لگ جاتی ہے ' اور ہلکے ہلکے اسے جلا دیتی ہے - تھوڑی دیر میں لکڑیاں اور پرند جل کر اخگر ہوجاتے ہیں - جب چنگاری کا ذرہ بھی نہیں رہتا ' تو ایک نیا چھوٹا سا ققنس خاکستر سے نمودار ہوتا ہے —

• ذیل میں دو اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں ' جن میں مذہبی رسوم سے ایک گونہ بے پروائی کا اظہار کیا گیا ہے ' اس قسم کے جذبات ان تمام شعرا میں عام طور پر پائے جاتے ہیں —

ایک صوفی جس کا نام واسطی تھا ' ایک مرتبہ گورستان یہود سے گذرا - اُس نے اُن میں سے اُن لوگوں کا خیال کیا جو نیک تھے - اُس نے بآواز بلند کہا " یہ یہود مغفرت کے مستحق ہیں ' گو اس خیال کا اظہار ہر شخص کے سامنے نہیں کیا جا سکتا " - ایک قاضی نے صوفی کو یہ کہتے سن لیا اور اپنے روبرو طلب کرکے حکم دیا کہ وہ ان الفاظ سے توبہ کرے - لیکن صوفی نے انکار کردیا ' اور کہا اگر تو ان لوگوں کو راہ اسلام میں داخل کرنا نہیں چاہتا ' تو کم از کم ان میں سے وہ جو وہاں ہیں (یعنی مرگئے) خداوند سماوی کے ہاتھ میں ہیں (یعنی تیرا اُن پر کیا اختیار ہے) " —

امام احمد بن حنبل ایک فقیر کے پاس بیٹھے ہوئے پائے جاتے ہیں اس پر لوگ متعجب ہوتے ہیں تو امام کہتے ہیں کہ "میں حدیث و سنت کا تھوڑا حاصل کر رہا ہوں۔ میں اس سے زیادہ باعلم ہوں لیکن وہ مجھ سے بہتر خدا سے واقف ہے" —

ہامر ([illegible]) عطار کو ہفت وادی یا منازل روحی کا جنھیں طیور عبور کرتے ہیں موجد بتاتا ہے۔ واقعی دوسرے صوفیوں مثلاً قشیری و ہجویری کی، جو عطار سے مقدم ہیں، اور سہروردی کی (جو اس کا معاصر ہے) تصانیف میں اس قسم کا نظام نہیں پایا جاتا۔ اور اس وجہ سے کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا کہ اسے عطار سے کیوں نہ منسوب کیا جائے —

یہ خیالات کا نظام سات کے عدد اور عام دلفریبی کے لحاظ سے سینٹ تیریس ([illegible]) کے خیالات سے ملتا ہے۔ عطار کے وادیوں کے نام لکھتا ہوں —

طلب، عشق، علم، بے نیازی، وحدت، حیرت، فقر اور فنا —

میں اس جگہ اس روحانی موت یا فنا کی دقیقی نوعیت پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس کے متعلق اپنے آرا اپنی کتاب "غزالی" میں ظاہر کر چکا ہوں۔ اور ان آرا میں اس وقت تک کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی ہے —

میں آخیر میں عطار کے چند لطیف ابیات پر اکتفا کرتا ہوں جن میں اس نے اس کیفیت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے، جہاں روح کی زندگی اور شخصیت کے تمام عوارض و تفصیلات محو ہو کر رہ جاتے ہیں، اور صرف وصال خداوندی کا احساس باقی رہ جاتا ہے

" وہاں تو ایک روحانی شعاع کے سامنے ہزاروں تاریکیوں کو جو تجھے گھیرے ہوئے ہیں غایب ہوتے دیکھے گا۔ جب کہ بحر ذخار کی موجیں ساکن ہو جاتی ہیں تو وہ نقوش جو پانی پر پڑتے ہیں غایب ہو جاتے ہیں۔ یہ نقوش محض عالمہائے

موجودہ و آلودہ ہیں ۔ جس شخص کا دل اس سمندر میں گم ہو جاتا ہے ، وہ ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاتا ، اور سکون پالیتا ہے ۔ اس بحر ساکن میں بجز فناکے اور کچھ نہیں ملتا ۔ اگر کوئی پاک شے اس سمندر میں گر جاتی ہے تو وہ اپنی مخصوص ہستی کو گم کر دیتی ہے ۔ اپنا جداگانہ وجود کھو دینے پر وہ آئندہ بھلی ہو جاتی ہے۔ وہ موجود ہوتی ہے، اور نہیں ہوتی ہے ۔ یہ کیسے ممکن ہے ؟ ذہن اسے سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا " —

قاضی محمود بحری (صوفی شاعر) اور اُن کا کلام

از

جناب سید محمد حفیظ صاحب بی اے بی ٹی لکچرار الہ آباد یونیورسٹی

اس مصنف کے مفصل سوانح ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکے ۔ بعض اہل علم حضرات سے اس کے متعلق جو درخواست کی گئی کہ اگر قاضی صاحب کے حالات زندگی آپ کو معلوم ہوں تو براہ کرم مطلع فرما دیں لیکن سب نے لا علمی ظاہر کی ۔ ان میں سے بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو علم و فضل میں یکتائے روزگار ہیں اور علاوہ اس کے اپنے قلمی نسخوں کے نادر ذخیرہ جات بھی رکھتے ہیں اور قدیم اردو کے مستند عالم سمجھے جاتے ہیں ۔ لائق سرپرست مصنف ہمہ دانی و دیدہ بھی جن کے یہاں قلمی نسخوں کا ایک نادر ذخیرہ ہے اور جو اس وقت ہندوستان کے زبردست انشا پرداز ہیں بحری کے سوانح حیات پر کوئی روشنی نہ ڈال سکے ۔ کچھ زمانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ دکن کالج میں ایک پروفیسر حکیم عبدالقادر سرفراز ہیں ان کے یہاں بھی ایک زبردست لائبریری ہے ' بہت ممکن ہے کہ ان کے یہاں بحری کے متعلق کچھ مواد مل سکے - یہ خیال آتے ہی میں نے ان کو بھی لکھا لیکن ان سے بھی وہی مایوس کن جواب ملا - غرضکہ بحری کے سوانح حیات کے متعلق باہر سے ہمیں کچھ نہیں مل سکا' البتہ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو سے جو قدیم و جدید اردو کے مستند عالم ہیں کچھ مختصر حالات معلوم ہوئے—

بحری جیساکہ مولانا عبدالحق صاحب سےمعلوم ہوا ملک حضور نظام کےایک موضع گوگی کے رہنے والے تھے جو واڑی اسٹیشن کے قریب شاہ پور سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے جہاں قاضی صاحب کا مزار شریف اب بھی موجود ہے ۔ سالانہ ۱۰ شوال تاریخ وصال قاضی صاحب کا عرس نہایت تزک و احتشام سے کیا جاتا ہے ۔ قاضی صاحب کا انتقال ۱۰ شوال سنہ ۱۱۳۰ مطابق ۱۵ اگست سنہ ۱۷۱۸ ء کو ہوا تھا —

قاضی صاحب کے والد بزرگوار کا نام بحرالدین تھا ۔ یہ گوگی کے قاضی تھے انہیں کی یادگار میں قاضی صاحب نے اپنا تخلص بحری رکھا تھا ۔ قاضی صاحب شیخ محمد باقر (رح) کے مرید تھے ۔ کسی مکتب میں رواج قدیم کے مطابق انہوں نے تعلیم نہیں پائی ۔ قاضی صاحب ولی کے ہم عصر تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کے اندز بیان اور زبان میں بہت کچھ مشابہت ہے ۔ بحری نے شاعری کسی استاد سے نہیں سیکھی ولی سے زیادہ انہوں نے سنسکرت الفاظ اپنے کلام میں استعمال کئے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت بیجاپور اور اس کے گرد و نواح میں سنسکرت کے الفاظ بمقابلہ عربی و فارسی الفاظ کے زیادہ مستعمل تھے اسی حالت میں اورنگ آباد اور بیجاپور کے شاعرون کی زبانوں میں فرق ہونا لا بدی تھا —

ایک روشن خیال صوفی ہونے کی وجہ سے ان کے کلام میں بسا اوقات ایسے الفاظ ملیں گے جو عام طور سے صوفیائے کرام کی تصانیف میں پائے جاتے ہیں —

ہم اوپر لکھہ چکے ہیں کہ باہر سے ہمیں بحری کے واقعات زندگی کے متعلق خارجی شہادت بہت کم دستیاب ہوسکی لیکن ابھی ہمارے پاس ایک ذریعہ اور ہے ممکن ہے کہ اس ذریعہ سے ہم بحری کے واقعات زندگی پر کچھہ روشنی ڈال سکیں —

ان کی مشہور مثنوی من لگن کے بعض مقامات قاضی صاحب کے سوانح پر روشنی ڈالتے ہیں —

چنانچہ "درسبب تصنیف اپنی کتاب" (مثنوی) قاضی صاحب رقم طراز ہیں کہ چار برس کی عمر میں انہیں مکتب میں بٹھایا گیا ۔ بسم اللہ شروع کرتے وقت ان سے کہا گیا بھئی خدا کے نام سے پڑھنا شروع کرو ۔ لیکن ہمارے قاضی کی زبان پر رحمان اور رحیم کی رٹ لگی تھی ۔ غرضکہ مہربانی کرنے والے اور رحم کرنے والے کا بیان ہمارے مصنف کو شروع ہی سے تھا ۔ اوائل عمری ہی سے وہ بہت ذہین اور طباع تھے ۔ لڑکپن ہی سے محبت کی آگ دل میں بھڑکنے لگی چنانچہ مثنوی میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں —

اس عمر میں عشق جیو میں جاگ   یوں گھیر لیا جیوں بھیڑ کوں باگ

عہد طفلی میں جب بچے عام طور سے گھروندے بنا بنا کر بگاڑتے ہیں ۔ مختلف مشغلوں سے اپنا دل بہلاتے ہیں ، دنیا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اس وقت سے ہمارے قاضی صاحب ان تمام لہو و لعب سے بے نیاز ہو کر پریم کی دہکتی ہوئی آگ میں خود کو اپنا تن من جلا رہے تھے --

آگ عشق کی دل منے لگی تھی   پھر تن میں تمام تک لگی تھی

بس انہیں صرف اتنا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شے ان کے خانہ دل کو جلا جلا کر خاک سیاہ کر رہی ہے ۔ وہ آخر ہے کیا ؟ اس کا علم انہیں کچھ نہ تھا صرف اس سوز دروں کا انہیں احساس ہی احساس تھا ۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ دنیا والے اس کو پریم کی آگ کہتے ہیں ۔ انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ یہ وہی شے ہے جس کے لئے انسان اس عالم وجود میں آیا ہے ۔ چنانچہ جب اس عشق سے وہ پریشان ہو جاتے ہیں اور اس کی اصلیت ان کے سمجھ میں نہیں آتی تو وہ فرماتے ہیں —

یو عشق برا ہے یا بھلا ہے   یہ دیو ہے بھوت یا بلا ہے

لڑکائی تھی سمجھ اوپر مسلم   ہو لوں تو یہی جو عشق کا غم

یا مجھ میں نوا ہوا ہے پیدا   یا جگ میں اول سے ہے ہو یدا

لیکن اس سوز پنہاں کا عیاں ہونا نہایت ضروری ہے ۔ اس کا اندر ہی اندر

سکتا تھا اس لئے اب انہیں شاعری کرنی چاہئے تا کہ وہ جذبات پنہاں کا اظہار کر کے سکون حاصل کر سکیں - یہ بھی خدا کا احسان تھا کہ انہوں نے شاعری شروع کردی ورنہ یہ درد نہاں خدا جانے انہیں کہاں لیجا تا --

گر بیچ کھیڈری نہ اتی وا لہ یہ آگ مجھے جلاتی

چالیس برس کی عمر تک قاضی صاحب کی یہی حالت رہی - درد محبت انہیں دم بھر بھی چین نہیں لینے دیتا تھا - جب کسی کا درد محبت انہیں بہت زیادہ بیچین کرتا تو اچھے اشعار کہہ کر وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے قاضی صاحب کی مادری زبان ہندی تھی ' اور اس وقت تک شاعری کی ہر صنف میں قسمت آزمائی کر چکے تھے - اگر چہ وہ خود شاعری ہندی ھی میں کرتے تھے تاہم ان کا خیال تھا کہ فارسی بلحاظ زبان اور اسلوب بیان کے ہندی سے اعلی و ارفع ہے --

ان کی تصانیف اور بہت سی چیزیں جو ایک بڑے صندوق میں مقفل تھیں سہاگ نگر میں چوری ہو گئیں --

کانو نے مکویا نے قاضی صاحب سے اظہار ھمدردی کی اور کہا جو کچھ ہونا تھا ہوچکا اب آپ ایک ایسی کتاب لکھیں جو آپ کی یادگار بنے اور آپ کا نام دنیا میں روشن کرے کیوں کہ یہ زندگی عارضی ہے - قاضی صاحب نے بہت معذرت کی - کہنے لگے اب میں کسی قابل نہیں رہا کتابوں تصنیف کرنے کی سکت مجھ میں قطعی نہیں' ضعیفی کا عالم ہے ہاتھ پیر اب اس قابل نہیں رہے- حاکم نے کہا یہ سب صحیح' لیکن آپ کوشش کریں خدا آپ کی مدد کریگا ' آپ لکھوئیے یا معنی ہو یا بے معنی آپ کی بلا سے - قاضی صاحب نے کہا اچھا ایسا ہی کوشش کروں گا ' تمہاری بات نہ ٹالوں گا ' وعدہ کرنے کو تو کرلیا لیکن اب فکر یہ ہوی کہ کیا لکھنا چاہئے --

آخر کار سکلوی میں لگی کی تھوری اور یہ فیصلہ کیا کہ اس کا موضوع ایسا ہو

جو شمع ہدایت بنکر طالب حق کی رہنمائی کرے اور خود ان کے درد کا بھی مداوا ہو—

میں موتیوں کی چھوڑ بہار آیا   دالاں میں اس دکنی کے دکھایا
جب درس دیا زندگی گذر تب   آ سامنے مکھ دکھایا مکتب
بسم اللہ مجھے تھے ہو ہاں   میں بول اٹھا رحیم رحمان
اس عمر میں عشق جیو میں داگ   یوں کھیر لیا جیوں بھوڑ کو ناگ
آگ عشق کی دل منے دھکی تھی   دو تن میں تمام دھن پکی تھی
پی محکو سو دیس تھیں دو ند بیا   یونار یو راز یونگہ گیا
جو درد سے بیا یو دل خلے یوں   سن انچ سے عشق کی کلے یوں
لزت دوں سدھ اوپر مسلم   دونوں تو یہاں جو عشق کا غم
یا مدرسہ میں دو ہوا ہے پیدا   یا جگ میں وہ تنی ہے ہویدا
چالیس برس بعد دوں مستی   تو عمر یو خدائی پرستی
ہندی کو زندچہ ہے ہماری   سہنے دہ لگی ہمیں تو بھاری
اور فارسی اس دی سب رسیلا   ہر حرف میں عشق ہے نہ حیلا
تھ یو سو یک بڑا پتارا   سو ساگ نگر میں ہوے سارا
ہور اور بھی یادگار چیزاں   تس پر او چرائے بے تمیزاں
اس لہو سے پرا کہی کیتک بار   جو تہا سوگیا پھر اپنے تبار
اس پنط کو نیں ہے پائداری   بارے رہی کچھ تو یادگاری
دپ حس میں اچھے بیان بالا   سنسار کے ہات اک رسالہ
بولیا نہ بوڑھا ہوا ہوں بیہوش   فا تن میں ترنگ جیو میں جوش
ناچک میں ہے جنت ہات میں ہیر   اب مجکو رکھو معاف اے مہر
بولے جو نہیں ہے طبع پر بل   موزوں کو بسار بول مہمل
اس بات کو جب کچھ بکے دیا گوش   تب من میں لیا یہ من لگی جوش
دستور عمل ہے عاملاں کو   دارو ہے دکھی بڑے دلاں کو

دیباچہ " درمدح بادشاہ دین پناہ سلطان اورنگ زیب " سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی صاحب اورنگ زیب کے زمانے میں تھے - وہ اورنگ زیب کے علمی قابلیت کے بہت مداح ہیں وہ بادشاہ وقت کو دوسرے بادشاہوں سے اعلیٰ وارفع سمجھتے ہیں بحری کے نزدیک اورنگ زیب جیسے ذہین اور طباع بادشاہ بہت کم ہوتے ہیں - بحری کا بادشاہ علم کے ہر شعبہ پر حاوی ہے - وہ عالم ہے ' فاضل ہے ' پابند مذہب ہے ' خدانے اس کو عقل سلیم عطا کی ہے - بہادری میں اپنا نظیر نہیں رکھتا - ہندوستان کے چپے چپے پر اس کا قبضہ ہوچکا ہے ' وہ بہت ہی ایماندار اور خدا شناس بادشاہ ہے - اپنے فرایض کی انجام دہی میں نہایت مستعد ہے' اشعار —

اک سلف نہیں جو اُن کیا ہیں　　یک نیں نہیں جو اُن کیا نیں

ایسا نہ ہوا کسی شہار میں　　نا بلکہ بڑے مشایخاں میں

جس ناؤں اہے ابوالمظفری　　سلطان اورنگ زیب غازی

دیندار دلیر اور دانا　　یک علم کا سب منے سیانا

در منقبت مربینا مولانا حضرت شیخ محمد باقر قادری دور مصحف کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بحری مولانا باقر (رح) کے مرید تھے - جیسا مریدوں کا دستور ہوتا ہے بحری بھی اپنے پیرو مرشد کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں - ان کے پیر صاحب کو خدا کا قرب حاصل ہوچکا ہے - وہ آں حضرت کے نائب ہو کر دنیا میں لوگوں کو شمع ہدایت دکھاتے ہیں - ان کے پیر صاحب مظہر العجائب بھی ہیں اور مافوق الفطرت صفات سے متصف ہیں - صاحب معرفت ہیں - خدا کے برگزیدہ بندوں میں سے ہیں اگر بایزید بسطامی ہی بقید حیات ہوتے تو وہ بحری کے پیر و مرشد سے فیضیاب ہوتے اور ان کے سامنے زانوے ادب تہ کر کے بیٹھنا عین سعادت سمجھتے حضرت بحری خود بھی استاد کو مخاطب کر کے طالب دعا ہوتے ہیں - کہتے ہیں اے پیر و مرشد تمہاری مدد درکار ہے تمہارے بغیر زندگی بیکار ہے - پیر صاحب سے

درخواست کی جاتی ہے کہ وہ خدا سے ان کی بلند نگاہی کے لئے دعا کریں اور صراط مستقیم کی ہدایت کریں ۔ اشعار :—

مولا کے محب نبی کے نائب ساقی نہیں مظہر العجائب
ساگر میں سہوور معرفت کے جل ہیں ہیں نور معرفت کے
اس دور جو بایزید ہوتے مل شیخ سوں مستفید ہوتے
تو لوگ اوپر تری امیری در جار ترے تو دستگیری
سب ڈوب پکڑ پڑا ہوں تونا یا پیر تو دستگیر ہونا

اردو فارسی شعرا کا قاعدہ ہے کہ وہ زمانے کی شکایت ضرور کرتے ہیں وہ بھی اس صنعت دیرینہ پر عمل کرتے ہوئے بہ ضمن در شکایت روزگار اس وقت کی اخلاقی حالت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ بارھویں صدی کے وہ بہت شاکی ہیں اس صدی میں کوئی آدمی کام کا نہیں ہر طرف سور و شر کا بازار گرم ہے کفر و ضلالت کا دور دورہ ہے نیکی کی سمجھ کچھ بالکل نہیں۔ جدھر دیکھو برائی۔ متقی اور پرھزگاروں کا پتہ نہیں۔ خدا نے ڈالا پیدا بہت مگر اس کے احکام ماننے والے کم۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹتا ہے۔ شرم و حیا کی رسم دنیا سے مفقود ہوگئی ہے نہ بزرگوں کا ادب ہے نہ چھوٹوں کا لحاظ یہ ان کی بد قسمتی تھی جو وہ اس زمانے میں پیدا ہوئے۔

اے بھائی یہ بارھویں صدی ہے نیکی کو دبا بدی بدی ہے
ہے آج تو قحط سال ست کا چھٹ گیا ہے دھرم سوں دل جگت کا
اس دور منے جو ہے کسی کا دبلا ہے یا دیانت آدمی کا
دھرتی پہ ادھرم اٹک ہوا ہے امرت کی بجائے بکھ ہوا ہے
اک دیو پہ درد دین کا نہیں اک دل پہ اثر یقین کا نہیں
نا جائے کو مائی کا بھروسہ نا بھائی کو بھائی کا بھروسہ
نا شرم کی خوہی یک نین میں نا دھرم کی لوھی یک بدن میں
اس حول میں تو ہوا ہے پیدا اس قول میں تو ہوا ہویدا

اگرچہ اپنے متعلق جو کچھ بیان ہے اس سے اُن کی زندگی کے واقعات کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتے مگر کم سے کم اس سے اُن کی روحانی ریاضت کی کیفیت ضرور معلوم ہوتی ہے —

لکھتے ہیں کہ ایک رات کو اُنھوں نے خواب دیکھا کہ اُن کے شیخ نے انہیں اسرار الہی کا جلوہ دکھایا کیا دیکھتے ہیں کہ نوکوالک (نو فلک) میں نور ہی نور پھیلا ہوا ہے - یہ دیکھ کر بحری نے شیخ سے التجا کی کہ مجھے کوئی ایسی روحانی ریاضت فرمائیے کہ جس سے میں نہ صرف اعلیٰ مقام پر پہنچ جاؤں بلکہ اپنے تئیں بالکل بھول جاؤں - شیخ نے فرمایا کہ تصور شیخ کیا کرو اور اس کی مشق یہاں تک بہم پہنچاؤ کہ "من تو شدم تو من شدی" کا قول صادق آجائے اور مرید اور شیخ میں وہی رشتہ اور تعلق نہ پیدا ہو جائے جو جسم کو روح سے ہے - بحری نے ریاضت شروع کردی - انجام کار اسی ریاض سے پاک محبت اس کے دل میں لہریں لینے لگی - اس تصنیف کے وقت وہ بالکل بحر محبت میں ڈوبا ہوا تھا - محبت ہی اس کی انیس تھی اور وہ اسی کے اشارے پر چلتا تھا - پھر آخر میں تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود فراموشی طاری ہو گئی اور ان کے سر میں وصل حقیقی کا سودا سمایا - نوے برس کی عمر میں اُسے احساس ہوا کہ اگر اس میں پریم اور محبت کی قوت نہ پیدا ہوئی ہوتی تو وہ پاک محبت سے بالکل نا آشنا ہوتا اور وہ بالکل دس سال کے بچے کی طرح ہوتا - اہل شناسان محبت ہی اس کی خصوصیات سے بخوبی واقف ہیں - درد کا مارا ہی کچھ درد کو سمجھ سکتا ہے لہذا اس کے نزدیک بھی روحانی تعلیم بغیر عشق کے فضول اور لاحاصل ہے —

حضرت کئے مجھکو یکشب ارشاد   اوشب نہ تھی سرتی یک سب ارشاد

جو بھید اتھا انوپ امانت   تس کے دئیے مجھ کچھک پچھانت

یک جوت دسیا سکل یو بھر ملنا   یک نور دسیا تمام نو کھلنا

اس بعد کہا دھنی سوں بلقی — اتنی نہ کروں تو بول کلتی
اے پیر اپس کرم سوں عنایت — اک شغل کرو مجھے عنایت
جس شغل سیں ہوے دیو سمد جوش — چیک جاے مجھے جو مست مد ہوش
فرماے کہ مجھکو دیکھہ دن رات — کر سہل ہی دن و کر دکھیں رات
یوں دیکھہ تو پس دے تن میں مجھکوں — نہ جاچہ نہ تن میں میں سیں مجھکوں
اس شغل کو بولتی ہیں ورد — یو صبح شام یو صبوحی
ہر دفعہ اوپر ہزار زاری — ہر بال پو لاک بیقراری
بن یار نہ کوی اور ہے یار — بن دوست نہ کو سرا ہے غم خوار
اب اک ہے وہی بلن وہ ہی کام — یو عشق جدھر لیکیا اودھر کام
ہے عمر سرا تو دس برس کا — جس عشق کو کچھہ پچھانتا ہے
بن عشق سرا برس ہے دس کا — مضمون ہے کہا سو جانتا ہے

جیسا کہ وہ خود آخر میں لکھتا ہے یہ مثنوی سن لگن سنہ ۱۱۱۲ ھ میں ختم ہوئی۔ وہ نہایت ایمانداری سے اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا اعتراف کرتا ہے اور صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ وہ اصول شعر اور فن شاعری سے نا بلد ہے۔ انھوں کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا نہ کسی شاعر اور عالم کی صحبت سے مستفیض ہوا نہ دور دراز کا سفر کیا اور نہ تجربہ حاصل کیا اور عمر بھر گوگی میں رہا ان کے والد ظہور الدین برہان الدین اولیا چشتی کے مرید تھے اشعار

میں شعر تو بول جانتا نیں — یو بت نپٹ پچھانتا نیں
مجھکو نہ سفر سبق نہ صحبت — گوگی منے کی یہ عمر اکارت
یک حرف مجھے نہ کن پڑھایا — قائل چھاڑیا نہ پھر پھرایا
جس فی المحل انتہے اول پان — دیویں تو سری تو شاہ برہان
تھا باپ مرا مرید اس گہر — اس گور سوں کہا آپس کوں گوہر
اس گہر سوں مجھے بھی بندگی ہے — مجھہ جیو میں جوت ہوچکی ہے

ایک دیوان، ایک مثنوی من لگن، جس کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے اور ایک نظم ہلاپ نامہ بحری سے یادگار ہیں۔ ایک قلمی نسخے کی صورت میں یہ کل کتابیں میرے پاس موجود ہیں۔ ان صفحات میں آئندہ میں اسی قلمی نسخے کو الف سے تعبیر کروں گا۔ بدقسمتی سے کتاب کا آخری حصہ جس میں تاریخ تصنیف کتاب ضرور رہی ہوگی اور جس سے بہت ممکن تھا کہ تاریخ تالیف کتاب معلوم ہوجاتی ضائع ہو گیا ہے۔ دوسرا قلمی نسخہ (ب) جو صرف مثنوی من لگن پر مشتمل ہے مولانا عبدالحق نے از راہ کرم مجھے عنایت فرمایا ہے اس نسخہ پر سنہ ۱۲۵۰ھ کا سنہ پڑا ہے۔ من لگن کا ایک بہت پرانا چھپا ہوا نسخہ بھی دستیاب ہوا ہے جسے میں ان صفحات میں "ج" سے تعبیر کروں گا۔ یہ نسخہ بمقام مدراس سنہ ۷۲-۱۲۷۱ھ میں چھپا ہے اور حسب ذیل الفاظ پر ختم ہوتا ہے: —

الحمدللہ کتاب من لگن بتاریخ بست هشتم رمضان المبارک سنہ ۱۲۷۱ھ ہجری در مطبعہ عظیم الاخباریہ بہ اہتمام ہمام جناب منشی غلام حسین صاحب بزیور طبع مزین گردید۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کاتب کا قطعہ تاریخ بھی موجود ہے —

ازیں دو گنجینۂ حقائق نقد   پایۂ عارفان بود مرفوع
گفت سالش دلم ز رائے ثبات   منطق و من لگن مطبوع

من لگن در حقیقت ایک طویل مثنوی ہے جو نسخہ الف کے ۱۱۰ صفحات پر، نسخہ (ب) کے ۱۴۳ صفحات پر ختم ہوتی ہے۔ نسخہ "ج" میں تو یہ مثنوی ۲۲۴ صفحوں پر آئی ہے —

اہل تصوف کے نزدیک پہلی منزل تزکیہ اخلاق کی ہے۔ ان کے نزدیک صاحب اخلاق وہی ہیں جو خواہشات نفسانی اور حرص وآز کے پھندے سے نکل کر مکارم اخلاق کے خواہاں ہوں۔ اپنے دلوں سے جھوٹ، کبر ونخوت، ایذا رسانی، غیبت دور کر کے اخلاق حسنہ کی طرف رجوع ہوجائیں۔ بحری کے نزدیک بھی ایک سالک

خدا کے لئے تزکیہ نفس پر زور دینا نہایت ضروری ہے - اخلاق کی درستگی اور پاکیزگی نہایت ضروری ہے - جذبات لطیف کے ابھار کے پر وہ بھی بہت زور دیتا ہے - سچائی انسان کا جوہر ہے اس لئے اس کا حاصل کرنا ضروری ہے - خود اعتمادی - عدل و انصاف پسندی حلم جو کی انسان کے لئے ضروری ہیں کیونکہ ان کے بغیر زندگی مکمل نہیں ہو سکتی اور قناعت الله کا رتبہ نہیں حاصل ہو سکتا یہ سادی دنیا ایک قسم کی بھول بھلیاں ہے جو اس میں پڑا غارت ہو - عمر عزیز کو تلاش معاش میں بیکار صرف کرنا عقلمندی کی نشانی نہیں —

ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

کچھ خوب نہیں یہ بے اکاسی / لے کچھ بھی تو پھٹکی نہ حاسی
ہاں خیر کو چاہ چھوڑ دے شر / یو خیر یو شر ہے تا کہ محشر
رکھ بیٹ اول آ پسکی بہت / آ پس کی سلجھاں آ سمجھت
مت کھول اگر جو کھو لنا ہے / تب کھول جو سانچ بولنا ہے
ایک جھوٹ سوں دوجہاں لرزتا / دھرتی-وں مل آسماں لرزتا ہے
غیبت نکو سن سری بنا تی / غیبت کو برا وکہے زنا تی
گر کوی نری سوں رنج پائیگا / تو ہات سوں ہے سو گنج جائیگا
پڑ رہ نہ پکڑ سرا کسی کا / نا آس نہ آسرا کسی کا
یو علم فنا بقا ہے انصاف / ہر بات کو بد رقہ ہے انصاف
ہر بھانت بھی ابھر اُڑا دھول / الله کے کلام سوں ہو مشغول
اس نان کے تیں ہوا ہے لت پت / سب عمر اسی رہتھمیں گئی کھپت

ایک مرتبہ بصری کے پیر ومرشد نے اس سے کہا - اس سو سال کی ریاضت ا مصلحت کے بعد مجھے صرف دو سبق ملے ہیں - ایک قناعت کا دوسرا ترک دنیا کا - ۵ ایک بات ہمیں اور معلوم ہوئی ہے وہ یہ کہ روزی کا دینے والا صرف رزاق مطلق ہی

اسی پر ہماری روزی کا انحصار ہے اور دوسرا روزی دینے والا یہاں کوئی نہیں - اگر قابل قدر کوئی شے ہے تو وہ راست بازی ہے ' اگر محبت کے قابل کوئی چیز ہے تو وہ عرفان ہے جس کی بدولت دنیا حقیقی بہشت ہوجاتی ہے -

نہ دوست نہ یار آشنا پر　　ہے روزی تیرا سرے خدا پر
ہونا ہے جو دوست دھرم کا ہو　　ہونا جو شریک شرم کا ہو
ہونا تو عزیز بس ہے عرفاں　　جس تجھ تی ہو سکل گلستان

طلب حق پر بحث کرتے ہوئے پہلے تو وہ عمر گذشتہ پر کف افسوس ملتا ہے لیکن بعد میں سنبھل کر کہتا ہے اب پچھتائے کیا ہوت جو کچھ ہونا تھا ہو گیا - اب ہماری عاقبت بس اسی میں ہے کہ یہ دو گھڑی کے چار دن رہ گئے وہ خدا کی معرفت حاصل کرنے میں صرف کریں کیونکہ وہی پھول اور کانٹے دونوں کی پرورش کرنے والا ہے اور باغ عالم کے چپے چپے کو روشن اور منور کرتا ہے -

جو شخص محبوب حقیقی سے منحرف ہو کر لذات نفسانی میں پڑ جاتا ہے وہ دامن انسانیت پر ایک بد نما داغ ہے اس کو انسان کہنا انسان کی تذلیل کرنا ہے - بحری کے نزدیک بہترین انسان وہی ہے جو محبت کی چتا میں جل کر ستی ہو جائے کیونکہ ایسے ہی لوگ حیات ابدی کے مستحق ہیں —

لہذا ہماری بہتری بس اسی میں ہے کہ ہم اس سے پریم بیوہار کریں متلاشی حق کو سب سے پہلے اپنی معرفت ضروری ہے میں کون ہوں - ' کیا ہوں ' ' کہاں سے آیا ہوں ' ' کہاں جاؤں گا ایسے سوالات ہیں جو اپنی معرفت کے لئے لازم ہیں اگر کوئی واقعی معرفت خداوندی کا حقیقی متلاش ہے تو اسے نا امید نہ ہونا چاہئے خدا کے لطف و کرم پر اس کو ایمان لانا ضروری ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ وہ اس زندگی کو بہترین طریقے سے صرف کرے —

وہ پیو جو پالیا ہے کل کون　　کانٹے کو کرم کرے جو گل کون
جی من جر پیا سو مکھ موڑ یا　　پر پنچھی ایا پیا کو چھوڑ یا

اس میں نہ کہوں اوس سے تن ہے — اس میں کو کہوں جس سے جو میں میں ہے
اس دوست کو دوستی رکھا ہے میں — جس دوست کوں دوست دوست دشمن
بھلے تو ایسی پھھاں بارے — تو توں ہے کیا سو [illegible] بارے
رکھتا ہیں کر جو تو ہے بیہودی — رحمت سوں خدا کی نا امیدی
توں عمر دیکھی ہے تو نہیں ہے — اس عمر کی تجھ قدر نہیں ہے

فضیلت انسان

دل صوفیائے کرام و ویدانتی اور سچ پوچھئے تو ہر عارف خواہ وہ کسی قوم یا ملت کا ہو انسان کو ابدی سمجھتا ہے یہ درست ہے کہ اس کی ظاہرا شکل و صورت میں تبدیلی ہوتی رہتی اور وہ قانون قدرت کے مطابق پیدائش تا ابد کی انحطاط ضعیفی اور موت کے مختلف مدارج طے کرتا رہے لیکن موجودہ ان سب باتوں کے اس کی روح پھر بھی ان تمام ردوبدل سے بری ہے روح تو کسی حال میں زوال نہیں یہ ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ رہیگی ---

دوسرے عارفان خدا کی طرح ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ اگرچہ انسان کا تعلق جسم فانی سے ہے جو ضعیف و زار ہے زوال پذیر ہے اور جو ظاہرا دنیا کے علائق میں بہت جکڑ دیا گیا ہے لیکن فی الحقیقت پھر بھی وہ کسی کا پابند نہیں یہ تمام قیود اور پابندیاں اس کی آزاد روح کو پابند علائق نہیں کر سکتی یہ وہ طایر نہیں جو اسیری میں پرواز سے محروم ہو جائے - روح لازوال ہے ابدی ہے خدا نے اس کو قدامت بخشی ہے اس لئے کوئی شے اسے پابند سلاسل نہیں کر سکتی —

انسان نور قدیم ہے - وہ اشرف المخلوقات ہے - اور وہی کل مقدس کتابوں کا سرچشمہ ہے - نہ تو وہ جسم ہے اور نہ خواہشات انسانی کا مجموعہ اور نہ وہ دنیائے موہوم کا عکس ہے اس کا درجہ ان سب سے کہیں زیادہ اعلا و ارفع ہے -

یہ ھک ہے جدید آدمی آد — اس گھر کو یہ آدمی ہے بنیاد

اس آدمی بیچ کیا کمی ہے ‏ ‏ ‏ سدکیان کی صورت آدمی ہے
تھا آدمی آدم میں مکرم ‏ ‏ ‏ اب کیا تو کہو طلسم اعظم
یو بید پراں اے سکھڑ ہن ‏ ‏ ‏ سب سن سوں ترے ہوے ہیں اتپن

موت انسان کا انجام نہیں ہوسکتی نہ قیامت اس نور قدیم کو فنا کرسکتی ہے۔ وہ ہمیشہ سے ایک ہی رنگ میں رہا ہے - نہ تو وہ چاند ہے اور نہ سورج ' وہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہیگا - اس کی زندگی خدا کے کلام سے وابستہ ہے لہذا اس کا فنا کرنے والا اس زمانے میں کوئی نہیں —

آیانہ کہیں سوجان ہے تاں ہے ‏ ‏ ‏ اک دشت پایت درمیان ہے
انجام کہے تو اے برادر ‏ ‏ ‏ نامرگ اسے ہوسکے نہ محشر
یعنی نہ یو شمس نا قمر ہے ‏ ‏ ‏ اللہ کے اسرسوں امر ہے

عرفان

صوفیائے کرام نے عرفان کی اہمیت اور قدر و منزلت پر بہت زور دیا ہے ان کی تصانیف میں اس موضوع پر نہایت وضاحت سے بحث کی گئی ہے - بحری نے بھی اس موضوع پر خوب خامہ فرسائی کی ہے - من لگن کے آٹھ صفحے اس موضوع سے رنگ دئے ہیں - سب سے پہلے وہ "عرفان" کی تشریح کرتا ہے اس کے خیال میں عرفان اور گیان میں کوئی فرق نہیں —

کہتے ہیں عرب اگر یہ عرفان ‏ ‏ ‏ ہن ہند کے لوگ بولتے گیان

عرفان ہی سے امر شناسی نصیب ہوتی ہے - جس نے عرفان کو سمجھ لیا اس نے گویا تمام دنیا کے علوم و فنون سے واقفیت حاصل کرلی - عرفان ہی سے مخلوقات کی اصلیت و ماہیت معلوم ہوتی ہے - گیان خواہ ظاہر ہو یا نہاں فوائد سے خالی نہیں — عرفان ہی کی مدد سے انسان زمین آسمان کوہ دشت کے رازہائے سربستہ کو منکشف کرسکتا ہے - عرفان کا تذکرہ متبرک کتابوں میں کیا گیا ہے - لیکن اس کا حاصل کرنا معمولی کام نہیں - صرف وہی عرفانی اور گیانی کہے جاسکتے ہیں جو

زندگی کے اعلیٰ مدارج کو طے کرکے اس کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہوچکے ہیں۔ خدا نے جنہیں چشم بصیرت عطا کی ہے وہ دنیا میں گیان ہی سے سروکار رکھتے ہیں اسی پر مرتے ہیں اسی سے جیتے ہیں دنیا کی اور دوسری چیزیں ان کے نزدیک فضول اور باطل ہوتی ہیں گیانیوں ہی سے انہیں محبت ہوتی ہے اور وہ گیان ہی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گیان کے حاصل ہونے ہی سے انسان ترک الدنیا ہوکر پریم کی آگ میں بھسم ہوجاتا ہے آرزوؤں کا فقدان ہوجاتا ہے - تمنائیں ختم ہوجاتی ہیں - دل میں صرف ایک شے باقی رہجاتی ہے اور وہ خدا کی محبت ہے یہی سچے گیانی کی نشانی ہے —

غرضکہ اس تمام بحث سے یہ ظاہر ہوگیا ہے کہ عرفان منبع محبت ہے اور محبت منبع دین ہے اور ہر زمانے میں متلاشیان حق نے گیان حاصل کیا ہے انہیں بزرگوں نے سچی روحانی ہدایت حاصل کی ہے

شعر

جو گیان کہے سو گیان پرکاش   دیتا ہے یو گیان کہو دھنی کہے
جو بید پران شاستر گیان   ابر اجھو ہورتے آتمو گیان
اس گیان کو گیان ہی رچھاوے   اس گیان کو گیان ہی کوجاوے
گیانی ہوتا گیان کو پکڑ خوب   گیانی ہے سب توگیان محبوب
گیانی ملے جب یو گیان اوے   ویران کرکے آپس بساوے
اے عشق تو کاں گیا شتاب آ   ات گرم ہو جیوں کہ آفتاب آ
ہر دور میں ایک دوجے گیانی   اس گیان کو پورن کر پچھانی

دوسرے سیاروں کے رہنے والے بھی اکتساب علم حقیقی (عرفان) کو اپنی زندگی کا مقصد واحد سمجھتے ہیں - ملائک تک علم حقیقی کے سامنے سرنیاز خم کرتے ہیں صرف انسان ہی نہیں بلکہ کل موجودات عالم عرفان کے حکم ناطقہ پر چلنے کی کوشش کرتی ہے —

یو گیان ہوا ملک کوں مسجود   یو گیان ہوا فلک کوں مقصود
اس گیان کو سب سوں کری او   آدم کی اگی نہ سر دھری او

وجود ملکوتی

کل عرفان خدا ایک وجود ملکوتی کے قائل ہیں سبھوں کا خیال ہے کہ اس عالم سفلی کے علاوہ ایک عالم اور بھی ہے جو اس سے کہیں زیادہ بالاوبرتر ہے۔ بحری اس ان دیکھی دنیا کا معتقد ہے۔ اس کے نزدیک جسم ایک غلاف ہے جس میں ایک لطیف شے (روح) مسکن گزیں ہے یا یوں کہیے کہ جسم کھال یا چھلکا ہے۔ گودا یا گری اس کے اندر پنہاں ہے۔ روح قدیم ہے اور جسم جدید اول الذکر قوی ہے مگر موخرالذکر ضعیف۔ موت اور نیند سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بدن کثیف ہے مگر روح صاف شفاف ہے مرشد کی صحبت اور غور و فکر کی مدد سے ہم اس لطیف شے کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔ پھر اس کی تہ میں ایک لطیف شے اور ہے۔ اس کا نام 'کارن' ہے یہ چیز لطیف ترین ہے اور اس کا سمجھنا ذرا بہت مشکل ہے۔

اے دوست او تن جو سکشمی ہے   کچھ بول جو جیو میں جو رہے
فلموت کو ستے سروت   فا نیند کو اس اوپر ہے قوت
میلا ہے یو تن او صاف سمجھو   اس تن کو یو تن غلاف سمجھو
او دیہہ قدیم یو نوی ہے   یہ دیہہ ضعف او قوی ہے
اس سول کے بیچ اور کارن   برزخ سو تو سوکشم بھی ہاں گن

صاحب بیلش اور وحدت وجود

بحری کے نزدیک صاحب بیلش وہ ہے جو موجودات عالم میں اتحاد اور یگانگت دیکھ سکے۔ دودھ، دہی، مکھن، مٹھا سب میں دودھ کا عنصر غالب ہے اور ایک ہی چیز مختلف طریقوں سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ اسی طرح خدا ہر شے میں ساری و طاری ہے۔ اور وہ مختلف شکلوں میں انسان کو اپنا جلوہ دکھاتا

رهتا ہے۔ ہر شے کو مظہر ذات باری سمجھو "ہرچہ بینی بدان کہ مظہر اوست"۔ انسان وہی ہے جو نیرنگی عالم کو دیکھتے ہوئے بھی یکرنگی کو فرو گذاشت نہ کرے اور فنا فی اللہ کا درجہ حاصل کرنا ہی سعادت سمجھے۔ فی الواقعی صاحب بینش وہی ہے جو حسن معانی میں جذب ہو کر اپنی ہستی مٹادے۔ جس صورت شکر پانی میں مل کر اپنی ہستی فنا کر دیتی ہے ویسے ہی انسان کو چاہئیے کہ ذات باری میں محو ہو کر اپنی ہستی فراموش کردے کیونکہ یہی راز زندگی ہے اور یہی اصول حیات ہے —

ہر کار منے ہے نور اس کا ہر بار منے ظہور اس کا
یو کیاں فوا ہے یا پرانا ہوتا نہ ادک نہ کم ہو جانا
اللہ سوں دل نہیں ہیں سکو تو جن کرو دوں دلشکر کو

فضائل روح

دنیا کی سروں، زیبائش اور حسن محض روح سے ہے۔ روح جسم پر حکمران ہے روح عکس عالم ہے جنہیں منعم حقیقی نے چشم بصیرت دی ہے اس کے فضائل سے متاثر ہوتے ہیں —

عاشقان روح شاہدان خوش رو سے دل نہیں لگاتے انسان روح کی اہمیت اور اس کی قدر و منزلت نہیں سمجھ سکتا۔ صرف خدا ہی کو روح کی ماہیت معلوم ہے —

۱- اس روح نے ہے جگت کو رونق بہرام سوار بو جیو کی خورنق
۲- اس پلنگ پٹن کو روح راجا یت اس کوں نظر نہ دوسرا جا
۳- یو جیو تر انجھ آئنہ ہے سب اس میں جو تجھ معائنہ ہے
۴ دیکھا ہے جمال جیو کا جن جانے ہے کمال پیو کا تن
۵- جس بھید کہیں سو او ہے اولا جانے وہ ہے ایک حق تعالی

اسرار نفس

دل خدا کا مقام ہے اور پیغمبر کا مسکن۔ محبوب ازلی ہمیشہ ہمارے دلوں میں رہتا ہے پھر ایسی حالت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باوجود اس حقیقت کے ہمارا دل اس کی تلاش و جستجو میں دیوں سرگرداں اور پریشان رہتا ہے ـ

روح جمیل ہی ہے اور مظہرالعجائب بھی۔ دل خدا کا عرش بریں ہے ' اس میں مصطفیٰ کا نور ہے ۔ یہ فضائل عام سے بالا مال ہے ۔ اس کو زوال نہیں۔ روح دانا ہے عقلمند ہے۔ اس کی قسمت میں قسام ازل نے "(ابدی)" لکھدیا ہے۔ اگر روح کا وجود نہ ہوتا تو کوئی اور انسان کا وجود کہاں سے ہوتا۔ روح ہر قسم کے علم سے متصف ہے لہذا ہمیں ہیوں اس کے خلاف عمل نہ کرنا چاہئے ـ

۱۔ اوردن کہ جو عرش ہے خدا کا ۔۔۔ منظور نظر ہے مصطفیٰ کا

۲۔ سادام او دست دل میں بسنا ۔۔۔ یہ کیا جو دل اس لئے ترستا

۳۔ یو جیو جمیل تن ہے قائب ۔۔۔ یو من اہے مظہر ا لعجائب

۴۔ سن کہ تو محل ہے خوش خدا کا ۔۔۔ سن نور ہے پاک مصطفیٰ کا

۵۔ جگ جام منے یو من ہے جیوں مد ۔۔۔ سن عین حقیقت محمد

۶۔ دانا ہے یو دل یو روح بیدا ۔۔۔ اس نفس کے تیں لکھا ہے جینا

اسرار بیخودی و ذکر منصور اناالحق

صوفیوں کے نزدیک وجود انسانی جسم' روح اور حواس خمسہ پر مشتمل ہے ؛ یہ اشیائے ثلاثہ وصل و اتحاد میں رکاوٹیں پیش کرتی ہیں۔ دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ انسان در حقیقت روح ہے اور خصوصیات خداوندی کا شریک ہے' لہذا یہ ضروری ہے کہ طالبان صراط مستقیم رفتہ رفتہ خواہشات نفسانی پر قابو پالیں ورنہ خدا کا دیدار نہیں نصیب ہوسکتا اور نہ وہ حقیقی معنوں میں خود بھی طالب وصل ہوسکتے ہیں۔ روح انسانی اور روح اعلیٰ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے' دونوں قریب قریب ایک ہی ہیں جو لوگ روحانی زندگی پر ایمان لاکر اُس کے مطابق اپنی زندگی کی نشو و نما چاہتے ہیں وہ مجبور ہو کر

ملی الاعلان پردہ دوئی کے ٹکڑے ٹکڑے کردیتے ہیں اور من وتو سے بے نیاز ہوکر اتحاد وصل کا راگ الاپتے ہیں۔ ان کے نغموں میں دلکشی ہوتی ہے۔ دنیا ان کی قدر کرتی ہے کیونکہ انہیں کے باعث تو دنیا کا وجود ہے۔ اسی کو بحری راز خودی اور اناالحق کے نام سے تعبیر کرتا ہے —

۱ — اس وقت میں بیخودی سوہے گا — جو خود فیض نور ہے خدا کا

۲ — ہر مجھ دو تو وہ ہوتا ہے تجھ پہ شاد — تو لے نہ خودی خدا کی سوگند

۳ — جس جان خودی سوں آ سند ہے — تس پاس خودی نہیں خدا ہے

عارفان خدا اور ان کی چشم بصیرت کا تذکرہ کرتے ہوئے بحری رقم طراز ہے کہ ان کی نشانیاں عجیب ہیں اور اس قدر کثرت سے ہیں کہ ان کا امتیاز کرنا بھی ذرا مشکل ہے۔ ان کے عادات و اطوار عام لوگوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ذات باری میں وہ اس طرح محو اور مستغرق ہیں کہ انہیں دنیا کے دیکھا بھی بالکل منظور نہیں۔ دنیا ان کو خدا کے سچے دوست سمجھ کر یاد کرتی ہے۔ بیشک یہی خدا کے دوست ہیں اور دونوں کے محبوب ہیں۔ جہاں ان سے محبت رکھتا ہے۔ جہاں جاتے ہیں ان کی قدر ہوتی ہے۔ دکھ سکھ میں وہ ایک ہی طرح رہتے ہیں۔ خدا نے ان کو مستقل مزاجی کی نعمت عظمیٰ سے بہرہ اندوز کر دیا ہے۔

۱ — پورا ہو ہوا ہے کیس دن کا — تب در جو گیا کہیں جن کا

۲ — ہیں ان کی علامتاں بھی بیارے — اس راہ سوں رسم سوں جدا رے

۳ — سپندا چھوے جاگرت کے تن میں — ہو روز بچھ بن داگرت سیں من میں

۴ — کارن رہے سوکشم سوں مل جو لی — استھول میں جو یکہ پوت میں سوں

۵ — نہ اس سنے نا و ہے نہ نازن — اک جانتی ترم اور کڑا ترا

۶ — کس پاس نہ ہاں مانگتے ہیں — ماس سوں نہ ماں مانگتے ہیں

۷ — نا لاگ رہے نہ چھوڑ دیوے — سکھ انکا یار طرف مڑ وڑ ے

۸ — میں توں سوں ہے توں نہیں تو میں نیں — بن دوسرے کہوں کلاویکا میں

۹- گرا پہ حق کی ذات میں محو   تا بول بیچار بات میں محو

' مفہوم '

رنگ سے محبت رکھنے والے رشی ہوتے ہیں - نغمہ صرف آگ ہی نہیں روشن کرسکتا بلکہ اس کی مدد سے شیر کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کئے جاسکتے ہیں - نغمہ تفکرات دنیوی سے بچاتا ہے - انسان کے دل میں پریم کی آگ بھڑکاتا ہے - ہر شخص نغمے سے متاثر ہوتا ہے - زیادہ تر وہ لوگ جو پہلے ہی کسی کے تیر نظر کے شکار ہوکر محبت کی دیوی کو سجدہ کر چکے ہیں - نغمہ انسان کو آلائش دنیوی سے بچاتا ہے نغمۂ حقیقی خواہشات نفسانی کو دور کرتا ہے --

یہ وہ لوگ ہیں جو ہر حال میں شکر ایزدی بجا لاتے ہیں یہ آرام اور تکالیف دونوں سے بے نیاز ہیں - ان کو نہ مرنے کا غم ہے نہ جینے کی شادی - وہ کسی کے سامنے دست طمع نہیں دراز کرتے نہ تو خود ان کی یہ خواہش ہے کہ لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سرنیاز خم کریں یہ وہ لوگ ہیں جو ہر قسم کے معائب سے بری ہیں - ان پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا صرف خدا ہی ان کا مرجع ہے- یہ وہ لوگ ہیں جو ہروقت خدا کے گیان میں محو اور مستغرق رہتے ہیں - انہیں اتنی فرصت کہاں جو دنیا کے جھگڑے بکھیڑوں میں پڑ کر عمر عزیز کو ضائع کریں - ان کے نزدیک وصل ہی بہترین زندگی ہے - خدا کی محبت میں ہر وقت مست رہنا اور اس کے نام کی مالا جپنا ہی ان کے لئے اصلی زندگی ہے - یہی وجہ ہے کہ لوگ رشیوں اور فقرا کو لازوال اور بقائے دوام کا مالک سمجھتے ہیں - باد مخالف ان کے شمع حیات کو گل نہیں کر سکتی یہ دنیا میں رہبر ازل ہو کر آئے ہیں - اگر تم کبھی ان سے باتیں کرو گے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ وہ کہاں تک خدا کے سچے شیدائی اور بھگت ہیں - " ذرہ ذرہ میں ہے جلوہ تیرا " کی صدائیں ان کے رونگٹے رونگٹے سے بلند ہوتی ہیں - ہر شے کو وہ مظہر ذات باری سمجھتے

هیں۔ "جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے" کے نعروں سے دنیا کو سکوں دے رکھا ہے۔ اس کا عدم وجود کا عدم ہے۔ اس کے بغیر دنیا ایک تودۂ خاک ہے اور کچھ نہیں تو یہ دنیا نغمہ کا بدن ہے۔ نغمہ پتھر کو پگھلا کر موم کر تا ہے۔ بجھے ہوے کوئلوں کو چنگاری میں تبدیل کر تا ہے۔ موسیقی غذائے روحانی ہے۔ یہ محبوب کو بھی پسند ہے۔

دنیا موسیقی کی مرہون منت ہے۔ اگر موسیقی نہ ہوتی تو دنیا کی ساری چہل پہل دفعۃً برد زمانہ کے نذر ہو جاتی۔ بیکار وقتوں میں بادشاہ کی انیس ہے۔ راگ روح کی زندگی قائم رکھتا ہے۔ راز ہائے سربستہ اس سے منکشف ہو تے ہیں۔ موسیقی اتحاد کا پہلا زینہ ہے۔ راگ سے متاثر نہ ہو نے والے آگ میں جھونک دینے کے قابل ہیں۔ وہ فی الحقیقت انسان نہیں کہے جا سکتے۔ ان لوگوں کو خدا نے درد مند دل نہیں عطا کیا۔ یہ سنگدل اور خشک پھیکے کہلاتے ہیں لحن داؤدی اہل درد کی غذا ہے۔ اسی کی بدولت وہ حسن و عشق کی دشوار گذار گھاٹیوں کو خوشی خوشی دم کے دم میں پار کر لیتے ہیں۔ نغمے سے عشق کی نشوونما ہے۔ اگر نغمہ نہ ہو تو عشق کی شوریدگی میں کمی آجائے۔ اور اہل دل لذت عشق سے عاری ہو جائیں۔ نغمہ ہی سے جوش و خروش عشق میں اضافہ ہو تا رہتا ہے اور ایسے ہی لوگ تو اولیا ہو تے ہیں —

۱۔ جوں راگ کو دوست کر لیا ہے | توں بوجھ او بیشک اولیا ہے
۲۔ یو راگ نہ آگ ہے جلاتی | یو راگ کے باگ پہاڑ کھاتی
۳۔ یوں راگ سوں روگ تن تی بھاگے | اس راگ سوں بھوک من میں جاگے
۴۔ ہر تن کو لگے یو راگ آلا | یو جھو جلیاں کی دل کو بالا
۵۔ بیراگ لاوتا ہے یو راگ | اس راگ کوں سول کیا تو بیراگ
۶۔ یو راگ خوراک جھو کا ہے | یو راگ خوراک پیو کا ہے
۷۔ اس راگ سوں رنگ ہے جہاں کو | اس راگ سوں سنگ ہے شہاں کو

۸- اس راگ سوں رنگ روح کوں ہے ۔ یو راگ سبب فتوح کو ہے
۹- جس جیو کے تئیں نہ راگ لاگے ۔ تس جیو بھلا جو آگ لاگے
۱۰- سانس نئیں سانس ہاڑ ہے او ۔ پولاد' پتھر' پہاڑ ہے او
۱۱- اس راگ سوں جوش دردکو ہے ۔ ہور اوفتہ خروش مرد کو ہے

غزلیات

اس مجموعہ میں کُل ایک سو گیارہ غزلیں ہیں - موضوع محبت ہے - عشق مجازی و عشق حقیقی پر نہایت زوروں کے ساتھہ بحث کی گئی ہے- غزلوں کے بعض بعض اشعار تو حقائق و معارف سے مالا مال ہیں - ان اشعار میں عشق حقیقی کا وصال ترک دنیا' ترک ارزو پر نہایت فریفتہ کے ساتھہ روشنی ڈالی گئی ہے - بعض بعض اشعار ذومعنی ہیں لیکن- تاویل سے عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں پر روشنی پڑتی ہے 'بحری' نے غزلوں میں جدت طرازی نہیں کی - اور یہ تو ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ اُردو اور فارسی شاعری میں ہمیشہ اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں' جو عشق کے دونوں رخوں کو ظاہر کرتے ہیں - طالب حق انہیں شعروں کو پڑھکر عشق حقیقی سے بہرہ اندوز ہوتا ہے- عاشق مجازی انہیں اشعار کو پڑھ کر معشوق مجازی کی یاد تازہ کرتا ہے --

پانچویں غزل جو کُل دیوان میں اپنی قسم کی ایک ہی غزل ہے بے نقط ہے- فارسی زبان کے ۳۲ حروف تہجی میں ۱۵ حروف بے نقط ہیں ہر شخص میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ غزل کی غزل بے نقط کہہ سکے اور پھر ایسے زمانہ میں جب اردو ابھی اپنے پیروں پر کھڑی بھی نہیں ہوئی تھی اور چند لوگوں کے سایۂ عاطفت میں گمنام پرورش پارہی تھی - اس سے 'بحری' کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے - اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بحری کو اُردو زبان پر کس قدر قدرت حاصل تھی - وہ غزل پوری ہوبہو درج کی جاتی ہے --

۱- محمد کر مدد ہوگا ہمارا ۔ سکل دکھہ درد رد ہوگا ہمارا

٢۔ اگر صحرا رہو من دام ہور دد — او سارا دام دد ہوگا ہمارا

٣۔ اگر دائم مکمل ... عدو ہو — او الله الصمد ہوگا ہمارا

٤۔ تو ... کا دم ہوہرگاہ — اگر تو لا احد ہوگا ہمارا

٥۔ موجود ... ہوں معبود — او احمد گر احد ہوگا ہمارا

ایک غزل میں وہ ترک وطن کا ارادہ کرتا ہے لیکن جب گہری محبت بہت ستاتی ہے تو ... ارادہ ... کر دیتا ہے۔ اور پھر تو ... کی محبت کی تسبیح ... ہے —

بھرے دو دلوں یوں ہے کہ جیو دل اور دامن ہے
بس دل دوں ہے لازم ہو دامن چھوڑ کہ جانا

ایک غزل میں اپنی معصیت کا بھی اعتراف کیا کرتا ہے اور اس کا تذکرہ نہایت گریہ و زاری کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب مایوسی بہت زیادہ ستاتی ہے پھر سے خدا کے خائف ہوتے ہیں۔ ... ہیں پھر ... میری مدد کیجئے ... میں نے اپنی تمام عمر لہو لعب میں ضائع کر دی ... تمہارے ہی وسیلے سے نجات ہوتو ہو اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں دکھائی دیتا۔ اگر تم میری مدد کرو تو کیا عجب میرا دامن معصیت بالکل دھل جائے۔ مدد کا وقت ہے ... مدد کیجئے۔ ورنہ میری زندگی کٹی ... میں ...

لیکن احساس کمزوری و معصیت سے ہمیں یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ ہمارا مصنف واقعی آلودہ دامن تھا۔ یہ تو قریب قریب ہر بزرگ کا وطیرہ ہے۔ جب کبھی انہیں کچھ ... کام کرنا ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے اپنی عبدیت اور معصیت کا اظہار کرتے ہیں

اچھا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس اظہار عبدیت و معصیت کی کوئی وجہ بھی ہے۔ کیا وہ اپنی معصیت عظیم کی وجہ سے استغفار کرتے ہیں۔ نہیں نہیں وہ لوگ اظہار معصیت محض اس لئے کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی عبادت زہد و تقویٰ پر تکیہ

کر کے بیٹھ نہ جائیں۔ انہوں کہیں اپنی رسائی پر غرور نہ آجائے کیوں کہ دنیا میں ان لوگوں سے زیادہ بیوقوف اور نادان اور کوئی نہیں ہے جو اکتساب فضل پر قانع ہوجائیں۔ عزازیل کی مثال ان کے سامنے موجود ہے۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ انسان کو ہر وقت اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہنا چاہئے کیوں کہ اسی میں اُن کی فلاح ہے —

سنت دیویلدے مطابق ہمارا مصنف بھی اپنے لئے ایک تخلص تلاش کرتا ہے اور بڑی چھان بین کے بعد تخلص 'بحری' کا اپنے لئے انتخاب کرتا ہے۔ جیسا کہ عام اُردو اور فارسی شعرا کا دستور ہے 'بحری' بھی غزل کے آخر میں تخلص لانے کی کوشش کرتا ہے لیکن دکھن کے دستور کے مطابق کہیں کہیں وہ اپنا تخلص بدل بھی دیتا ہے۔ چنانچہ ہر غزل کے آخر شعر میں 'بحری' تخلص کرتے کرتے کبھی کبھی محمود بھی لکھ جاتا ہے جو اس کا اصلی نام ہے —

محمد کا معما کھول 'محمود' او احمد کر احد ہوگا ہمارا

بعض بعض غزلوں میں تو ضرورت شعری کی وجہ سے مقطع میں تخلص بجائے 'بحری' کے 'بحریا' باندھا ہے —

اس فنا میں جو بقا کا بھید ہے سو بحریا جیوتی مرتے جیا اسی وجیان کو پوچھیا

شعرائے فارسی کے نزدیک تو یہ جایز ہے لیکن زمانۂ حال کے شعرا اسے معیوب سمجھتے ہیں —

ایک غزل کے مقطع میں وہ اپنا نام اور تخلص دونوں بڑی خوبی سے لاتا ہے —

محمود کوں بحری جو لقب ہے یارب . . ..

اگرچہ تمام طور سے بحری معارف نگار ہے کیونکہ فی الحقیقت اس کی شاعری میں تصوف کا رنگ زیادہ غالب ہے ' لیکن بعض بعض موقعوں پر اس نے عشق مجازی کے مختلف مرحلوں کو بھی نہایت کامیابی کے ساتھ دکھایا ہے عشق مجازی کو نہایت وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ وہ بھی معترف ہے کہ عشق مجازی عشق حقیقی کا پیش خیمہ ہے۔ عشق مجازی ہی سے وہ عشق حقیقی کی طرف

رجوع ہوا ہے، وہ کثرت ہی سے وحدت کی طرف آیا ہے۔ عشق مجازی ہی کے طفیل میں مایا کے مختلف منازل مراحل طے کر کے وہ اب اس قابل ہوا ہے کہ خدا کا گیان حاصل کر کے اس پر اپنا تن من دھن سب نچھاور کردے۔ وہ مایا سے پریشان ہوکر پریم کی اس دہکتی ہوئی آگ میں کودنا چاہتا ہے کیونکہ اس پریم کی آگ سے حقائق و معارف کے سلسلے بلند ہو ہو کر انسان کو روحانیت کی طرف لے جاتے ہیں —

١- مجھے اس مکتب مجازی میں جو عشق استاد نہ ہوتا
تو میرے دل سوں کثرت کا سبق برباد نہ ہوتا

٢- جیوں کو ماٹی میں ست اس من کو نپجایا سو تو نپجے
اد مورت پرورش پاوے دوں من سعد ہو

٣- تن کو دھو اس من میں من ہودا یکایک صفت میں
جیو اپنے جیو کوں ماتو ملایا من ہوا

مراثی

اس مجموعے میں چار مراثی ہیں۔ لیکن ایک مرثیہ بھی واقعات کربلا کو جاندار وضاحت کے ساتھ نہیں بیان کرتا۔ اگرچہ بعض بعض جگہ شہادت حسین کی طرف اشارہ ضرور کیا جاتا ہے۔ ایک مرثیے میں تو صرف فضائل محرم سے بحث کی گئی ہے۔ شروع میں مرثیہ جو مصرع ہوا کرتا تھا لیکن بعد میں وہ مسدس کی شکل میں آگیا۔ مگر بحری اس روش سے بیگانہ ہوکر غزلوں اور سلاموں میں مرثیہ گوئی کرتا ہے۔ ایک مرثیے کے شروع اور آخر کا شعر ملاحظہ ہو۔

یو محرم کبھوہ آج کام کیا　　سوا کیا جگ پر سکہ حرام کیا
شہ سوں پایا شفاعت اے بحری　　جب توں یو مرثیہ تمام کیا

دوسرے مرثیے کے چند اشعار بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے —

١- جب شاہ کے وجود مبارک پہ غم ہوا　　تب سب جہاں کی حرمت خوشی کا عدم ہوا

۲- پیغمبراں میں جیوں کہ محمد سوں ختم ہے — یوں غازیاں میں شہ کی عزا سوں ختم ہوا

۳- ہے کوئی دل میں شاہ کے غم کا نہال لایا — او دل یقیں کہ حشر کوں باغ ارم ہوا

۴- 'بحری' مدام شاہ کے ماتم میں یوں کھلے — جیوں چاند آسمان پہ گل گل کے کم ہوا

قصائد

اس نسخے میں صرف دو قصائد ہیں اور دونوں شیخ محمد باقر (رح) کی تعریف میں لکھے گئے ہیں۔ پہلے قصیدے کا آخری شعر نہایت معنی خیز ہے —

سچ کہنا سچ میں رہنا سچ سہنا سچ میں بہنا

مثلث یا مسدس نہیں ہیں۔ ناظرین کی تفریح طبع کے لئے ایک درج ذیل دیا جاتا ہے —

مرشد مرا محمد تو حق دی مارگ لایا
حق کی نظر سوں شاہ اپنا معنی حق سمجھایا
تو پن تہا سو دور کر حق میں سمایا

بنگاب نامہ

میرے خیال میں کسی دوسرے شاعر نے بنگاب کو شراب معرفت کے معنی میں استعمال نہیں دیا۔ اہل تصوف تو اس کو شراب ہی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 'بحری' نے بجائے لفظ شراب استعمال کرنے کے بنگاب کیوں استعمال کیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ وہ شیو بھگتوں سے زیادہ میل جول رکھتا تھا اور یہ شو بھگت وہ لوگ ہیں جو بنگاب کو شراب معرفت سے تعبیر کرتے ہیں۔ 'بحری' ان لوگوں سے مراسم رکھتا تھا اور یہ لفظ اس نے انہیں لوگوں سے لیا ہوگا۔ بہرحال یہ تو قیاس ہی قیاس ہے لیکن اس سے کم از کم اتنا تو ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا مصنف کس قدر روشن خیال اور بلند نگاہ ہے اور وہ کس قدر

اپنے پڑوسیوں کے ساتھ میل جول رکھتا ہے ۔ اس نظم کو بارہ جام میں تقسیم کیا ہے اور ہر جام میں بنگ اور بنگاب کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں —

بنگ فارسی لفظ ہے اس کو سنسکرت میں بھنگ کہتے ہیں بھنگ ایک منشی گھاس ہے شراب کی طرح اس کو پی کر انسان کو ایک عجیب قسم کا سرور حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس گھاس کی پتیوں اور دوسری چیزوں کے ملانے سے بنتی ہے مگر اصطلاحاً بھنگ کے معنی عرفان اور گیان کے ہیں ۔ اصطلاح میں بھنگ حقیقت کل کو بھی کہتے ہیں جو غیر عادت اور ہر شے کا اصول کہلاتی ہے ۔ لیکن اس تمام حقیقی کو صحیح صحبت کی مدد سے حاصل کر سکتے ہیں۔ محبت بغیر علم حقیقی ہے پہلے عاشق صادق ہو اور راز ... تم پر خود بخود منکشف ہو جائیگا - اس کی مرضی کو اپنی مرضی سمجھو اور اس میں محو و مستغرق ہو جاؤ۔ مگر یہ محویت اور یہ استغراق صرف خودی مٹا کر نصیب ہو سکتی ہے اس کے حاصل کرنے کے لئے اس میں ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ شراب محبت ہے کیونکہ شراب محبت دافع خودی ہے اور یہ خودی محویت و استغراق کا پیش خیمہ ہے

اگر یہ نکات ذہن نشین کر لئے جائیں تو اس نظم کا سمجھنا بالکل سہل ہو جائیگا اور پھر لطف دوبالا ہو جائیگا ۔

بنگاب نامہ بارہ قطعات پر مشتمل ہے - ہر قطعہ کا نام جام رکھا گیا ہے تاکہ بنگ کی تمثیل برابر نظر کے سامنے رہے ۔

جام اول

بنگ سے مراد علم قدیم ہے - بنگ سبب ہے اور محبت اس کا لازمی اثر - جس طرح سبب کا نتیجہ اثر ہوتا ہے اسی طرح بنگ کا نتیجہ محبت ہے - محبت اثر ہے اور اسی اثر میں کو ہر ہستی کا مسکن ہے یہ گویا جوہر الفت کی شمع ہے - اس بنگ سے آدم صفی کا وجود ہوا - صرف آدم صفی ہی میں بنگ نے اپنا پورا پورا اثر دکھایا ہے - بنگ امانت ہے مگر اظہار نہیں اور اسے تم بنگاب میں

نمایاں دیکھ سکتے ہو —

جام دوم

بھنگ بادشاہ عالم ہے - یہ شاہی جواد مطلق نے اپنے ہاتھوں اُسے عنایت فرمائی ہے - یہ فلسفہ اخلاق کا جو ہر ہے نہوں نہیں بلکہ یہ بنائے اخلاق ہے۔ بنگاب رہنمائے عالم اور معلم کل ہے —

جام سوم

بنگاب لازوال ہے اور لاانتہا - مگر اس کا سلسلہ ہر شخص کی قسمت میں نہیں مگر کوشش کرنا تمہارا فرض ہے - اس سر چشمہ بنگاب پر سر نیاز خم کرو کیوں کہ اس کا ایک شمہ بھی تمہاری مصیبتوں کو دور کردیگا۔ یہ تحفہ ملکوتی ہے۔ یہ تمہارے لئے آب حیات سے کم نہیں وغیرہ وغیرہ —

جام چہارم

بھنگ سات صفات پر مشتمل ہے - ان میں سے پانچ تو حواس خمسہ ہیں جنکی بدولت ہمیں عالم ظاہر کا علم ہوتا ہے - انہیں حواس خمسہ کی بدولت ہم میں کام کرنے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے اور اس کی بدولت ہم دنیا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں - اس کے وجود کے متعلق شبہ کرنا عقلمندوں کی نشانی نہیں۔ نہ تم یہ گمان کرو کہ بھنگ بلکل فضول ہے۔ یہ کل چیزوں سے اعلیٰ و ارفع ہے —

جام پنجم

بھنگ سے مراد ذات باری ہے - ایک زمانہ وہ تھا بھنگ بنگاب سے بے نیاز تھا جب سے اطمینان کلی نصیب تھا اور اپنی ذات پر نازاں تھا - یہ اس وقت کا تذکرہ ہے جب نہ آسمان تھا اور نہ لوح و قلم، جب موجودات عالم کا پتہ بھی نہ تھا اور جب چار دانگ عالم میں ہر طرف اس کا ظہور تھا لیکن آخرکار اُس ذات مطلق (بھنگ) سے عالم ظاہر کا وجود ہوا اور پھر اُس سے دوسری چیزیں چیز وجود میں آگئیں —

جام ششم

بنگاب کو پیالہ میں سبز مگر اندر سرخ دیکھکر شاعر اس کو حنا سے تشبیہ دیتا ہے جس کی ہری پتیاں دست معشوق کو سرخ بنا دیتی ہیں—

غرضیکہ اس کے نزدیک بھی انسان کو ظاہری صورتوں پر نہ جانا چاہئیے کیوں کہ وہ ہمیشہ دھوکا دیتی ہیں - جسے تم حقیقت اور اصلیت سمجھے ہو وہ ہر حقیقت اصلیت نہیں ہے اور جسے تم اصلیت و حقیقت نہیں سمجھتے وہی فی الواقع حقیقت ہے

جام ہفتم

حقیقی بنگاب نور ہے اور جام عرفان اسی سے لبریز ہے - کل دنیا اسی کا مظہر ہے اور اس کا ایک ایک رنگ سے لاکھوں رنگ کا ظہور ہوتا ہے - وہی بنگاب ہر شے میں ساری و طاری ہے شاہد و مشہود دونوں اس کے عقیدت مند ہیں طالب ومطلوب اس کے علم بردار ہیں بغیر اس کے روح انسانی بیچین، پریشان حال اور خستہ نظر آتی ہے اس کے بغیر گیان نہیں حاصل ہوسکتا —

جام ہشتم

تم اپنی خواہشات نفسانی بنگاب کے تابع رکھو - رنج خوشی، بھوک، پیاس، تمنائیں اور آرزوئیں سب بنگاب کے زیر تحت رہیں تو اچھا ہے - عالم ظاہر کی چیزیں اصلی زندگی کے تابع ہیں یہی راز زندگی ہے اور بغیر اس کے کسی چیز کا حاصل کرنا ممکن نہیں —

جام نہم

عشق مجازی سے عشق حقیقی کی تکمیل ہوتی ہے کیوں کہ کرۂ ارض میں صرف دو ہی چیزیں اس قابل ہیں کہ ان کے لئے کوشش کی جائے، ایک معشوق دوسرا بنگاب - جنہیں کسی سے محبت نہیں ان کی زندگی بیکار ہے - بنگاب سے سروکار نہ رکھنے والے بے لطفی کی زندگی بسر کرتے ہیں - ان لوگوں سے کہدو کہ

عشق ورزی اور بنگاب نوشی سے اجتناب نہ کریں ورنہ یہ گھٹ گھٹ کے مریں گے اُن سے کہ دو عالم مصیبت میں گرفتار ہونا بقائے انسان کے لئے نہایت ضروری ہے —

جام دہم

بنگاب بغیر موسیقی فضول ہے گانے ہی سے تو بنگاب پر رنگ چڑھتا ہے - بغیر سرود بنگاب نوشی میں کوئی لطف نہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گانا بری چیز ہے سننا حرام ہے - کاش اُنھیں معلوم ہوتا کہ یہ قربت حقیقی کا ذریعہ ہے - جن کو خدا نے چشم بصیرت نہیں عطا کی موسیقی کی قدر نہیں کرتے - کچھ فریب خوردہ الست ہی نغمہ کی قدر و منزلت کرسکتا ہے —

جام یازدہم

ہماری موجودہ قابلیت ہماری موجودہ شکتی بنگاب ہی کی بدولت ہے - بنگاب کے متوالے اور کسی شے سے تعلق رکھنا حرام سمجھتے ہیں۔ یہ بنگاب علم کا باعث ہے۔ اس کی بدولت وہ سچ اور جھوٹ میں تمیز کرتے ہیں - اسی بنگاب سے انھوں نے کل علوم حاصل کئے ہیں —

جام دوازدہم

شاہ محمد باقر سالک راہ ہدیٰ ہیں - وہ بھی بحر بنگاب کے غواص ہیں - وہ محفل بنگاب کے محبوب ترین ساقی ہیں۔ باغ بنگ کے وہ باغباں اکمل ہیں - جس کسی کو وہ جام بنگاب دیدیتے ہیں وہ شقایق کی طرح سرخ ہوجاتا ہے - بنگاب کے سربستہ ہائے راز کو انھوں نے منکشف کردیا ہے - وغیرہ —

۱-	چھوڑ یو سب طرز توں تسلیم ہو	یک قلے تسلیم کے جیوں میم ہو
۲-	جیو کو بنگاب پلا شاد رکھ	دل سوں درویش ہو دل آزاد رکھ
۳-	ھور سب اس کیف نے پینے میں کھو	ہاں نہ چھٹ کودری سینے میں کھو
۴-	اب توں تلک آپ سے کرتار سوں	سونپ آپس آپ کرتار سوں
۵-	ھوش کے بنگاب سوں مدھوش اچھ	ختم کر اس بات پہ خاموش اچھ

کتابت نسخہ کی چند خصوصیات قابل غور ہیں —

'ک' کے نیچے تین نقطہ رکھنے سے وہ 'ڭ' ہوجاتا ہے (ایسا ہی ترکی زبان میں ہوتا ہے

'ر' کے نیچے تین نقطہ لگانے سے وہ 'ژ' ہو جاتا ہے ڑ ژ

'ٹ' پر چار نقطے لگاکر 'ٹ' بناتے ہیں ٹ - ٹ

الف ممدودہ کی مد کرادینا اس زمانے میں معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔
'آج' کو 'اج' 'آگ' کو 'اگ' لکھتے تھے —

ل اور ک میں کوئی فرق نہیں نون غنہ اور نون بالاعلان میں کوئی فرق نہیں۔ اس زمانہ میں لوگ اس کا بھی خیال نہیں کرتے تھے —

بحری کی تصانیف میں صاف اور آلائش سے پاک دکھنی طرز کی عمدہ زبان پائی گئی۔ در حقیقت اس کی زبان قدیم دکھنی زبان کا بہترین نمونہ ہے لہذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس کی تصانیف میں ہمیں ایسے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں جو فی الواقع سنسکرت زبان سے نکلے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ اور محاورے اس کی تصانیف میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ بغیر سنسکرت جانے ہوئے اس کی تصانیف کا سمجھنا ذرا مشکل ہے' جیسا کہ نیچے دیے ہوئے الفاظ سے معلوم ہوجائے گا —

سکل	کل	تربھون	تینوں دنیا
ارتھ	مطلب	سیس	سر
ادک	کچھ اور	سہس	ہزار
دل	فوج	ستھول	کثیف۔ جسمانی
سرگ	بہشت	سکشم	لطیف

وغیرہ وغیرہ

مقدمہ فاوسٹ

باب اول

جرمن ادب گوئٹے سے قبل

[ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پی ایچ ڈی نے انجمن ترقی اردو کے لئے جرمنی کے نامور شاعر، ڈراما نویس اور ادیب کے مشہور ڈراما فاوسٹ کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ دنیا کی ان چند کتابوں میں سے ہے جو عالی خیالات اور بلند مضامین اور ندرت بیان کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس ترجمے پر ڈاکٹر صاحب موصوف نے ایک بسیط مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جس سے جرمنی کے اس زمانے کے ادب، گوئٹے کی سیرت اور تصنیف اور خاص کر فاوسٹ کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ یہ مقدمے کا پہلا حصہ ہے دوسرا حصہ آئندہ شایع کیا جائے گا۔ اڈیٹر]

'یورپ' کی تمام بڑی قوموں میں مدنیہ تمدنی زندگی کے اعتبار سے 'جرمن' قوم سوائے 'روسیوں' کے اگر ان کا شمار یورپ کی قوموں میں کیا جائے، سب سے کم سن ہے۔ جب یورپ اسلامی تمدن اور یونانی رومی تمدن سے متاثر ہوکر اس جمود سے چونکا جو اس پر قرون وسطیٰ کی آخری صدیوں میں طاری تھا تو فرانس اور انگلستان کو سیاست و معاشرت، علم و حکمت، ادب اور فنون لطیفہ، غرض زندگی کے ہر شعبے میں روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ مگر جرمنی کی

ترقی کا دور بہت دن کے بعد شروع ہوا۔ سولھویں صدی میں جو نئی زندگی کی لہر اٹلی سے اٹھی تھی وہ یہاں بھی پہنچی مگر یہاں اسے عرصے تک ایسے گردابوں کا مقابلہ کرنا پڑا کہ اس کا سارا زور جاتا رہا۔ 'جرمنی' میں عہد جدید مذہبی اصلاح سے شروع ہوا۔ مارٹن لوتھر نے 'پروٹسٹنٹ' مذہب کی بنیاد ڈال کر اپنے ہم قوموں کو رومی دائرے کی مذہبی اور سیاسی غلامی سے نجات دلائی۔ اس کے سبب سے جرمنوں میں جرأت اور جوش کا ہیجان اٹھا مگر ملک کے بعض حصوں میں کیتھولک مذہب اس قدر مضبوطی سے جڑ پکڑ چکا تھا کہ نئے مذہب کی شدید مخالفت ہوئی اور مذہبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کے سبب سے ذہنی ترقی رک گئی۔ سترھویں صدی کے آغاز میں ان لڑائیوں میں 'سویڈن' اور 'فرانس' نے مداخلت کی۔ تیس سالہ جنگ نے 'جرمنی' کو برباد کر دیا اور 'جرمن' قوم کی روح کو ایسا دھچکا دیا کہ اسے پنپنے میں کم و بیش سو سال کا عرصہ لگ گیا۔ 'جرمنی' کی عام ترقی سترھویں صدی کے آخر میں شروع ہوئی اور اس کے سیاسی استحکام کی ابتدا اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں اور تکمیل انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوئی جہاں سنہ ۱۸۷۰ء میں جا کر 'جرمن' ایک متحد قوم بن پائی۔

مستقل جرمن ادب اصل میں اٹھارھویں صدی سے شروع ہوتا ہے، لیکن اس کی بنا سولھویں صدی میں پڑ چکی تھی۔ اس سے قبل قرون وسطیٰ میں اور ملکوں کی طرح 'جرمنی' میں بھی علمی زبان 'لاطینی' تھی۔ بولنے کی زبان بھی ایک نہ تھی بلکہ مختلف حصوں میں مختلف زبانیں رائج تھیں۔ ان زبانوں میں تصنیف و تالیف نہ ہوتی تھی لیکن شاعری جو بہ قول ہرڈر کے قوموں کی مادری زبان ہے موجود تھی۔ اس پر مذہبی رنگ چھایا ہوا تھا اور چونکہ کیتھولک عیسائیت 'جرمن' قوم کی طبیعت کے موافق نہ تھی اس لئے اس زمانے کی 'جرمن' مذہبی شاعری کچھ بے رنگ سی تھی۔ رزمیہ شاعری البتہ ان لوگوں کے مذاق کی

چیز تھی ۔ پرانی قومی داستانیں جو ساگاز (Sagas) کہلاتی تھیں نظم کی جاتی تھیں اور بہت ہر دلعزیز تھیں ۔ ان میں نیبلنگن (Nieblungen) کی داستان کو خاص امتیاز حاصل ہے ۔ یہ ' زیگفرید ' کے کارناموں کا گیت ہے جو قدیم ' جرمنی ' کا ہیرو تھا جیسے ' رستم قدیم ' ایران ' کا ۔ ' زیگفرید ' ایک سیدھا سچا بھولا بھالا سورما تھا ۔ جنگجوی نے اس کے مزاج میں خشونت نہیں پیدا کی تھی ۔ اس کا قلب رقت اور درد سے معمور تھا وہ موسیقی کا شیدا تھا اور گھریلو زندگی کا عاشق ۔ یہ جرمن قوم کا سپوت ہے اور ' زیگفرید ' جرمن روح کی مثال ۔ سولھویں صدی میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے اثر سے ' اطالیہ ' ' انگلستان ' ' فرانس میں لوگ تنگ مذہبی دائرے سے باہر نکلے اور قدیم ' روم ' و ' یونان ' کی تقلید میں علم و حکمت اور فنون لطیفہ کی طرف متوجہ ہوئے ' مگر ' جرمنی ' میں یہ تحریک صرف اس حد تک پہنچی کہ بعض لوگ یونانی اور لاطینی ادب کا مطالعہ کرنے لگے ۔ ' یونان و روم ' کی روح ' جرمنی ' کی تمدنی زندگی میں سرایت نہ کر سکی ۔ یہاں نشاۃ ثانیہ سے پہلے تجدید مذہب کا دور گذرا جس کا آغاز ' مارٹن لوتھر ' (سنہ ١٤٨٣ تا ١٥٤٦ ء) سے ہوا ۔ ' لوتھر ' اصل میں جدید ' جرمن ' تہذیب و تمدن کا بانی ہے ۔ اس نے نہ صرف اس مذہب کی بنا ڈالی جو ' جرمنوں ' کی گہری مذہبیت کا مظہر ہے بلکہ ' جرمن ' زبان اور ادب کی داغ بیل بھی اسی کے ہاتھ سے پڑی ۔ اس نے ' انجیل ' کا اپنے وطن ' سیکسنی ' کی زبان میں ترجمہ کیا اور بہت سے مذہبی اور مناظرانہ رسائل لکھے ۔ اس کی ' ترجمہ انجیل ' کی سادی اور ستھری زبان تمام جرمنی کی متحدہ زبان بن گئی ۔ اس نے ایک طرف پادریوں اور دوسری طرف ' لاطینی ' کے پرستاروں کے مقابلے میں ' جرمن ' زبان کی حمایت کی اور اسے ادبی زبان بنانے کی کوشش کرتا رہا ۔ اس زمانے میں چھاپا نیا نیا ایجاد ہوا تھا ۔ ' لوتھر ' نے مطبوعہ کتابوں کو رواج دیا اور ان کے ذریعے سے اس کے مذہبی خیالات کے ساتھ ساتھ زبان کی بھی اشاعت ہوتی رہی ۔ اس کی گہری نظر نے دیکھ لیا

تھا کہ جو چیز مقبول عام نہ ہوسکے وہ قومی ترقی کے لئے زیادہ مفید نہیں - جس اصول کو پیش نظر رکھ کر اُس نے "انجیل" کا ترجمہ کیا تھا اُسے وہ ذیل کے الفاظ میں بیان کرتا ہے جن سے اُس کی صائب رائے اس کے مصمم ہونے کا اور اُس کی ابھری طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے "ان گدھوں کی طرح "لاطینی" حرفوں سے نہ پوچھنا چاہئے کہ "جرمن" زبان کیوں کر بولی جائے بلکہ گھر میں بیٹھنے والی ماؤں سے ' سڑک پر کھیلنے والے بچوں سے ' بازار میں بولنے والوں لوگوں سے ' ان کی بات چیت کان لگا کر سنو اور اسی زبان میں ترجمہ کرو تب وہ سمجھیں گے کہ تم "جرمن" زبان بول رہے ہو" —

"لوتھر" کے مددگاروں میں "اُلرخ فان ہیوٹن" Ulrich von Hutten (۱۴۸۸ تا ۱۵۲۲ء) خاص امتیاز رکھتا ہے - یہ ابتدا میں ہیومانزم کی تحریک کا مؤید تھا اور لاطینی زبان کا شیدا - مگر "لوتھر" کے اثر سے اس کے خیالات بدلے اور یہ نہایت جوش و خروش سے مذہبی حملہ اور "جرمن" قوم کے حقوق اور ذہنی استقلال کا حامی بن گیا - اس کی طبیعت میں "لوتھر" سے زیادہ شورش تھی چنانچہ اس نے اپنے زمانہ کی انقلابی تحریک میں نمایاں حصہ لیا - اس کی ادبی خدمات اتنی اہم نہیں - تاہم اس کے قومی گیت فدائے ملت "جرمنوں" کے دلوں کو اُبھارتے ہیں

افسوس ہے کہ ملک کی سیاسی انتشار نے اس عہد میں "جرمن" ادب کی اُٹھتی جوانی کو برباد کردیا تجدید مذہب نے جو نئی روح پھونکی تھی وہ بجائے اس کے کہ عام تہذیبی اور ادبی ترقی میں صرف ہوتی مذہبی دنگیوں کی نذر ہوگئی - سولہویں صدی کی ادبی پیداوار سوائے مذہبی گیتوں یا "پوپ" کے خلاف طنزیہ نظموں اور ڈراموں کے اور کچھ نہیں - "ہانس زاکس" نے ڈراما کو وسعت دینا چاہی اور "وکرام" نے ناول کی بنا ڈالی' لیکن عام ذہنی معیار اس قدر کم تھا کہ یہ دونوں چیزیں ترقی نہ کرسکیں - "جرمن" قوم کے گہرے دلی جذبات اس زمانے میں

ادب العوام (Folklore) میں ظاہر ہوئے ' جن میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر 'اوئلن' شپیگل' کے قصے اور فاؤسٹ' کی داستان ہے جو 'گوئٹے' کے ڈراما کا ماخذ ہے—

سترھویں ' صدی کی ابتدا میں ' جرمنی ' میں ادبی تحریک کچھ دن کے لئے پھر ابھری - اس زمانے میں ملک میں مفلسانہ امن تھا اور لوگوں کو کسی قدر فرصت تھی کہ ذھنی زندگی کے مسائل کی طرف متوجہ ھوں - ' جرمنوں ' کو یہ احساس پیدا ھوا کہ اُن کا ادب دوسری قوموں کے ادب سے بہت پیچھے ھے اور اُنھوں نے اپنے دامن سے اس دھبے کو دور کرنے کی کوشش شروع کی - ' مارٹن اوپٹز (۱۵۹۷ تا ۱۶۳۹ ع) نے ' جرمن زبان کی اصلاح و ترقی میں بہت سعی کی اور اُس کے ساتھیوں نے بھی زبان کو بہت سنوارا - لیکن مضامین کے لحاظ سے ان لوگوں کی تصانیف بالکل کھوکھلی ھیں - ان کے مضامین کا ماخذ ' یونانی ' اور ' لاطینی ' کے پرستاروں کی تصانیف ھیں اور یہ بھی ان لوگوں کی طرح ' یونان ' و ' روما ' کی نقالی کرتے تھے اینڈرياس گریفیس اس عہد کا ممتاز ڈراما نگار تھا مگر اس کے کھیل ڈراما کی روح سے خالی ھیں - اس عہد کی شاعری بالکل سطحی اور تصنع سے بھری ھے -

' جرمنی ' کو جو سکون کا دور نصیب ھوا وہ دیرپا نہ تھا - تھوڑے ھی دن میں سی سالہ جنگ (سنہ ۱۶۱۸ تا ۱۶۴۸ ع) شروع ھو گئی جس نے ملک کو مادی اور ذھنی حیثیت سے برباد کر دیا - اس جنگ میں ' فرانس ' ' جرمنی ' کی سیاست میں دخیل ھو گیا اور فرانسیسی تہذیب کا رنگ جرمن زندگی پر چھا گیا - فرانسیسی زبان جرمنی کے تعلیم یافتہ حلقوں میں پھیل گئی - ذھنی غلامی کے زمانے میں کوئی قوم پوری ادبی ترقی نہیں کر سکتی - جرمنی کی ادبی تحریک جو اس صدی کے شروع میں اٹھی تھی بالکل فنا ھوگئی اور صدی کے آخر تک سوائے ' گریمیل ھاؤزن ' کے کوئی معقول ادیب نہیں پیدا ھوا - اس کا سب سے مشہور ناول ایک آوارہ گرد کی خود نوشتہ سوانح عمری کے طور پر شائع ھوا جس کا نام Simplicissimus ھے —

غرض سترھویں صدی کا جرمن ادب مجموعی حیثیت سے سولھویں صدی کے ادب سے بھی بہت پست تھا - اس پر تنگ خیالی ، بد مذاقی اور کورانہ تقلید کا رنگ غالب تھا نہ اس میں تخیل کی بلند پروازی تھی اور نہ تناسب اور ترتیب -

اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں جرمنی کی ذہنی حالت کچھ بہتر نظر آتی ہے اب جرمن فرانسیسیوں کی تقلید میں بہت کچھ ترقی کر چکے تھے - اب وہ محض نقالی نہیں بلکہ سمجھ بوجھ کر تقلید کرتے تھے فرانس اور انگلستان کا عقلی فلسفہ جرمنی میں پھیل چکا تھا - اس فلسفہ کا اصل اصول یہ تھا کہ ذہن انسانی کا اساسی جوہر عقل ہے اور کائنات پر اسی کی حکومت ہے - انسان کی مادی، ذہنی اور روحانی زندگی کا معیار عقل ہی کو قرار دینا چاہئے جو چیزیں احساس و وجدان پر منحصر ہیں مثلاً مذہب یا آرٹ وہ بھی اسی حد تک قابل قبول ہیں جس حد تک وہ عقل کے مطابق ہوں چونکہ عقل سب انسانوں میں مشترک اور ہر زمانے میں موجود ہے اس لئے صحیح عام مذہب اور آرٹ کے اصول بھی ہر قوم کے لئے ہر عہد میں یکساں ہیں آرٹ کے یہ اصول یونانیوں کو معلوم تھے اس لئے ادب اور فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں میں یونانیوں کی تقلید اوج کمال پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے -

اس علمی تحریک کے ماتحت ایک تعلیمی تحریک بھی تھی - اس کی کوشش کی جاتی تھی کہ یہ خیالات عوام میں پھیلیں اور ان کے دل سے مذہبی تعصبات اور ہر طرح کی ضعیف الاعتقادی دور ہو - جرمنی کی ذہنی تاریخ میں یہ تحریک (Aufklarung) کہلاتی ہے اور ہم اسے نئی روشنی کی تحریک کہ سکتے ہیں۔ جرمنی میں اس کا ہیر اول کرسٹیان ٹومس (۱۶۵۵ تا ۱۷۲۸ ع) ہے —

عقلی فلسفہ کا اس زمانے کے ادب پر بہت گہرا اثر پڑا - اس زمانے کی تصانیف میں مذہبی شکوک عام طور پر نظر آتے ہیں - شاعری اور ڈراما وغیرہ میں فرانسیسیوں کے توسط سے یونانی نمونوں کی پابندی ہونے لگی - شاعری کے

موضوع کو بہت وسعت ہوئی - سچی شاعری کی جان انسانی جذبات کی ترجمان کے علاوہ مناظر قدرت کی نقاشی ہے - اب تک جرمن شاعری میں حسن فطرت کی تصویروں کی کمی تھی - بروکس (۱۶۸۰ تا ۱۷۴۷ ع) نے اس کمی کو پورا کیا - اس کی شاعری کا پایہ بہت بلند نہیں مگر اس کا یہ احسان ہے کہ اُس نے تخیل کی جولانی کے لئے ایک نئی راہ کھول دی —

اس عہد کا سب سے بڑا ادبی نقاد گوٹ شیڈ (۱۶۸۰ تا ۱۷۳۷ ع) ہے - یہ لائپزش کی یونیورسٹی میں پروفیسر تھا - گوٹ شیڈ عقلیت کا حامی تھا اور ادب میں یونانیوں کے مقرر کئے ہوئے قواعد و ضوابط کی پابندی پر زور دیتا تھا - سوئٹزرلینڈ کا بوڈمر اس کا مخالف تھا اور لوگوں کو انگلستان کے ادب کی تقلید اور جذبات پرستانہ شاعری کی طرف توجہ دلاتا تھا - ان دونوں کے پیرووں میں سخت مناظرے رہتے تھے جن کی بدولت جرمنوں کے تنقیدی ذوق کو نشو و نما کا بہت اچھا موقع ملا- اسی زمانے میں لائپزش میں نوجوان ادیبوں کا ایک حلقہ تھا جو شاعری کا مقصد قوم کی اخلاقی اصلاح کو سمجھتا تھا - یہ لوگ بریمن کے ایک رسالے میں مضمون لکھا کرتے تھے- ان لوگوں میں جرمنی کا پہلا بڑا شاعر کلوپ اشٹوک بھی تھا-

اٹھارھویں صدی کے نصف ثانی میں جرمن ادب نے یکایک حیرت انگیز ترقی کی - سنہ ۱۷۴۰ تک یوروپ میں جرمن ادب کی کوئی وقعت نہ تھی اور سنہ ۱۸۰۰ میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ کسی ملک کا ادب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا - اس کا یا پلٹ کا راز جرمنی کی سیاسی ترقی میں مضمر ہے - اس زمانے میں ریاست پروشیا میں فریڈرک اعظم نے ایک مستحکم سلطنت قائم کی اور تمام یوروپ میں اُس کا فوجی اقتدار مسلم ہو گیا - دوسری بڑی بات یہ تھی کہ پروشیا کو چھوڑ کر اور ریاستوں کو تجدید مذہب کے بعد پہلی بار ایک طویل عرصے تک چین سے بیٹھنا نصیب ہوا - اب جرمنوں کے دل میں اپنی عزت پیدا ہوگئی ، وہ اپنے اوپر اعتماد کرنے لگے اور اپنی زندگی کو اس قابل سمجھنے

لگے کہ ادب اور شاعری کا موضوع بن سکے۔ یہ تحریک شروع ہوئی کہ فرانسیسیوں کی تقلید ترک کردی جائے۔ مگر یہ رنگ اتنا گہرا ہوچکا تھا کہ یکایک اس کو چھوڑنا آسان نہ تھا۔ پھر بھی ادب کے میدان میں اتنا ضرور ہوا کہ کلوپ اسٹوک، ویلانڈ اور لیسنگ کی بدولت جرمن شاعری، ڈراما نویسی وغیرہ میں مضامین کے اظہار میں جدت، گہرائی اور بلند پروازی پیدا ہوئی اور فنون فن کے لحاظ سے فرانسیسیوں کا دامن چھوڑ کر براہ راست یونانیوں کی تقلید ہونے لگی اور یونانیوں کے مقرر کئے ہوئے قواعد و ضوابط کی تفسیر جرمن ادیب اپنے طور پر کرنے لگے

کلوپ اسٹوک (۱۷۲۴ تا ۱۸۰۳ء) جیسے کہ ہم کہہ چکے ہیں لائپزگ کے اس حلقے میں سے تھا جو شاعری کا مقصد اخلاقی اصلاح کو سمجھتا تھا۔ اس نے جرمن شاعری کا پایہ بہت بلند کردیا۔ شاعری اب محض ادبی مشق یا عارضی تفریح کا ذریعہ نہیں رہی بلکہ گہرے مذہبی اور اخلاقی جذبات کا آئینہ بن گئی۔ کلوپ اسٹوک کی سب سے مشہور تصنیف "مسیحا" ہے جس میں اس نے حضرت عیسیٰ کی زندگی کا قصہ نظم میں بیان کیا ہے۔ اس میں اس نے مسیح کے حالات بالکل کلیسائی روایات کے مطابق بیان کئے ہیں اس لئے زندہ شاعری کا موقع نہیں ملا۔ اس کے کیرکٹر جیتے جاگتے انسان نہیں بلکہ محض پتلیاں ہیں جن کی زبان سے شاعر بولتا ہے۔ یہی حال اس کے ڈراموں کا ہے جن کے موضوع انجیل کے قصے ہیں۔ اس کی غنائی شاعری موسیقی سے عاری ہے: البتہ قومیت کے جذبے کے سبب سے اس کی شاعری میں کہیں کہیں زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ سب سے بڑی کمزوری اس کی شاعری کی یہ ہے کہ اس کا فطرت انسانی کا تصور بالکل یکطرفہ ہے۔ وہ انسان کو محض جذبات کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ اس کی ارادی اور عملی زندگی اور اس کی شہوانی کمزوریوں کی طرف سے چشم پوشی کرتا ہے۔

ویلانڈ (۱۷۳۳ تا ۱۸۱۳ء) کے کلام کی خصوصیت اس کا سادہ اور مؤثر

اسلوب بیان ہے ۔ موضوع کلام اور خیالات کے اعتبار سے اُس کی شاعری کے دو واضح دور ہیں ۔ پہلا مذہبیت اور مذہبی پسندی کا ہے ۔ اس زمانے میں اس نے ایک طویل نظم " حقیقت اشیاء " کے نام سے لکھی ۔ اس میں اس نے قدیم فلسفی شاعر لکریشیس کی مادیت کے خلاف افلاطون کی عینیت کی حمایت کی ۔ اسی دور میں اُس نے " بہار " کے نام سے نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں افلاطونی عشق کی حقیقت بیان کی گئی تھی ۔ " ابراہیم کا امتحان " میں چند منظوم خطوط ہیں جن میں کچھ مردے اپنے زندہ دوستوں سے وہ روحانی واردات بیان کرتے ہیں جو اُنہیں مرنے کے بعد پیش آئی ۔ ویلانڈ کی اس دور کی شاعری میں اصلیت کم اور تصنع زیادہ ہے ۔ جو مذہبی اور اخلاقی مطالب بیان کئے گئے ہیں وہ دل سے نکلے ہوئے جذبات نہیں بلکہ دماغ سے پیدا کئے ہوئے خیالات ہیں —

اُس کی شاعری کا دوسرا دور وہ ہے جب والٹیر اور شیکسپیئر کی تصانیف کے مطالعے اور زندگی کے بلاواسطہ مشاہدے کے بعد اُس کے ذہن میں فطرت انسانی کا وسیع تصور قائم ہوا ۔ اب اُس نے جتنی چیزیں لکھیں اُن سب کا موضوع اپنے زمانے کے مسائل زندگی کو قرار دیا ۔ افسانے سب غیر ملکوں کے ہیں لیکن اُن کے پردے میں وہ اپنے ملک کی حالت دکھاتا ہے ۔ مثلاً " ڈان سلویو " جو ڈان کوئکزوٹ کی طرح اسپین کے ایک بانکے کا قصہ ہے ؛ " اگاتھون " جس میں ایک یونانی سورما کے حالات ہیں ؛ " طلائی آئینہ " جو الف لیلہ کی قسم کی کتاب ہے اور مشرقی ممالک کے قصوں کا مجموعہ —

قومیت کا جو عنصر ' کلوپسٹاک ' کے یہاں تھا اس سے ' ویلانڈ ' کا کلام خالی ہے ۔ اسی لئے اُسے جتنی مقبولیت غیر ممالک میں حاصل ہوئی خود ' جرمنی ' میں نہیں ہوئی ۔ یہاں ایک گروہ اُس کا مخالف تھا جو اس کی واقعیت پسندانہ کو مخرب اخلاق سمجھتا تھا —

اس دور کا سب سے بڑا ادیب ' نقاد اور ڈراما نگار " لیسنگ " (۱۷۲۹ تا ۱۷۸۱ ع) ہے ۔

اس نے اس طرز شاعری کو جو 'کلاسیکی' کہلاتی ہے کمال کو پہنچا دیا۔ اس طرز کی خصوصیات یہ ہیں کہ انداز بیان سادہ اور حقیقت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اصول فن کی پوری پابندی کی جاتی ہے اور جذبات کو عقل کے ماتحت رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خیالات کے اعتبار سے' لیسنگ' "عقلیت" اور "نئی روشنی" کا علم بردار ہے۔ رسم و رواج' مذہب و سیاست کی قیود کو وہ عقل انسانی کے لئے زنجیریں سمجھتا ہے۔ وہ ان پردوں کے پیچھے "انسانیت" کے عین کو دیکھتا ہے اور اسے بے نقاب کرنا چاہتا ہے۔

اس کے ابتدائی ڈراموں میں اصول فن کے لحاظ سے فرانسیسیوں کی تقلید ہے؛ لیکن چونکہ وہ تنقیدی طبیعت رکھتا تھا اس لئے اس نے خود یونانی ڈراموں کا اور ان کے مقلد فرانسیسیوں کے دعوے کا بہ نظر غور سے مطالعہ کیا اور اس کی بنا پر ڈرامے اور دوسرے فنون لطیفہ کے اصول و ضوابط قائم کئے۔ فن تنقید میں اس کی دو کتابیں "ہامبرگ کا فن ڈراما" اور "لاؤکوئن" مشہور ہیں۔ اس کی تنقید عقلیت کے فلسفے پر مبنی ہے۔ اس کے نزدیک فنون لطیفہ کا عام معیار خوبی یہ ہے کہ وہ صاف اور واضح تصورات منطقی ترتیب اور ترتیب سے پیش کریں۔ اس کا پہلا اور مکمل ڈراما "سارہ سیمپسن" ہے۔ اس میں اس نے یہ قدیم اصول توڑ دیا کہ المیہ کا موضوع ہمیشہ بادشاہوں یا امرا کی زندگی ہونا چاہئے' اور ایک معمولی خاندان کی لڑکی کا قصہ بیان کیا۔ لیکن اس افسانے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ المیہ 'بارن ہیلم' کی 'مینا' اپنے موضوع کے لحاظ سے' نیز ڈراما کی خصوصیات کے اعتبار سے نہایت کامیاب فرحیہ (کامیڈی) ہے۔ اس میں جذبۂ عشق کی کشمکش احساس فرض اور حب وطن سے دکھائی ہے۔ اس ڈرامے میں ایک فرانسیسی کا مضحک کیرکٹر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ 'جرمنوں' کے دل میں 'فرانسیسیوں' کا جو رعب چلا آتا تھا وہ اب جاتا رہا۔

لیسنگ کے دو ڈرامے 'ایمیلیا گیلوتی' اور 'دانشمند ناتاں' ادبی دنیا میں

شہرت رکھتے ہیں۔ "ایمیلیا" میں لیسنگ نے اپنے عہد کی اطالوی زندگی کا ایک المناک قصہ لکھا ہے جو تنقیدی ادبی طرز کی بہترین مثال ہے۔ "ناتان" سلطان صلاح الدین کے زمانے کی صلیبی جنگ کا افسانہ ہے جس میں ایک یہودی حکیم کی زبان سے مذہبی رواداری کا درس دیا گیا ہے اور عقلیت کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے —

غرض اٹھارھویں صدی میں جرمن زبان بہت منجھی اور صاف ہوئی، جرمن ادب فرانسیسیوں کی تنقید سے آزاد ہوا، اس میں جدت اور وسعت پیدا ہوئی لیکن ابھی کچھ دن تک یہ بات نہ تھی کہ اس صدی میں جس راہ پر جرمن ذہن چل رہا تھا، یعنی عقلیت، فلسفہ اور کلاسیکی ادب، وہ جرمن قوم کی طبیعت کے مناسب نہ تھا۔ جرمن طبیعت میں باطنیت اور انفرادیت ہے۔ اس کے تخیل میں شورش ہے، وہ خارجی قیود سے گھبراتی ہے اور لاعقلی عناصر کو عقل کے ماتحت نہیں رکھنا چاہتی۔ شاید اس کی تربیت اور انضباط کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ عقلیت کے دور سے گذرے۔ لیکن وہ زیادہ دن تک اس کی پابند نہیں رہ سکتی تھی۔ فلسفے میں کانٹ کے نقادانہ دماغ نے عقلیت کی حدود معین کردی تھیں۔ اس نے بعد عینیت پسند فلسفیوں کو تخیل کی بلند پروازی دکھانے اور لاعقلی عناصر پر زور دینے کا موقع ملا۔ ادبی تنقید میں عقلیت کے خلاف علم پیکار بلند کرنے والا عالم دین ہرڈر تھا۔ عقلیت کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ ذہن انسانی کو ساکن اور یکرنگ سمجھتی تھی اور اس کی تاریخی نشو و نما اور مختلف النوعی کی طرف سے چشم پوشی کرتی تھی۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی اور خیال کے اصول جو عقل کی روشنی میں صحیح ہوں ہر قوم اور ہر زمانے کے لئے یکساں تھے۔ "ہرڈر" نے اس پر سختی سے تنقید کی اور "تاریخی منہاج" کی بنا ڈالی۔ اس کی کتاب "جمالیات" میں جو تنقیدی اصول بیان کئے گئے وہ بالکل نئے اور اچھوتے تھے۔ اس کے نزدیک ہر قوم کا ادب اور اس کی شاعری قومی سیرت

کی خصوصیات کا آئینہ اور قومی زندگی کی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ اس کے نزدیک سچی شاعری کی پہچان یہ ہے کہ وہ انسانی خواہشات و جذبات کی تصویر ہو اور شدت احساس اور خلوص سے لبریز ہو۔ اگر یہ باتیں شاعری میں موجود ہوں تو وہ فطری شاعری ہے ورنہ ایک مصنوعی اور بےجان چیز ہے۔ اس معیار پر اس کے خیال میں وہ گیت پورے اترتے ہیں جو عوام کے بنائے ہوئے اور ان میں مقبول ہوں۔ اس لئے یہی سچی شاعری کا نمونہ ہیں۔ اس کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ "شاعری نوعِ انسانی کی مادری زبان ہے" اس نے بڑی محنت سے ایک مجموعہ مختلف قوموں کے منتخب گیتوں کا تیار کیا اور اس کا نام "قوموں کی آواز گیت کے پردے میں" رکھا —

"جرمن ادب کے متعلق چند متفرق خیالات" ہرڈر کا شاہکار ہے۔ اس میں اس نے اپنا فلسفۂ لسانیات بیان کیا ہے۔ ہرڈر کہتا ہے کہ ہر قوم کی زبان میں ایک خاص روح ہوتی ہے اور یہی روح اس کے ادب کے لئے وجہ حیات ہے۔ زبان کی ارتقا کے عام اصول قائم کرنے کے بعد وہ جرمن زبان کی خصوصیات بتاتا ہے اور اس کی نشو و نما دکھاتا ہے۔ اس کے نزدیک " [illegible] " کے دور نے جرمن زبان و ادب کو ابھرنے نہ دیا۔ اس عہد میں ذہن انسانی کی ساری کائنات عقل سمجھی جاتی تھی حالانکہ عقل اس کا محض ایک پہلو ہے اور انسانی زندگی کی تکمیل کے لئے کافی نہیں۔ "تنقید کے جنگل" میں اس نے ان خیالات کو پھیلایا ہے اور ان سے ادبی تنقید میں کام لیا ہے۔ "اوسیان کے متعلق خطوط" میں اس نے ایک قدیم کیلٹ کے کلام پر تبصرہ کیا اور اسے یونان کے مایۂ ناز شاعر ہومر کا ہم پلہ قرار دیا۔ "مقالہ در کلام شیکسپیر" میں اس نے یہ بتایا کہ شیکسپیر کی تصانیف کو فرانسیسی تنقیدی اصول پر نہ جانچنا چاہئے بلکہ انگلستان کی مخصوص ادبی روح کے معیار پر —

اس کی ایک نہایت اہم کتاب "Auch eine Philosophie der Geschichte" ہے جس کا ترجمہ اردو میں یہ ہوگا۔ "تاریخ کا بھی فلسفہ"۔ اس نے تاریخ کے مطالعے میں

روحانی ارتقا کے نظریے سے کام لیا اور قرون وسطیٰ کے متعلق عام مورخین کا جو حقارت آمیز رویہ تھا اُس کی سختی سے تردید کی - لوگ اس عہد کو تاریکی کا زمانہ سمجھتے تھے - ہرڈر نے یہ ثابت کیا کہ اس زمانے میں یوروپ میں ایک مکمل نظام زندگی موجود تھا جو فطرت سے قریب تر تھا —

ہرڈر کا طرز تحریر بھی خاص ہے - وہ لکھنے میں کسی اصول کی پابندی نہیں کرتا اور اپنے خیالات وضاحت، صفائی اور تسلسل سے ادا نہیں کرسکتا: اس لئے اُس کی کتابیں پڑھنے میں دلچسپ نہیں لیکن اس کے خیالات اس قدر گہرے اور حقیقت پر مبنی تھے اور اُس نے جرمن انداز طبیعت کو اس خوبی سے سمجھا تھا کہ اُس کی وجہ سے جرمنی کی ادبی دنیا میں عظیم‌الشان انقلاب ہو گیا - اُس کی تحریک سے جرمن زبان بیرونی بندشوں کو توڑ کر آزاد ہوئی اور جرمن روح کی بیچینی، آرزو اور جستجو نے ادب اور شاعری میں عجب سوز و گداز پیدا کردیا —

اس ادبی انقلاب کی "جو طوفان‌وہیجان" کا دور کہلاتا ہے، ابتدا اُس زمانے سے سمجھنا چاہئے جب اسٹراسبورگ میں ہرڈر اور گوئٹے سے ملاقات ہوئی (سنہ ۱۷۷۱ ع)- نوجوان گوئٹے جس قدر ہرڈر کی اثر آفریں شخصیت سے متاثر ہوا اپنے ہم عصروں میں کسی سے نہیں ہوا - سنہ ۱۷۷۲ ع میں ایک مجموعۂ مضامین " جرمن طبیعت جرمن اور آرٹ " کے نام سے شائع ہوا جو گویا نئے دور کا پیش خیمہ تھا - اس میں ہرڈر، گوئٹے اور چند اور لوگوں کے مضامین تھے —

اس ادبی انقلاب نے دو راہیں اختیار کیں ایک تو غنائی شاعری اور دوسرے ڈراما - نئی غنائی شاعری کا مرکز گوٹنگن تھا جہاں یونیورسٹی کے چند طالب علموں نے مل کر ایک حلقۂ شعرا قائم کیا جن میں 'فوس' اور 'بیورگر' ممتاز تھے - یہ لوگ ایک سال نامہ " آرٹ کی دیویوں کے سال نامے " کے نام سے نکالتے تھے - ان کی شاعری نفس مضمون اور طرز ادا کے لحاظ سے کلاسیکی شاعری

کی حد ہے۔اس کے کلام میں اس قدر جوش وخروش ہے کہ وہ پوری طرح اپنے مضمون پر قابو نہیں پاسکتی۔ اس کا موضوع تمام انسان کی داخلی زندگی، اُس کے جذبات کا ہیجان، اُس کی باطنی معنوی واردات ہے۔ اس ضمن میں 'گوئٹے' کا "ویرتھر" بھی شمار کیا جاسکتا ہے جو اس رجحان کا نمونہ ہے۔

لیکن طوفان وہیجان کی تحریک کا اصلی زور ڈراما میں ظاہر ہوا۔ جرمنی کے دو سب سے بڑے ڈراما نگار گوئٹے اور شلر اپنی جوانی کے زمانے میں اس تحریک کے علمبردار تھے۔ گوئٹے کا "گوتس" اور شلر کا "قزاق" ہیجان و طوفان کا آئینہ ہیں۔ "گوتس" سولھویں صدی کے ایک بانکے سردار کا قصہ اور "قزاق" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے قزاقوں کا افسانہ ہے۔ دونوں میں مصنفوں کی ہمدردی ان لوگوں کے ساتھ ہے جو مروجہ اخلاق کو توڑ کر محض اپنے ضمیر کے احکام کی پابندی کرتے ہیں۔ گوئٹے اور شلر نے اس دور میں اور بھی کئی ڈرامے لکھے اور یہ رنگ اس قدر پھیلا کہ بہت سے ڈراما نگاروں نے اسے اختیار کرلیا۔ ان لوگوں میں "کلنگر" خاص طور سے اہمیت رکھتا ہے جس کے ڈرامے "طوفان و ہیجان" کے نام سے یہ دور موسوم ہے۔

اس دور کی خصوصیات تھیں: کلاسیکی اصول فن کی سختیوں سے آزادی، داخلیت کی جذبات پرستی اور انفرادیت، مروجہ اخلاقی اور تمدنی قوانین کے خلاف احتجاج۔ اس زمانے میں جرمن روح کو اپنی پوری خصوصیات، اپنی خوبیاں اور کمزوریاں پوری طرح ظاہر کرنے کا موقع ملا۔

اس دور کی کمزوریاں بھی صاف نظر آتی ہیں۔ ادب اور زندگی کے صحیح نشوونما کے لئے جہاں بیجا قیود سے آزادی لازمی ہے وہاں کسی نہ کسی ذہنی توازن کی پابندی بھی ضروری ہے۔ "طوفان و ہیجان" نے جرمنی کی رومانی روح آزاد کردیا تھا۔ اس میں بےحد زور، بے تھاہ گہرائی، بے پایاں وسعت تھی؛ لیکن بہت جلد یہ معلوم ہوگیا کہ ان خوبیوں کے ساتھ ترتیب اور ہم آہنگی کے نہ ہونے

سے بے راہ روی اور انتشار کا خوف ہے - کچھ دن میں اس دور کے ادیبوں کی بے اصولی ' داخلیت ' اور انفرادیت حد سے گذرنے لگی - اس کا احساس سب سے پہلے ' گوئٹے ' کی ہمہ گیر طبیعت کو ہوا - اُس نے اس مسئلے کو اپنی زندگی اور اپنی تصانیف دونوں میں حل کیا - ایک طرف تو اُس نے اپنی زندگی میں آزادی اور پابندی ' فطری جوش اور اخلاقی انضباط ' Genius (خدا داد تخلیقی قوت) اور Character (اکتسابی سیرت) میں امتزاج پیدا کرکے جرمن قوم کے لئے ایک نمونہ قائم کیا اور دوسری طرف اپنی شاعری میں رومانی روح کے ہیجان و طوفان کو کلاسیکی ہم آہنگی اور ترتیب کی مدد سے راہ پر لگا دیا - گوئٹے کے بعد کئی بار جرمن روح کے وحشت نے زندگی کے کریمانی تنگ کو چاک کیا ; لیکن گوئٹے کی زندگی اور شاعری کی مثال سامنے تھی اس لئے فوراً ہی اُس کی بخیہ گری بھی ہوگئی - اب یہ دیکھنا ہے کہ گوئٹے نے یہ مثال کیوں کر قائم کی —

باب دوم

گوئٹے کی زندگی کے حالات اور اُس کی تصانیف

یوھان وولف گانگ گوئٹے ' سنہ ۱۷۴۹ ع میں دریائے مائن کے کنارے شہر فرانکفورٹ میں پیدا ہوا - اُسے اپنے باپ سے ضبط و انضباط ' باریک بینی ' اور مشاہدے کی عادت ورثے میں ملی اور اپنی ماں سے وسعت تخیل اور ذوق جمال - وہ اپنے ایک قطعے میں کہتا ہے —

" اپنے باپ سے میں نے وجاہت اور سنجیدگی پائی ہے اور اپنی پیاری ماں سے زندہ دلی اور کہانی کہنے کا شوق " - جوانی میں اُس کے مزاج میں بےحد تلون تھا - اُس کا دل جذبات و کیفیات کا ایک سمندر تھا جس میں ہمیشہ مدوجزر رہتا

تھا ــــ کبھی ملال اور افسردگی، کبھی جوش اور مسرت، کبھی حوصلہ مندی اور امید، کبھی بیدلی اور یاس، کبھی لطفِ صحبت کا ذوق، کبھی تنہائی کی تلاش ۔ یہ کیفیت کم و بیش ہر نوجوان کی ہوتی ہے ۔ عہدِ شباب میں جس طرح خون گرم ہوتا ہے اور تیزی سے بہتا ہے اسی طرح جذبات مشتعل ہوتے ہیں اور جلد جلد رنگ بدلتے ہیں مگر 'گوئٹے' کی طبیعت کے تلوّن اور بیچینی کو محض عمر کا تقاضا نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ اس کی یہ سیماب مزاجی عنفوانِ شباب کے گذر نے کے بعد بھی عرصے تک اسی زور شور سے باقی رہی، بلکہ آخر عمر میں بھی گاہ گاہ ظاہر ہوتی رہی۔ اس نے اس باطنی اضطراب کا سبب یہ بتایا کہ اس کے سینے میں "دو روحیں" تھیں ایک تو شاعر کی حسن پرست، ذوق پرور، شورش انگیز، ہنگامہ خیز روح اور دوسرے حکیم کی عرفان جو، حق پسند، سکون طلب، نظام آفریں روح۔ ان دونوں کی کشمکش اسے یوں نہ ایذا دیتی تھی اور اس کشمکش کو دور کرنے پر اس کی نجات منحصر تھی ۔ اسی کے ساتھ اس کے ذہن میں بلا کی وسعت اور عمق گہری اور اس کی طبیعت میں غضب کی آمد اور روانی تھی اس کے لئے یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا کہ اپنی تخلیقی قوت کے لئے کیا حدود اور کیا ضوابط مقرر کرے تاکہ وہ سیلابی دریا کے مانند کناروں کو توڑ کر آس پاس کی بستیوں کو ویران نہ کردے بلکہ سبک رو ندی کی طرح ایک مقررہ دھارے میں بہ کر اپنی وادی کو سیراب کرے اور زرخیز بنائے ۔ غرض 'گوئٹے' کو اپنی ذات کی ارتقا اور تکمیل کے لئے ایک بہت بڑا کام انجام دینا تھا یعنی اپنے مزاج کے متضاد عناصر میں توازن پیدا کرنا اور اپنے ذہن کی حدبندی، تہذیب اور انضباط کرنا ــ

مگر 'گوئٹے' کا کام یہاں تک محدود نہ تھا ــ وہ شاعر تھا اور اس کی فطرت کا تقاضا تھا کہ اپنی داخلی زندگی کے نشیب و فراز اور نشو و نما کو الفاظ و تصورات کے ذریعہ نمایاں کرے، یعنی صورت کے ذریعہ آزاد ترکیبوں میں ظاہر کرے تاکہ دوسرے بھی اس سے سرور کے پردے میں تسکین اور نجات حاصل کریں ۔ جس

روحانی کشمکش میں گوئٹے مبتلا تھا اسی میں اس کی قوم بھی گرفتار تھی - ہم کہہ چکے ہیں کہ اس زمانے میں رومانی جرمن روح فرانسیسیوں اور یونانیوں کی تقلید سے آزاد ہوکر اپنی فطری جوش کی رو میں بہ رہی تھی - جرمن ادب پر " طوفان و ہیجان " کا رنگ چھایا ہوا تھا - اس نے اصول فن کے بند توڑ دیے تھے اور مذہب و اخلاق رسم و رواج کے پشتوں کو کمزور کر دیا تھا لیکن ایک طرف تو کلاسیکی تاریخی روایات' دوسری طرف جرمنوں کی گہری مذہبیت' تیسری طرف فریڈرک اعظم کا قائم کیا ہوا فوجی انضباط جو تمام قوم کے دل میں گھر کرچکا تھا یہ سب قوتیں " طوفان و ہیجان " کی تخریبی اور انقلابی تحریک کو مطلق العنانی کو روکے رہی تھیں - انہوں نے دل میں یہ احساس پیدا ہوچکا تھا کہ تخریب کے ساتھ تعمیر کی بھی ضرورت ہے - سب سے زیادہ اس کا احساس گوئٹے کو تھا اور اس میں اتنی قوت بھی تھی کہ طوفان کو قابو میں لاکر اس سے آب رسانی کا کام لے --

غرض گوئٹے کی زندگی اس اصلاح و تعمیر کا افسانہ ہے جو اس نے اپنی سیرت میں اور اپنی قوم کے ادب اور تہذیب میں کی - یہ کوئی سہل کام نہ تھا جو تھوڑے دن میں انجام پا جاتا' بلکہ اس میں گوئٹے کو سالہا سال داخلی اور خارجی مشکلوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھنا پڑے - اس کی زندگی کے چھ دور قرار دئے جاسکتے ہیں جنہیں ہم علحدہ علحدہ بیان کریں گے-

پہلا دور بچپن اور عنفوان شباب کا ہے - فرانکفورٹ میں گوئٹے کی زندگی باپ کی سخت نگرانی میں' ماں کے دامن شفقت میں' بہن کے ساتھ پیار اور کھیل میں گذری اس کا باپ خوش حال آدمی تھا مگر سادگی اور کفایت شعاری سے زندگی بسر کرتا تھا - وہ اپنے بیٹے اور بیٹی کو نہایت اہتمام سے گھر پر تعلیم دیتا تھا - گوئٹے دس برس کا تھا (۱۷۵۹) کہ فرانسیسیوں نے فرانکفورٹ پر قبضہ کرلیا اور شہر والوں کے گھروں میں جبراً فرانسیسی سپاہی اور افسر رکھے

لئے ۔ گوئٹے کے گھر میں بھی فرانسیسی افسر رہتے تھے ۔ اُس کا باپ شرم اور نفرت کے جذبات سے اس قدر مغلوب تھا کہ اُس نے اپنے کمرے سے نکلنا چھوڑ دیا ۔ مگر خاندان کے اور سب افراد اُن فرانسیسیوں کی خوش مزاجی، تہذیب اور نفاست سے بہت خوش تھے اور اُن کے ساتھ لطف سے وقت گذارتے تھے ۔ اس طرح کے خیالات اور اُس کے مذاق پر بچپن سے فرانسیسی اثر پڑا ۔ سنہ ۱۷۶۵ ء میں جب وہ لائپزگ کی یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم پانے کے لئے بھیجا گیا اُس وقت وہ فرانسیسیوں کی تقلید میں سر سے پیر تک ڈوبا ہوا تھا ۔ اس کی وضع قطع میں، بات چیت میں، نشست و برخاست میں تکلف اور تصنع کی بھرمار تھی ۔ لائپزگ کے لوگ بھی اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے ۔ یہاں گوئٹے کی زندگی سخت روحانی کوفت میں گذری ۔ اُس کی شاعرانہ طبیعت اپنے اور دوسروں کے اس طرز زندگی سے سخت بیزار تھی ۔ علاوہ اس کے یونیورسٹی کے تنگ نظرانہ اور سطحی طرز تعلیم سے بہت گھبراتا تھا ۔ ایک تو وہ خود خوش اور حساس طبیعت رکھتا تھا اور ملنے جلنے سے پرہیز کرتا تھا اور دوسرے درجے کے معلموں کو وہ دقیانوسی اور وہ برادری سمجھتا تھا اُن سے جو پڑھتا تھا ۔ اس لئے اس کے استادوں کو اس کی طرف کوئی توجہ نہ تھی ۔ طالب علموں میں بھی اس کے دوست بہت کم تھے ۔ اس کسمپرسی سے محبت کا بھوکا گوئٹے ہمیشہ اداس اور افسردہ رہا کرتا تھا ۔ کچھ اس کے اثر سے اور کچھ نوجوانی کی بے راہ روی سے وہ ایک معمولی درجے کی عورت اینتے شوئنکوپف پر عاشق ہوگیا ۔ اس زمانے میں اُس نے بہت سی گندی نظمیں لکھیں اور دو چھوٹے ڈرامے ۔ لیکن اس کلام میں بھی وہی تصنع پایا جاتا ہے جو اُس کی زندگی میں تھا ۔ اس کو ابھی وہ راہ نہیں ملی تھی جسے اُس کی روح ڈھونڈھتی تھی ۔ اُس کے حوصلے اُس کی آرزو، اُس کے نصب العین میں اور اُس کی واقعی زندگی میں جو تضاد تھا اُس نے گوئٹے کو عجب روحانی کشمکش میں مبتلا کردیا تھا ۔ عشق کے معاملے میں بھی اسے تھوڑے دن کے

بعض مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ الیقی سے اُس کے تعلقات نہ نبھ سکے - ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ گوئٹے کی صحت روز بروز گرتی گئی یہاں تک آخر وہ سخت بیمار ہو کر سنہ ۱۷۶۸ ع میں اپنے گھر فرانکفورٹ واپس آیا —

یہاں وہ ڈیڑھ سال تک علالت کی حالت میں رہا - اس کی ماں کی دوست فروئلائن فان کلیٹنبرگ نے جو پئیٹسٹ* (Pietist) فرقے سے تعلق رکھتی تھی، بڑی دلسوزی سے اس کی تیمارداری کی وہ چاہتی تھی کہ گوئٹے کو اپنے فرقے میں شامل کرے - اس کی صحبت کے اثر سے گوئٹے کے دل میں مذہبیت کا جوش پیدا ہوا جو کسی نہ کسی صورت میں عمر بھر باقی رہا مگر پئیٹسٹ فرقے کے جذبات پرستانہ عقائد سے اس کی تسکین نہیں ہوئی۔ اس نے اس سلسلے میں سحر و نیرنجات کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا لیکن اس کی نقادانہ محققانہ نظر نے بہت جلد دیکھ لیا کہ ان چیزوں کی کوئی اصلیت نہیں - پھر بھی فروئلائن فان کلیٹنبرگ کا وہ بہت ممنون احسان تھا اور اس نے اپنے ناول ولہیلم مائسٹر میں اس خاتون کی سیرت نہایت خوبی سے بیان کی ہے —

گوئٹے کی زندگی کا دوسرا دور سنہ ۱۸۷۰ع سے شروع ہوتا ہے جب وہ اپنی تعلیم کو مکمل کرنے اسٹراسبرگ گیا - یہ شہر فرانس کی سرحد پر واقع ہونے کے سبب سے لائپزگ سے بھی زیادہ فرانسیسی رنگ میں رنگا ہوا تھا - لیکن گوئٹے کی نظر میں اب زیادہ گہرائی پیدا ہو چکی تھی - یہاں اس نے اپنے ہم وطنوں کو اس اندھے پن سے وضع قطع گفتگو اور خیالات میں فرانسیسیوں کی تقلید کرتے دیکھا کہ اسے سخت شرم آئی اور اس کی ضد پر اس کے دل میں جرمن قومی تمدن کی محبت کا جذبہ بیدار ہوا اور ہرڈر کی ملاقات گویا سونے پر سہاگا ہوگئی - ہرڈر نے گوئٹے کے

---

* جرمنی میں ایک مذہبی فرقہ تھا جو سترھویں صدی میں قائم ہوا تھا - یہ لوگ پروٹسٹنٹ مذہب کی انتہائی معقولیت اور خشکی کو تصوف اور جذبات پرستی کی چاشنی سے دور کرنا چاہتے تھے -

دل میں قومیت کے جوش کو اور اُبھارا، اُسے اپنا قومی ادب کا نظریہ سمجھایا اور جرمن قومی شاعری اور جرمن طرز تعمیر کی خوبیوں کی طرف توجہ دلائی۔ گوئٹے پر ہرڈر کی شخصیت کا جتنا گہرا اثر پڑا اتنا کسی کا نہیں پڑا اور جتنی عقیدت اسے اس سے تھی شاید کسی سے نہیں ہوئی۔ باوجود اس کے کہ ہرڈر گوئٹے کے ساتھ برابر سختی، بےمروتی، ہمت شکنی، تضحیک کا برتاؤ کرتا رہا، گوئٹے کے دل میں ہمیشہ اس کے خیالات کا احترام رہا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گوئٹے نے فاوسٹ میں واگنر کی جو تصویر کھینچی ہے وہ ہرڈر اور اس کے ایک اور دوست میرک کے خط و خال سے مرکب ہے۔ اسٹراسبرگ میں اور بھی کئی نوجوان ہرڈر کے خیالات سے متاثر ہوئے تھے اور ان سب نے مل کر ایک ادبی حلقہ قائم کیا تھا جس نے جرمنی کی رومانی روح کو بیدار کرنے کے لئے "طوفان و ہیجان" کی تحریک شروع کی۔ لیکن اس تحریک کا روح رواں گوئٹے ہی تھا۔ اسی کی بدولت رومانیت پروان چڑھی اور اسی نے اس کی کمزوریوں کو محسوس کرکے اس کی اصلاح کی —

اسٹراسبرگ میں بھی گوئٹے کا دردآشنا دل تیر محبت سے زخمی ہوا۔ شہر کے قریب ایک خاندان رہتا تھا جس سے گوئٹے کی ملاقات تھی۔ صاحب خانہ کی بیٹی فریڈریکے بریون کے حسن نے گوئٹے کے دل کو موہ لیا۔ یہ محبت بالکل پاک تھی۔ اسی لئے گوئٹے پر اس کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ اس نے اپنی معشوقہ کو "فاؤسٹ" میں گریٹشن بناکر اسے حیات جاودانی بخشی۔ کشمکش آرزو سے نجات پانے اور راز معشوق کی پردہ داری کے خیال سے گوئٹے نے اس گھر میں آنا جانا ترک کردیا۔ یہ رمیدگی اس کے عشق کی خصوصیت تھی اور کئی بار مختلف موقعوں پر ظہور میں آئی —

جب گوئٹے سنہ ١٨٧١ء میں اپنی تعلیم ختم کرکے اور قانون کی سند لے کر اسٹراسبرگ سے رخصت ہوا تو وہ دو ڈراموں کا خیال اپنے دل میں لایا ایک تو

گوتس فان برلی شنگن کا اور دوسرے فاوسٹ کا ۔ یہ دونوں سولھویں صدی کے جرمن کیر یکٹر ھیں ۔ اس سے معلوم ھوتا ھے کہ ھرڈر کے اثر سے قومی ادب کا خیال گوئٹے کے دل میں کس قدر راسخ ھوچکا تھا ۔

اب ' گوئٹے ' نے ' فرانکفورٹ ' میں وکالت شروع کی لیکن اس کا اصلی مشغلہ تصنیف و تالیف تھا ۔ سنہ ۱۷۷۱ ع میں اس کا ڈراما " گوتس " شائع ھوا ۔ یہ ' جرمن ' ادب میں اپنی قسم کا پہلا ڈراما تھا ۔ اس میں سولھویں صدی کے ایک اولوالعزم نائٹ کا قصہ ھے جو رسم اخلاق کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کرتا بلکہ اپنے ضمیر کے اخلاقی نصب العین کے مطابق شجاعت اور مردانگی کے بڑے بڑے کار نمایاں انجام دیتا ھے ۔ وہ شاھنشاہ اور دوسرے رئیسوں سے لڑ کر اپنے طبقے کی کھوئی عزت حاصل کرتا ھے اور میدان جنگ میں تلوار کا زخم کھا کر ھنستے ھنستے جان دیتا ھے ۔ اس مشہور ڈرامے میں ' گوئٹے ' نے ' شیکسپیر ' کی طرح تمام مسلمہ اصول فن توڑ دیے ۔ اس نے اس میں صرف کیر کٹر نگاری کو مد نظر رکھا ۔ داستان کے تسلسل اور اسٹیج کے قواعد کی کوئی پروا نہیں کی ۔ ' جرمن ' پبلک نے بڑے زور شور سے اس کتاب کا خیر مقدم کیا اور اس کے مصنف کی شہرت تمام ملک میں پھیل گئی ۔ لیکن ' ھرڈر ' کی مشکل پسند طبیعت نے اسے پسند نہیں کیا اور اس نے 'گوئٹے' کو بہت سرزنش کی اور لکھا کہ "شیکسپیر نے تمھیں خراب کردیا" ۔

اس زمانے میں عشق نے پھر ' گوئٹے ' کے مشتاق جراحت دل کی پرسش کی ۔ وہ اپنے ایک دوست کی بیوی ' لوٹے کیسٹنر ' پر دل و جان سے عاشق ھو گیا ۔ ' لوٹے ' اس سے دوستانہ تلطف کا برتاؤ کرتی تھی لیکن اس کا ناز پاکدامنی ' گوئٹے ' کے نیاز عشق کو ھمیشہ رد کرتا تھا ۔ شاعر نے اپنے قلب کی بیچینی کی تصویر شعر منثور میں کھینچی اور اس قصے کا نام " نوجوان ویرتھر کے مصائب" رکھا ۔ سنہ (۱۷۷۴ ع) ۔ ' ویرتھر ' ایک شادی شدہ حسینہ پر عاشق ھوتا ھے اپنے جذبات مضطرب کا اظہار عاشقانہ خطوط میں کرتا ھے ۔ اور آخر درد فراق کی

کتاب نہ لاکر خود نذر کر لیتا ہے - یہ قصہ "گوئٹے" نے بیخودی کے عالم میں ایک ہفتے میں ختم کیا۔ گوئٹے کی عمر کا یہ دور سراپا "طوفان و ہیجان" ہے اور ویرتھر اسی کا سچا مظہر ہے۔ گوئٹے نہایت ہوشیاری سے کوشش کرتا تھا کہ وکالت کے پیشے میں جی لگائے لیکن اس کا سیماب وش دل چین نہ لینے دیتا تھا۔ اس نے چاہا کہ ایک تاجر کی لڑکی سے شادی کر لے۔ منگنی بھی ہو گئی۔ لیکن اختلاف مشرب اور خیالات کے سبب سے شادی کی نوبت نہ آئی —

سنہ ۱۷۷۵ء میں گوئٹے نے "فاوسٹ" لکھا۔ اپنی پہلی صورت میں یہ "طوفان و ہیجان" کا ڈراما تھا، لیکن آگے چل کر اچھی اور ہی چیز بن گیا۔—

اسی سال گوئٹے کو وائمار کے نوجوان فرمانروا ڈیوک کارل آگسٹ نے اپنا مصاحب مقرر کر کے بلا بھیجا۔ گوئٹے بھی فرانکفورٹ کی پر آشوب زندگی اور مایوس عشق کی تلخیوں سے عاجز آ گیا تھا۔ علاوہ اس کے وائمار کے دربار میں داخلے سے امید تھی کہ کالج کی محدود زندگی سے نجات پا کر جاہ و منصب ثروت اور عزت حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ اس لئے اس نے خوشی سے منظور کر لیا۔ نوجوان ڈیوک اور جوان شاعر میں چودہ دن قبل پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس کی تھی۔ اسی کی بدولت "گوئٹے" کو "کارل آگسٹ" کا قرب حاصل ہوا اور اس قرب سے عمر بھر کی سچی دوستی کی بنیاد پڑی۔ وائمار میں گوئٹے کی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا، جس نے بتدریج اس کے مزاج اور اس کی سیرت میں عظیم الشان تبدیلی پیدا کی۔ درباری زندگی کی دلچسپیوں اور مصروفیتوں کے سبب سے بہت دن تک اس کی شاعرانہ تخلیق کا سر چشمہ بند رہا لیکن گوناگوں تجربوں کی بدولت سطح کے نیچے آب حیات کا خزانہ جمع ہوتا رہا جو آگے چل کر ابلا اور بحر ذخار بن کر ابلا—

فرانکفورٹ ہی میں گوئٹے نے اپنا ڈراما "ایگمونٹ" شروع کر دیا تھا۔ مگر یہ وائمار جانے کے بارہ برس بعد سنہ ۱۷۸۷ء میں ختم ہوا۔ یہ ایک امیر کا

قصہ ہے جو ایک نیچے طبقے کی عورت پر عاشق تھا - اس کی راہ میں ہزاروں خطرے تھے مگر اسے کسی کا احساس نہیں ہوا یہاں تک کہ آخر وہ ورطۂ ہلاکت میں غرق ہو گیا - اس قصے میں ' گوئٹے ' کا ' ڈیمون ' (Demon) کا نظریہ ہے - یہ انسان کی سیرت کا لا شعوری عنصر ہے جو حرکت اور تخلیق کی قوت کا خزانہ ہے - اس کی بدولت انسان زندگی کی سنگلاخ راہوں میں بے جانے بوجھے بے دیکھے بھالے آگے بڑھا چلا جاتا ہے - چاہے جو انجام ہو - اس نئے رومانی دور میں ' گوئٹے ' اس کا قائل ہے کہ آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو اس مخفی قوت کے ہاتھ میں چھوڑ دینا انسان کی نجات کا باعث ہے - ان دنوں اس کی تصانیف پر بلکہ اس کی ساری زندگی پر یہی بیخودی اور بیشعوری کا رنگ چھایا ہوا ہے —

جیسا ہم کہہ چکے ہیں ' وائمار ' آنے کے بعد چند سال تک ' گوئٹے ' دربار کی لا ابالی زندگی اور ہم سن اور ہم مشرب احباب کی پر لطف صحبتوں میں ایسا ڈوبا رہا کہ اسے سوائے چھوٹی چھوٹی ہنگامی چیزوں کے لکھنے کے تصنیف و تالیف کا بالکل موقع نہیں ملا - ڈیوک کارل آؤگسٹ ' ان دنوں عہد شباب کی رندی و سیہ مستی کی داد دے رہا تھا - ' گوئٹے ' اس کی بزم عشرت میں شمع فروزاں بن کر پہنچا - وہ سفر میں ' حضر میں ' دربار میں ' شکار میں ' ڈیوک ' کے ساتھ رہتا تھا اور اپنی طبیعت کی رنگینی ' شوخی ' اور اپج سے عیش و مسرت کی نئی نئی راہیں نکالتا تھا - مگر اس کی روح اس زندگی سے مطمئن نہ تھی - مبداء فیاض نے اسے جو جوہر قابل عطا کیا تھا وہ نشو و نما کے لئے بیچین تھا - جوش جوانی اور احساس فرض آرزوے عیش اور تمنائے تخلیق میں شدید کشمکش تھی —

اس روحانی تلاطم میں ' گوئٹے ' کی دستگیری اس چیز نے کی جو بہتوں کو گرداب بلا میں مبتلا کرتی ہے یعنی عشق و محبت نے - ' فراؤ فان اشٹائن ' نے جو ریاست ' وائمار ' کے ایک عہدہ دار کی بیوی تھی حسن صورت اور جمال سیرت

کی موہنی نے نوجوان شاعر کے دل کو موہ لیا ۔ یہ خاتون ' گوئٹے ' سے عمر میں بڑی تھی اور وقار و متانت ' نفاست مذاق ' اصابت رائے اور حسن تدبیر میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی ۔ کچھ اُس کی واقعی صفات اور کچھ شاعر کے تخیل کی کمال بولی (Idealization) غرض ' گوئٹے ' اُسے صنف نسوانی کا کامل نمونہ سمجھتا تھا ۔ ان دونوں کی محبت برسوں تک افلاطونی عشق کی حد سے آگے نہیں بڑھی ۔ ' گوئٹے ' اُس سے کاروبار میں ' تصنیف و تالیف میں غرض ہر چیز میں مشورہ لیتا تھا اور اُس کے مشورے پر عمل کرتا تھا جوش جوانی کے تقاضے سے وہ روحانی ارتباط کے علاوہ جسمانی وصل کا بھی طالب تھا مگر اس کی معشوقہ مدتوں اُن پیارے حیلوں سے جنہیں کچھ چالاک اور شائستہ عورتیں ہی خوب جانتی ہیں ٹالتی رہی آخر گوئٹے کے دل کی مراد پوری ہوگئی ؛ اگرچہ بعض دقتوں سے نکاح نہ ہوسکا مگر دونوں کے تعلقات اسی قدر استوار اور وفادارانہ تھے جیسے میاں بیوی کے ہوتے ہیں اور آخر عمر تک ایسے ہی رہے ۔

فراؤ فان اشٹائن کے اثر سے ' گوئٹے ' کی سیرت میں عظیم الشان انقلاب ہوگیا ۔ اُس نے اپنی لاابالی زندگی بالکل ترک کردی اور وہ ضبط نفس حاصل کیا جس پر زاہدوں کو بھی رشک آئے ۔ وہ محنت ' فرض شناسی ' کفایت شعاری ' پابندی اوقات کا پتلا بن گیا ۔ جو انتظامی فرائض اُس کے سپرد تھے اُن سے اُس کی طبیعت کو ذرا بھی مناسبت نہ تھی ۔ لیکن طبیعت پر انتہائی جبر کرکے اس نے محنت اور ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دینا شروع کئے ۔ اُسے وائمار کی رعایا کی بہبود کی سوتے جاگتے ہر وقت خیال رہتا تھا اور اس کے لئے وہ نت نئی تدبیریں سوچتا تھا اور اُن پر مستعدی اور تن دہی سے عمل کرتا تھا ۔ یہ سچ ہے کہ اُس کی سعی سے ملک کے نظام و نسق میں کوئی دیرپا خارجی نتائج حاصل نہیں ہوئے مگر اس میں اُس کا قصور نہ تھا ۔ پھر بھی یہ فائدہ کیا کم ہے کہ خود ' گوئٹے ' کی سیرت میں اس عملی جدوجہد سے پختگی اور یکسوئی پیدا ہوگئی اور اُسے انسانی زندگی میں وہ بصیرت حاصل ہوگئی جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ اُس

نوجوان ڈیوک کی تربیت اور اصلاح کی کوشش شروع کی جو ابتدا میں تو کامیاب نہیں ہوئی لیکن اُس کے انتہائی استقلال کی بدولت آخر میں اپنا اثر دکھا کر رہی۔ مدبر کی حیثیت سے گوئٹے نے وائمار کو کوئی نمایاں فائدہ نہیں پہنچایا لیکن معلم کی حیثیت سے اُس نے وائمار کے فرمانروا کو لاابالی سے فرض شناس اور خوش تدبیر حکمراں بنا دیا۔

اس عرصے میں اس کی تصنیف بہت محدود رہی۔ زیادہ تر توجہ غنائی شاعری کی طرف رہی۔ دو ڈرامے 'افی گینیا' اور 'ٹیسو' اُس نے شروع کئے مگر انہیں ختم نہ کر پایا۔ ان ڈراموں کے دو حصے اُس نے اس زمانے میں لکھے اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کا شاعرانہ عقیدہ بدل چلا ہے۔ وہ انسان کے فطری جوش طبیعت کا قائل ہے لیکن اخلاق و تمدن کے ضابطوں کی روحانی قوت بھی اُسے نظر آنے لگی ہے۔ اسے یہ احساس پیدا ہو چلا ہے کہ ان دونوں چیزوں میں امتزاج کی ضرورت ہے۔ لیکن ابھی اس امتزاج کی کوئی شکل اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کے لئے اسے کسی خارجی اثر کی ضرورت ہے مگر یہ اثر 'جرمنی' میں نہیں ملتا۔ خدا جانے کیا بات ہے کہ اس کا دل خود بخود اطالیہ کی طرف کھنچ رہا ہے —

سنہ ۱۷۸۶ء کے آغاز میں 'گوئٹے' کی طبیعت بہت بے چین ہے۔ اپنی شاعرانہ قوت تخلیق کے رک جانے کا اسے بےحد صدمہ ہے۔ وہ سمجھ گیا ہے کہ انتظامی کام اس کے بس کا نہیں۔ بیدلی سے کام کرنا اسے گوارا نہیں۔ وہ رسیاں تڑا کر بھاگنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی کمزور طبیعت کا آدمی ہوتا تو خدا جانے کب تک اسی حیص بیص میں رہتا مگر گوئٹے کی طبیعت کمزور نہیں۔ اُس میں بلا کی قوت ہے جو پچھلے چند سال کی باضابطہ زندگی کی بدولت اور پختہ ہو گئی ہے۔ وہ جلد فیصلہ کرتا ہے کہ اُسے اطالیہ کا سفر کرنا چاہئے اور ڈیوک سے اجازت لے کر بغیر اپنے دوستوں سے مشورہ کئے چل دیتا ہے۔

'اطالیہ' میں اس کا قیام دو سال سے زیادہ رہا۔ اس ملک میں اُسے وہ چیز مل گئی جسے اُس کا دل مدت سے ڈھونڈتا تھا۔ یہاں کی خوشنما پرانی عمارتوں میں، یہاں کے عجائب خانوں میں، یہاں کی آرٹ گیلریوں میں اُسے قدیم 'یونانی'

رومی ' تمدن کے نمونے اور کلاسیکی روم کے مجسمے ملے - یہاں آکر اسے معلوم ہوا کہ فنکار نے کس طرح اپنی فطرت کے اُبھار اپنی طبیعت کی اُپج کو ترتیب اور ہم آہنگی کے ضابطوں سے متوازن [illegible] اور مفید بنایا تھا جس طرح ' طوفان و ہیجان ' کو اخلاقی اور مذہبی [illegible] کے پیشتوں سے قابو میں لاکر فن پر لگایا تھا - اطالیہ میں آکر گوئٹے کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا جو اصل میں اُس کی شاعرانہ تخلیق کا [illegible] زندگی کے مطالعہ کے لئے اسے حسن بصیرت کی [illegible] وہ مل گئی اس کے [illegible] واضح ہو گئے اسے [illegible] نظر آنے لگا -

علاوہ اس کے [illegible] آب و ہوا میں سکون و [illegible] کی زندگی بسر کرنے سے [illegible] زندگی پر تبصرہ اور [illegible] کی طیاری کرنے [illegible] یہاں اُس نے [illegible] تصانیف پر نظرثانی کی [illegible] گوئٹے جو اس کی [illegible] اور [illegible] کے عہد کی یادگار [illegible] کیا ہو [illegible] کا اکثر حصہ لکھا اور [illegible] ذہن میں تھا وہ بالکل بدل گیا - [illegible] کی تفصیلیں ہم آگے کے صفحات میں کریں گے -

' افی جینیا ' کا قصہ ایک قدیم یونانی روایت پر مبنی ہے - مشہور یونانی شاعر ' یوری پیڈس ' نے بھی اس پر ڈراما لکھا ہے - یہ ایک بہادر اور عقلمند لڑکی کی کہانی ہے جو اپنے باپ کے قول کو پورا کرنے اور اپنے ملک کی مدد کے لئے ' آرتیمس ' دیوی کے مندر میں قربان کئے جانے پر طیار ہو گئی مگر اپنی دانشمندی اور دیوی کی مدد سے اس نے اپنی جان بھی بچالی اور اپنے ملک کی لاج بھی رکھ لی - اس ڈرامے میں ' گوئٹے ' نے کلاسیکی طرز ادا کو اس خوبی سے نبھایا ہے کہ یہ قدیم ' یونانی ' طرز کے بہترین ڈراموں میں شمار کیا جاتا ہے - مضمون کے اعتبار سے بھی یہ قصہ شاہد ہے کہ اب ' گوئٹے ' مذہب و اخلاق کو جس کا وہ ابتدائی دور میں مخالف تھا اور ہی نظر سے دیکھتا ہے -

ٹیسو میں اگرچہ گوئٹے نے جدید عہد کے ایک شاعر کا قصہ لکھا ہے - لیکن ہر اعتبار سے یہ ڈراما بھی کلاسیکی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے - شاعر کی بیچینی اور حساس طبیعت ، اس کی عاشق مزاجی ، اس کے والہانہ جوش ، اس کی شہرت پسندی ، اس کی رقابت کی تصویر دکھانے میں گوئٹے نے کمال کردیا ہے - ٹیسو کے حریف مدبر کا کیرکٹر بھی بالکل حقیقت پر مبنی ہے —

اصل میں اس ڈراما میں گوئٹے یہ اعتراف کرتا ہے کہ شاعر اپنی نازک مزاجی ، اپنی زود رنجی ، اپنی لطافت طبع کے سبب سے عملی زندگی کی سختیوں اور ناہمواریوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور اس کی کشتی حیات ان چٹانوں سے ٹکراکر پاش پاش ہوجاتی ہے —

سنہ ۱۷۸۸ ع میں اٹلی سے واپسی کے بعد گوئٹے نے انتظامی اور عملی کاموں میں حصہ اپنا کم کردیا اور آہستہ آہستہ تخیل اور تفکر کے کنج عزلت میں گوشہ نشینی اختیار کی - ریاست کی جو خدمتیں اس نے اپنے ذمے اب بھی وہ ایسی تھیں جن سے اس کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی - کچھ دن وہ وزیر تعلیم رہے اور مدتوں دربار کے تھیٹر کا منتظم - سنہ ۱۷۸۹ ع میں گوئٹے نے ٹیسو ختم کرایا - دوسرے سال اس کی اس وقت تک کی تصانیف کا مجموعہ شائع ہوا جن میں فاؤسٹ بھی Fragment (ایک نا تمام ٹکڑے) کے نام سے شامل تھا —

یہ انقلاب فرانس کا زمانہ تھا - گوئٹے کو ابتدا میں اس تحریک سے بڑی ہمدردی تھی - اپنی طرز معاشرت کے لحاظ سے وہ امارت پسند تھا لیکن اس کو عوام کے طبقے سے بڑی محبت تھی - ابھی تک اس کے دل سے "طوفان و ہیجان" کی یاد محو نہیں ہوئی تھی جس کا نعرۂ جنگ " آزادی " تھا - فرانس کے عوام کو امرا کے جبر و استبداد سے آزاد ہوتے دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہوئی - جب نپولین نے ریاست پروشیا سے جنگ چھیڑی تب بھی گوئٹے کی ہمدردی اس اولوالعزم فاتح کے ساتھ تھی - وائمار نے حب وطن کے جوش میں پروشیا کا ساتھ دیا تو

گوئٹے کو بڑا صدمہ ہوا۔ اُسے اپنے ملک سے جتنی محبت تھی وہ ہم لوگوں کو ہوگی لیکن وہ سمجھتا تھا کہ نپولین نے تمام یوروپ کو آزاد کرانے اور ایک نئے اور اعلیٰ تمدن کی بنیاد رکھنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ وائمار میں کوئی اس معاملے میں اُس کا ہم خیال نہ تھا، اس لئے اُس کی دلچسپی انقلاب سے رفتہ رفتہ کم ہو گئی اور وہ حکیمانہ بے تعلقی سے اُس کی نشو و نما کا مطالعہ کرنے لگا۔ لیکن نپولین سے اُسے ہمیشہ عقیدت رہی۔

ان دنوں وائمار میں ایک نوجوان شاعر آیا ہوا تھا جو جرمنی کے آسمانِ سخن پر گوئٹے کے پہلو بہ پہلو چمکنے والا تھا۔ شلر جس کا نام آج تک گوئٹے کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اعتقاد طبیعت، شاعرانہ عقائد، طرز ادا غرض ہر چیز میں گوئٹے سے مختلف تھا۔ سن رسیدہ گوئٹے خود دار، بھاری بھر کم، صابر اور دور اندیش تھا اور نوجوان شلر بے تکلف، گرم جوش، جلد باز اور ناعاقبت اندیش۔ شلر صرف شاعر نہ تھا بلکہ اُس نے تاریخ اور فلسفہ کا بھی عالمانہ مطالعہ کیا تھا۔ فلسفے میں وہ کانٹ کا پیرو تھا اور جمالیات کے شعبے میں اُس نے کانٹ کے خیالات کو بنیاد قرار دے کر بڑے گہرے اور بصیرت افروز مقالے لکھے ہیں۔ اپنی شاعری میں بھی وہ ایک حد تک فلسفیانہ اصول کا پابند تھا اور منطقی تعامل سے جس حد تک شاعر کام لے سکتا ہے لیتا تھا۔ گوئٹے رسمی فلسفہ سے زیادہ دلچسپی نہ رکھتا تھا لیکن اُس کی فطری ذہانت اُس کی وسیع نظر اُس کے گہرے مطالعے، اُس کے طویل تجربے نے اُسے فلسفۂ زندگی میں وہ بصیرت بخشی تھی جو شلر تو کیا عہد جدید کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ پھر ہمہ گیری کے اعتبار سے بھی شلر کو اُس سے کوئی نسبت نہ تھی۔ مجرد فلسفہ نہ سہی لیکن سائنس کے ہر شعبے میں اور دوسرے علوم و فنون میں وہ اہل فن کا سا درک رکھتا تھا۔ تاہم اُس نے شلر کی طرح شاعری کی بنیاد فلسفے پر نہیں رکھی تھی بلکہ فلسفے کی شاعری پر۔ وہ فلسفہ کی عینک سے زندگی کا مطالعہ نہیں کرتا تھا بلکہ شاعر کی نظر سے اُس کا

مشاہدہ کر کے فلسفیانہ نتائج حاصل کرنا چاہتا تھا ۔ جو لوگ شاعری کی حقیقت سے واقف ہیں انہیں یہ تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا کہ گوئٹے کا اصول صحیح ہے اور شلر کا غلط ۔ ان دونوں کی شاعری خود اس کی روشن دلیل ہے ۔ شلر کا کلام زور، صفائی، چستی کے لحاظ سے نہایت قابل قدر ہے، لیکن اُس میں وہ گہرائی نہیں جو گوئٹے کے یہاں پائی جاتی ہے ۔ شلر کا کوئی ڈراما فلسفیانہ نہیں کہا جا سکتا، گوئٹے کا فاؤسٹ دنیا کی اعلیٰ ترین فلسفیانہ نظموں میں شمار ہوتا ہے —

شلر کو گوئٹے سے ملنے کی بڑی آرزو تھی لیکن گوئٹے کچھ اختلاف طبیعت، کچھ مزاج پسندی، کچھ رشک کے سبب سے بہت دن تک کتراتا رہا ۔ آخر دونوں میں ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا اور آہستہ آہستہ انہیں ایک دوسرے کی قدر و قیمت کا اندازہ ہونے لگا ۔ سنہ ۱۷۹۴ء تک اُس دوستی کی بنیاد مضبوط ہو چکی۔ علمی اور باہمی تنقید و تاثر کا وہ سلسلہ شروع ہو چکا تھا جس نے دونوں کے حوصلوں کو بڑھایا اور دونوں کے کلام میں چار چاند لگا دئیے

شلر کی دوستی سے گوئٹے کی زندگی کا پانچواں دور شروع ہوتا ہے اور یہی دور اُس کی شاعری اور معنی آفرینی کا بہترین عہد ہے ۔ شلر کے جوش جوانی اور حوصلہ مندی نے گوئٹے کے دل میں شاعری کی دبی ہوئی آگ کو ابھارا اور اُس کے مشورے اور اصرار سے گوئٹے نے ان معرکہ آرا تصانیف کو پھر ہاتھ میں لیا جنہیں وہ مدت سے چھوڑ چکا تھا ۔ اب شلر گوئٹے کا ادبی مشیر بن گیا اور اُس کے اثر سے گوئٹے کو اپنی تصنیف میں تنقید اور تنظیم کی طرف زیادہ توجہ ہوئی ۔ اب تک اُس کی طبیعت ایک پہاڑی ندی کی طرح بے قید تھی اور جدھر من کی موج ہو اُدھر بہتی تھی ۔ اب اُس نے اسے ایک نہر کی طرح سوچ سمجھ کر معینہ راستوں پر لے جانے کی کوشش کی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کیف و کم دونوں کے لحاظ سے اُس کی تصنیف نے بہت ترقی کی ۔ اب وہ زندگی کے منفرد پہلوؤں کی مصوری سے آگے بڑھ کر مجموعی انسانی زندگی کا نقاش بن گیا ۔

اس سلسلے کی پہلی کتاب "ولہیلم مائسٹر کا زمانۂ شاگردی ہے"۔ کسی زمانے میں اس نے ایک نوجوان کا قصہ لکھا تھا جو تھیٹر کی تماشاگری کو اپنا پیشہ بنانا چاہتا ہے اور برسوں اس کوچہ میں سرگرداں رہ کر عجیب تجربات حاصل کرتا ہے۔ اب گوئٹے نے اس قصے کو دوبارہ لکھا اور ایک شاہکار بنا دیا جس کا جواب کم ہی ادب میں مل سکتا ہے۔ یہ کتاب 'فاؤسٹ' کی طرح گوئٹے کے فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ تعلیم کا آئینہ بن گئی۔ اس میں گوئٹے نے یہ دکھایا ہے کہ سچی تعلیم وہ ہے جو انسان زندگی کی سختیاں جھیل کر اور ٹھوکریں کھا کر حاصل کرتا ہے بشرطیکہ اس کی آنکھیں کھلی ہوں —

ہم کہہ چکے ہیں کہ نپولین کا شوق گوئٹے کو سفر نے دلایا تھا۔ گوئٹے جو زندگی کے شروع سے ادب و تصنیف کی مسند پر بیٹھا تھا اب اس طرف متوجہ ہوا کہ دوسروں کو راہ دکھائے اور تعلیم دے۔ اس نے 'پروپیلین' کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا تھا۔ گوئٹے نے اس میں تنقیدی اور طنزیہ مضامین لکھے ان میں فن تنقید کے وہ باریک نکتے بیان کئے گئے ہیں جن کی مثال جرمنی میں کیا دنیا کے ادب میں ملنا مشکل ہے —

یہ چیزیں تو نثر میں تھیں۔ نظم میں گوئٹے نے وہ پیاری کتاب 'ہرمان اور ڈوروتھیا' لکھی جو خیالات کی پختگی اور طرز ادا کی سادگی کے لحاظ سے 'ہومر' اور 'فردوسی' کے کلام کی طرح سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں دیہات کی سیدھی سادی زندگی اور دو پاک اور بھولی روحوں کے باہمی عشق کی تصویر ہے جس کا ہر رنگ دلکش اور ہر خط اثر آفریں ہے۔ اس کے اس عہد کے چھوٹے ڈراموں اور غنائی شاعری میں بھی 'کلاسیکی رنگ' چھایا ہوا ہے —

ان چیزوں کے ساتھ گوئٹے 'فاؤسٹ' پر بھی نظرثانی کرتا رہا۔ اس کی ہمہ گیر طبیعت ایک وقت میں ایک چیز پر قناعت نہ کرتی تھی۔ ایک ہی وقت میں وہ نہ صرف مختلف ادبی کام کرتا تھا بلکہ طبیعیات، نباتات، معدنیات وغیرہ

میں نظری مطالعہ اور عملی تجربہ کرتا رہتا تھا۔ اسی کے ساتھ' نقاشی اور دوسرے فنون لطیفہ کا شغل بھی رہتا تھا اس سرسری خاکے میں ہم 'گوئٹے' کو صرف ادیب کی حیثیت دکھانا چاہتے ہیں ورنہ وہ تو ایسا جامع حیثیات شخص تھا کہ اس کی زندگی علم النفس کے ماہروں کے نزدیک ایک معمہ ہے۔ اس کی جتنی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں سے کسی کو اٹھا کر دیکھئے تو ذہن انسانی کی وسعت اور ہمہ گیری کا حیرت انگیز نمونہ نظر آئے —

'گوئٹے' اور 'شلر' کی دوستی کا یہ دور حکم قضا سے بہت جلد ختم ہو گیا۔ 'شلر' سنہ ۱۸۰۵ء میں سن کہولت کو پہنچنے سے پہلے دنیا سے رخصت ہو گیا۔ 'گوئٹے' کو اس کے مرنے کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس کی فطری شگفتگی ہمیشہ کے لئے مرجھا گئی اور اس کی خالص اُمنگ ہمیشہ کے لئے دب کر رہ گئی اس کی عزلت پسندی اب اور بھی بڑھ گئی۔ سنہ ۱۸۰۶ م میں اس نے اپنی ایک وفادار خادمہ سے نکاح کر لیا اور خارجی دنیا سے قریب قریب قطع تعلق کر کے اپنی تخیل اور تفکر کی دنیا میں' جو ظاہر میں محدود مگر باطن میں کل کائنات سے زیادہ وسیع ہے محو ہو گیا —

مگر یہ نہ سمجھ لینا چاہئیے کہ 'گوئٹے' کی ادبی اور علمی جد و جہد ختم ہو گئی۔ اس نے اپنی نصف صدی کی زندگی میں تجربے اور مشاہدے کا اتنا بڑا خزانہ جمع کر لیا تھا اور تندھی اور محنت کی ایسی پختہ عادت ڈال لی تھی کہ اس کی عمر کے بقیہ چھبیس برس میں تصنیف و تالیف کا مشغلہ بدستور جاری رہا —

'گوئٹے' کی عمر کا یہ آخری دور غالباً انسانی زندگی کے مبصر اور ادبی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اس میں ہمیں ایک بھرپور شخصیت کی تصویر نظر آتی ہے جو زندگی کے متعدد نشیب و فراز دیکھ چکا ہے' جو اپنی فطری بیچینی' اپنی بے قید قوت تخلیق' اپنی بے روک جذبات پرستی

کو ضبط و انضباط، اصول و قواعد، عقیدے اور نصب العین کے قابو میں لا چکا ہے، اپنے ملک کے ادب کے رومانی جوش و خروش کو کلاسیکی ترتیب وہم آہنگی کے سانچے میں ڈھال چکا ہے ۔ اپنی قوم کے مزاج کی وحشت اور شورش کو تنظیم اور تہذیب کی راہ دکھا چکا ہے اور اب سکون و اطمینان سے بیٹھ کر اپنے کام پر نظر ثانی کر رہا ہے ۔ وہ اپنے گھر سے باہر بہت کم نکلتا ہے لیکن اس کا گھر اہل علم و ادب کا مرجع ہے ۔ لوگ آتے ہیں اور اس کے فیض صحبت سے اس کی حکمت و بصیرت سے مالا مال ہو کر جاتے ہیں ۔ سارے جرمنی بلکہ سارے یورپ کی ادبی نشو و نما اس کے پیش نظر رہتی ہے ۔ وہ حکیمانہ تنقید اور بزرگانہ مشوروں سے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی کوششوں کو صحیح راہ پر لگاتا رہتا ہے ۔ وہ دیکھتا ہے کہ رومانی تحریک جسے وہ دبا چکا تھا اب پھر نئی نسل میں ابھر رہی ہے مگر وہ اس سے خفا نہیں ۔ وہ جانتا ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے شباب کا گرم خون " طوفان و ہیجان " کی رو اٹھاتا رہے گا ۔ مگر اسے یہ بھی یقین ہے کہ نوجوانی کے زمانے کی یہ تندیاں جو بعد کو اندرونی ضبط و انضباط کی تہذیب کی مدد پہنچاتی اسی طرح دوسرے تجربے نہ کریں گے اور انہیں اس میں خود اس کے تجربوں سے بڑی مدد ملے گی ۔ رومانیت کی دیوانگی جانے سے وہ اتنا مطمئن ہے کہ اس دور میں کبھی کبھی خود بھی یہ درد مول لیتا ہے اور اس کے سوز و ساز کا لطف اٹھاتا ہے ۔

" گوئٹے " کی متعدد بہترین تصانیف اسی دور میں لکھی گئیں یا شائع ہوئیں ۔ سنہ ۱۸۰۸ ع میں اس نے " فاوسٹ " کا پہلا حصہ شائع کیا ۔ اس کے کچھ سال بعد اس نے " مشرقی مغربی " دیوان لکھا ۔ یہ اس کی متعدد غنائی نظموں کا مجموعہ ہے جو اس نے ایرانی شعرا خصوصاً " حافظ " کے کلام سے متاثر ہو کر لکھا ہے ۔ اسی کے جواب میں علامۂ اقبال نے " پیام مشرق " لکھا ہے ۔ اس کتاب نے جرمنی کے شاعرانہ حلقوں میں ایک ہل چل ڈال دی ۔ اس کی تقلید میں رومانی شاعروں نے

متعدد کتابیں لکھیں اور مشرقی ادب ایک مستقل شعبہ بن گیا --

اب ' گوئٹے ' نے پھر نثر کی طرف توجہ کی۔ " انتخابی رشتے " جو اصول کے فن کے لحاظ سے اُس کا سب سے مکمل ناول ہے اسی عہد کی تصنیف ہے - یہ عورت اور مرد کے عشق کا نفسیاتی مطالعہ ہے - ایک میاں بیوی کا جوڑا جن کی طبیعتوں میں باہم مناسبت نہیں ہے احساس فرض کے سبب سے کچھ دن ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرتا ہے مگر آخر میں میاں اپنی ایک عزیز لڑکی پر اور بیوی میاں کے ایک دوست پر عاشق ہوجاتی ہے - پاس آبرو اور اخلاقی قانون انہیں زنجیروں میں جکڑ کر رکھتا ہے اور اُن کی زندگی کو برباد کردیتا ہے -- اس میں ' گوئٹے ' نے سماج کو انفرادی روح کی فریاد سنائی ہے لیکن اخلاقی قانون کی زور شور سے حمایت کی ہے - اس کا مقابلہ " ویرتھر " سے کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب ' گوئٹے ' کا عقیدۂ زندگی کتنا بدل چکا تھا --

اس کے بعد ' گوئٹے نے ' ولہیلم مائسٹر ' کا دوسرا حصہ " ولہیلم مائسٹر کا زمانہ سیاحی " کے نام سے لکھا ہے-- اس میں اُس نے دکھایا ہے کہ ایک شخص جو جوانی میں " طوفانی حوادث " کے " مکتب " میں تعلیم حاصل کرچکا ہے کیوں کر زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے اور اپنی قوم کی تنظیم کرنے کی کوشش کرتا ہے -- ' فاؤسٹ ' کے دوسرے حصے کی طرح یہ بھی ' گوئٹے ' کے فلسفۂ حیات کا دستور العمل ہے - تعلیم کے متعلق جو گہرے خیالات اس میں ظاہر کئے گئے ہیں وہ آج تک معلموں کے لئے سبق آموز ہیں --

جب ' گوئٹے ' کی کتاب زندگی ختم ہونے کو آگئی تو اُسے اپنی سوانحعمری لکھنے کا خیال آیا - " شاعری اور حقیقت " کے نام سے اُس نے اپنے عہد شباب کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے - یہ صرف اس کی ابتدائی زندگی کی تصویر نہیں ہے بلکہ " طوفانی و ہیجان " کی ادبی تحریک کا مرقع ہے - افسوس ہے کہ اسے اس کتاب کے ختم کرنے کا موقع نہیں ملا ورنہ ہمارے سامنے گوئٹے کی پوری زندگی کی

کہانی خود اس کی زبانی موجود ہوتی۔۔

گوئٹے کی آخری تصنیف 'فاؤسٹ' کا دوسرا حصہ تھا۔ اسے اس نے سنہ ۱۸۳۱ء میں ختم کیا اور دوسرے سال ۸۳ برس کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ یہی 'فاؤسٹ' جس کی تکمیل میں اس نے اپنی پوری عمر صرف کردی ہماری بحث کا اصلی موضوع ہے۔ اس لئے ہم آیندہ بابوں میں اس کا ماخذ بتائیں گے، اس کی تدریجی نشو و نما دکھائیں گے، اس میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے اسے اپنے الفاظ میں سنائیں گے اور آخر میں اس ڈرامے پر مفصل تبصرہ کریں گے۔۔

باب سوم

فاؤسٹ کا ماخذ

عہد قدیم میں انسان کا ذہن مشاہدے اور تخیل میں امتیاز نہیں کرتا تھا۔ اسے نظام کائنات کو سمجھنے کا شوق تھا مگر فطرت کی ظاہری قوتوں کا اتنا بھی علم حاصل نہ تھا کہ علت و معلول کے سلسلے کی کڑی سے کڑی ملادے۔ اس لئے جہاں ضرورت ہوتی تھی وہ پوشیدہ قوتوں کے تصور سے کام لیتا تھا۔ اسی تصور پر جادو کا عقیدہ مبنی ہے۔ جو حکما علوم فطرت کی تحقیق میں مصروف رہتے تھے وہ خود سحر کے قائل ہوں یا نہ ہوں عوام ان سب کو ساحر ہی سمجھتے تھے۔ عیسائیت نے ان قوتوں کو جو جادو کا مبداء سمجھی جاتی تھیں بجائے دیوتاؤں کے شیاطین قرار دیا۔ قرون وسطیٰ کے عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ ساحر شیطان کے مرید ہوتے ہیں لیکن کلیسا جو شیطان سے زیادہ قوی ہے انہیں اس کے پنجے سے چھڑا سکتا ہے۔ چنانچہ بہت سی جادوگروں کی کہانیاں مشہور تھیں جن کی روحوں کو روحانی پیشواؤں نے شیطان سے چھین کر مسیح کے حلقے میں داخل کیا۔ سولہویں صدی میں جب تجدید مذہب نے پوپ اور کلیسا کا پردہ چاک کردیا اور لوگوں کو پادریوں کی مافوق الفطرت قوتوں پر اعتماد نہ رہا تو ساحروں کی کہانیوں کا رنگ

بھی بدل گیا - اس زمانے کی کہانیوں میں جو ساحر شیطان کے ہاتھ اپنی روح بیچتا ہے اس کو کوئی نجات نہیں دلاتا اور جب وہ مرتا ہے تو شیطان اس کی روح کو اپنی جہنم کی سلطنت میں بھیج دیتا ہے —

اسی قسم کی کہانیوں میں سے 'فاؤسٹ' کا افسانہ ہے - اس کی تاریخی اصلیت اتنی ہے کہ 'جان فاؤسٹ' نامی ایک شخص مشہور عالم 'میلانکتون' کا ہم عصر اور ہم وطن تھا - اس کا پتہ چلتا ہے کہ وہ سنہ ۱۵۱۶ ع سے ۱۵۲۵ تک 'ماؤل برون' میں وہاں کے اسقف کے ساتھ رہا اور اس کے بعد 'وٹنبرگ' میں آیا - یہاں اس نے اپنے آپ کو ساحر مشہور کیا اور اس کا دعویٰ تھا کہ جرمنی کے شاہنشاہ کو اسی کے جادو کی بدولت اطالیہ میں شکست ہوئی - 'میلانکتون' نے اسے ان حرکتوں پر لعنت ملامت کی اور وہ گرفتاری کے خوف سے وہاں سے بھاگا اور عرصے تک مارا مارا پھرنے کے بعد 'ورٹمبرگ' کے کسی گاؤں میں مرگیا

'سولھویں صدی' کے نصف آخر میں لوگوں نے رنگ آمیزی کرتے کرتے اس کی زندگی کے حالات کو ایک عجیب و غریب افسانہ بنادیا تھا - سنہ ۱۵۵۷ ع میں 'فرانکفورٹ' میں ایک قصہ Faustbuch (کتاب فاؤسٹ) کے نام سے شائع ہوا تھا - یہی اصل میں 'گوئٹے' کے ڈرامے کا ماخذ ہے -

اس قصے کا ہیرو ایک کسان کا لڑکا 'جان فاوسٹ' ہے - وہ جوانی میں 'وٹنبرگ' میں تعلیم حاصل کرتا ہے اور اپنے ساتھیوں پر سبقت لے جاتا ہے - اسے علوم ممنوعہ کے حاصل کرنے کا شوق ہے' وہ سحر و فیر نجات کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے اور بائبل کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے - " وہ عقاب کے پر لگا کر آسمان کے چپے چپے کی سیر کرنا چاہتا تھا " - وہ شیطان کے ہاتھ اپنی روح اس شرط پر بیچتا ہے کہ اس پر تمام پوشیدہ راز منکشف ہوجائیں اور تمام باطنی قوتیں اسے مل جائیں - 'فاؤسٹ' آٹھ برس وٹنبرگ میں رہتا ہے اور اس کے بعد شیطان کے ساتھ 'قسطنطنیہ' اور روما کی سیر کرتا ہے - وٹنبرگ میں طالب علموں کی ایک دعوت میں وہ

قدیم یونان کی مشہور حسینہ ہیلن کی روح کو بلاتا ہے۔ وہ اس روح سے شادی کر لیتا ہے اور اس کے بطن سے اس کا ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ جب اس کے اور شیطان کے معاہدے کی میعاد ختم ہوتی ہے تو فاؤسٹ اپنے کئے پر پچھتاتا ہے اور شیطان جسے اپنی جیت کا یقین ہے اس سے یوں کھیلتا ہے جیسے بلی چوہے سے۔ اپنی زندگی کا آخری دن وہ اپنے دوستوں کے ساتھ وٹنبرگ میں بسر کرتا ہے یہاں ابر و باد کے تند و تیز طوفان میں وہ ایڑیاں رگڑ کر جان دیتا ہے اور اپنی روح شیطان کے حوالے کرتا ہے۔

سنہ ۱۵۹۰ء میں اس کتاب کا جرمن سے انگریزی میں ترجمہ ہوا تھوڑے ہی دن بعد مارلو نے اس قصے کو ڈراما کے طرز پر لکھ کر شائع کیا انگلستان میں یہ ڈراما بہت مقبول ہوا اور وہاں سے تھیٹر کی کمپنیاں جو بر اعظم کا دورہ کیا کرتی تھیں اسے جرمنی لائیں۔ جرمنی کی اسٹیج پر ان دنوں فرانسیسی کمپنیوں کا قبضہ تھا۔ یہ قصہ وہاں بہت دن تک کٹھ پتلی کے تماشے میں دکھایا جاتا تھا —

اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں لیسنگ کے حسن کی بدولت جرمن ادب میں نئی روح پیدا ہوئی جرمن اسٹیج کو بھی فرانسیسی اثر سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس نے متعدد اور بےمثل ڈرامے لکھے اور اسی سلسلے میں فاؤسٹ کے قصے کو بھی ڈراما کی صورت میں لانا چاہا۔ لیکن ایک سین سے زیادہ نہ لکھ پایا —

غرض فاؤسٹ کا قصہ جرمنوں کے قومی تخیل کا عکس تھا۔ اور صدیوں سے خاص و عام میں مقبول تھا۔ لوگ اسے "کتاب فاؤسٹ" میں پڑھتے تھے کٹھ پتلی کے تماشے میں دیکھتے تھے اور کہانی کی طرح سنتے تھے —

باقر آگاہ

(ان کی حیات، تصنیفات اور دیوان)

از

(جناب محمد عبدالقادر سروری صاحب ایم۔ اے۔ ال، ال، بی)

اٹھارھویں صدی عیسوی کا آخری زمانہ بھی ھندوستان کے لئے عجیب پر آشوب تھا۔ ایک طرف تو مغربی اقوام سواحل پر اپنی قوت کا استحکام کرکے اندرون ملک کی طرف بڑھنے لگی تھیں اور ھندوستان کی طوائف الملوکی سے جرأت پاکر ان کی تجارتی جماعتوں کو حکومت میں دخل در معقول کرنے کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ اس غرض کے حصول کے لئے ان کی سربرآوردہ قوتوں کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی۔ اگرچہ سیاسی فضا میں ایسی افرا تفری مچی ہوئی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ شمالی ھندوستان میں میر تقی میر، خواجہ میر درد اور مرزا رفیع سودا کی شیوہ بیانیوں سے اہل زبان متاثر ہورہے تھے اور اردو شاعری کی بنیادیں مضبوط ہورہی تھیں۔ ٹھیک اسی زمانے میں دکن بھی، باوجود اس سیاسی ہلچل کے اپنی علمی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ چنانچہ صوبۂ مدراس کے قصبہ ایلور سے ایک بزرگ ظاہری اور باطنی علوم و فنون کا مرکز بن کر اپنی زندگی ہی میں اپنے کردار اور افعال سے معاصرین کو متاثر کرتے ہیں اور مرنے کے بعد اپنے اقوال اور

مقالات کا کافی ذخیرہ عربی، فارسی اور اردو میں چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ حضرت مولانا محمد باقر آگاہ، شافعی قادری ایلوری ہیں اور مدراس کے بڑے محقق عالم اور کثیرالتعداد تصنیفات کے مصنف ہیں —

جیسا ہم نے اوپر بیان کیا ہے حضرت آگاہ• مدراس کے ایک صوبہ ایلور میں تولد ہوئے تھے۔ آپ کی پیدائش کا سال سنہ ۱۱۵۸ ھ ہے۔ آگاہ کے والد کا نام محمد مرتضی تھا اور محمود صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ محمد مرتضی کے اسلاف دراصل بیجاپور کے رہنے والے تھے۔ خود محمد مرتضی آگاہ کی ولادت سے پہلے ایلور چلے آئے تھے جہاں آگاہ پیدا ہوئے —

آگاہ بچپن ہی سے بہت ذہین تھے اور حافظہ بھی قوی تھا۔ چنانچہ سات سال کی عمر میں انہوں نے قرآن مجید ختم کیا ابتدائی تعلیم والد سے گھر ہی میں

• حضرت محمد باقر آگاہ کے حالات کا سب سے پہلا اور مستند ماخذ تذکرہ گلزار اعظم ہے۔ اس کے مصنف والا جاہی خاندان کے سب سے آخری صوبہ دار کرناٹک نواب محمد غوث خان بہادر اعظم جاہ والا جاہ خامس عمدة الامرا منتظم الملک عظیم الدولہ شہامت جنگ ہیں۔ جو نواب سلور خان بہادر اعظم جاہ کے بیٹے اور بانی خاندان والا جاہی نواب محمد علی والا جاہ کی پانچویں پشت میں پوتے ہوتے ہیں۔ ان کی ولادت سنہ ۱۲۳۹ (۱۸۲۰ ع) کو ہوئی۔ نواب اعظم جاہ کے انتقال کے وقت یہ تین سال کے تھے اور اسی وقت (۱۲۴۲ ھ ۱۸۲۵ ع) کو تخت پر بٹھائے گئے۔ ان کے چچا نواب عظیم جاہ بہادر ان کے نائب مقرر ہوئے۔ محمد علی والا جاہ کی طرح یہ بھی علم دوست اور علما کے سرپرست تھے۔ سنہ ۱۲۵۷ ھ سے تذکرہ نویسی کے کام کو شروع کیا تھا جو غالباً سنہ ۱۲۷۲ ھ کے کچھ پہلے ختم ہوا۔ اور اسی سال صوبۂ کرناٹک کے سرکاری مطبع میں چھپ کر "گلزار اعظم" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی وفات بھی سنہ ۱۲۷۲ ھ میں ہوئی (ملاحظہ ہو "تذکرہ گلزار اعظم" صفحہ ۷۲)

مولوی محمد مرتضی صاحب سابق سکریٹری حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی اسی تذکرہ سے آگاہ کے حالات جمع کرکے ایک کتاب کی صورت میں شائع کئے ہیں

ہوئی - لیکن بعد میں حضرت سید ابوالحسن قربی ٭ کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے بھیج دیے گئے - یہیں آگاہ نے وہ فیض حاصل کیا جو آئندہ زندگی میں عمر بھر ان کی رہبری کرتا رہا - آگاہ کو اپنے استاد سے بہت محبت تھی اور ان کا بے حد احترام کرتے تھےاور اس احترام میں آخر وقت تک کوئی فرق نہیں آیا - اس کا ثبوت "آگاہ" کی تصنیفات میں جا بجا ملتا ہے چنانچہ دیوان ھی کے دیباچہ میں لکھتے ھیں -

حضرت مرشد اس حقیر کے جناب سید ابوالحسن قادری قربی قدس اللہ سرہ اس کی جوز میں ایک ہرھلی اور ایک دوسندی کہے† —

حضرت ابوالحسن قربی ایلورھی کے رہنے والے تھے اور فارسی و عربی کے متبحر عالم ہونے کے علاوہ ھندی (اردو) کے بھی اچھے شاعر تھے - ان کا اردو کلام دستیاب تو نہیں ھوسکا ، تاھم آگاہ نے ان کی ایک " دوسلی " کی یہ بیت اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھی ہے —

میں پیو میں اپس کو فنا کروں   میں   مر نے   کے   آگیج   مری

غزلوں میں ایک جگہ اس مصرع کی تضمین اس طرح کی ھے ‡ :—

بقول حضرت قربی اب آگاہ   کسو کا عشق میں پروا نہ کرنا

(ورق ۱۹۷ ا)

اس سے معلوم ھوتا ھے کہ جب وہ اس قسم کی کٹھن اصناف شاعری میں طبع

٭ حضرت قربی سنہ ۱۱۱۷ھ میں بیجاپور میں پیدا ہوے - چار سال کی عمر میں والد کے ساتھ شہر چھوڑ کے ایلور میں آرھے- سنہ ۱۱۸۲ھ میں ان کا انتقال ھوا-فارسی کے بڑے متبحر عالم اور عربی' فارسی اور ھندی کے اچھے شاعر تھے(گلزاراعظم صفحہ ۲۸۵ تا ۲۸۸)ح

† دیباچہ دیوان آگاہ (قلمی) ورق ۵ ب —

‡ ملاحظہ ہو تذکرہ گلزار اعظم مطبوعہ سنہ ۱۱۷۲ھ صفحہ ۸ (مطبع سرکاری کرناٹک)

آزمائی کرتے تھے تو یقین ہے کہ غزل اور مثنوی بھی ضرور لکھی ہوگی کیونکہ پھر اس زمانے کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز اصناف تھے۔ فارسی میں بھی ان کے اشعار موجود ہیں —

استاد کے اس ذوق سخن نے شاگرد رشید کی موزوں طبیعت پر خاصا اثر ہوا اور شاعرانہ معانی کو ہموار کرنے میں بڑی مدد دی —

حضرت قربی کے پاس تحصیل علم کرنے کے بعد بھی آگاہ کی علمی پیاس پوری طرح نہیں بجھی۔ اس لئے وہ شہر کو چھوڑ کر طلب علم میں ترچناپلی پہنچتے ہیں۔ ترچناپلی کو اس زمانے میں نتھر نگر کہا کرتے تھے۔ یہاں مولوی ولی اللہ نامی ایک عالم تھے جن سے آگاہ نے کچھ عرصہ کے لئے علوم کی تحصیل کی اور انہیں کے مشورے سے کتابوں کا مطالعہ جاری رکھا۔ تھوڑی مدت یہاں اس طرح گذارنے کے بعد غالباً سنہ ۱۱۰۵ ھ کے قریب اپنے وطن ایلور کو واپس ہوئے یہاں اپنے قدیم استاد حضرت قربی کی خدمت میں آ رہے اور ان کے انتقال تک جدا نہیں ہوئے —

آگاہ نے پندرھویں سال سے شعر کہنا شروع کیا۔ چنانچہ اپنی ایک تصنیف " ریاض الجنان " کے دیباچہ میں لکھتے ہیں —

" یہ عاصی پندرھویں سال سے شعر کے ساتھ الفت و ارتباط رکھتا ہے * " —

ابتدا میں کوئی تخلص اختیار نہیں کیا تھا۔ " رسائل ہشت بہشت " میں جو سنہ ۱۱۸۴ اور سنہ ۱۱۸۵ ھ کے درمیان لکھے گئے اور جس وقت ان کی عمر ستائیس سال کی تھی، پہلے پہل " باقر " تخلص اختیار کیا۔ اور اس کے دس سال بعد سنہ ۱۱۹۴ ھ میں جب عربی دیوان لکھنا شروع کیا تو آگاہ تخلص کیا۔ گویا اس طرح

---

* مخطوطہ " ریاض الجنان " ۔ ورق ۶ ب (کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ نمبر ۲ ص ۱۰) (فہرست مخطوطات زیر طبع) —

مہتاب" تمام دکھنی مثنویوں میں اور "آگاہ" اردو غزلوں اور فارسی اور عربی نظموں کے لئے مخصوص کر لیا گیا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے آگاہ نے فارسی شاعری بھی شروع کردی تھی۔ چنانچہ "گلزار اعظم" کے مصنف لکھتے ہیں کہ اٹھارہ سال کی عمر میں استاد کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر گذرانا تھا جس کا مطلع یہ ہے —

آفتاب برج وحدت مہتاب برج دین   کاشف اسرار قربت صاحب عین الیقین

استاد نے شاگرد کے خلوص اور احترام کے جذبات سے زیادہ اس گوہر قابل کی جودت طبع کی تعریف فرمائی اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اس میں بعض چیزیں اصلاح کی محتاج ہیں جو بالمشافہ دکھائی جا سکتی تھیں • —

غالباً انیسواں سال (سنہ۱۱۷۹ یا ۸۰) تھا جب آگاہ ترچنا پلی سے گھر واپس ہوئے کیونکہ تیرھویں سال تک تو وہ حضرت قربیؔ سے دور تھے اور وہیں سے قصیدہ † اُستاد کی مدح میں لکھ کر روانہ کیا تھا اور پھر واپسی کے ساتھ ہی فوراً حضرت قربی کی خدمت میں جا پہنچے۔ اس لحاظ سے وہ اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے ایلور واپس نہیں ہوسکتے۔ اور چونکہ واپسی کی صحیح تاریخ معلوم نہیں اس لئے یہ اٹھارہ سال سے بعد اور قریب ہی کوئی تاریخ ہوسکتی ہے۔

اس مرتبہ حضرت قربی سے نہ صرف علمی تعلق رہا بلکہ روحانی رشتہ بھی قائم ہوگیا۔ کیونکہ آگاہ نے قربی کے ہاتھ پر بیعت بھی کرلی تھی۔

نظم میں آگاہ قربی ہی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اس کا ذکر جگہ جگہ دلچسپ طرح پر کیا ہے۔ ایک فارسی شعر میں کہتے ہیں —

بوہ ہر بیعت می آئینہ دار دیدہ آگاہ   کہ بر وجہ حسن کسب سخن از بوالحسن کردم

• مخطوطہ " ریاض الجنان" ورق ۷ الف (کتب خانۂ کلیہ جامعہ عثمانیہ ۱پ-۱۰)-

† یہ قصیدہ قیام ترچناپلی کے زمانے میں لکھ کر بھیجا گیا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت قربی نے اصلاح کے لئے آگاہ کا موجود ہونا ضروری سمجھا۔ آگاہ اٹھارہویں سال سے پہلے ویلور واپس نہیں ہوئے —

اُردو دیوان میں بھی اس طرح کئی اشعار میں اشارہ کیا ہے - ذیل کا شعر ملاحظہ ہو -

جام جہاں نما ہے نظم دقیق آگاہ   صاف اس کو کردیا ہے صیقل ابوالحسن کا ●

ویلور میں آگاہ کا قیام حضرت قریشی کے انتقال تک رہا - اس کے بعد وہ پھر "شہر مکہ" ترچناپلی چلے گئے - اس دفعہ ترچناپلی جانے کا سنہ بھی معلوم نہیں - کہ ان کی تمام تصنیفات دستیاب ہو جائیں تو ان کے بالاستیعاب مطالعے سے اس کا پتہ چل سکتا ہے - بہر حال آگاہ نے ترچناپلی ہی میں مستقل بود و باش اختیار کرلی - اس وقت تک آگاہ کے علم و فضل کی سارے ملک میں کافی شہرت ہوچکی تھی - چنانچہ اسی شہرت کی بنا پر نواب محمد علی والا جاہ بہادر نے مولانا کو اپنے دربار میں تشریف لانے کی دعوت دی --

محمد علی والا جاہ بہادر اس وقت کرناٹک کے حکمراں تھے اور جس طرح ہمارے مضمون میں بتایا جا چکا ہے ان کی حکومت کے دوران میں ہندوستان ایک عجیب انقلابی حالت میں تھا - غیر قومیں خصوصاً انگریز اور فرانسیسی تجارتی کمپنیاں ایک دوسرے پر برتری حاصل کرتے اور اپنے سوا دوسروں کو ہندوستان سے باہر نکال پھینکنے کی فکر میں تھیں - ان کے قدم بھی یہاں جمنے لگے تھے جس کی بڑی وجہ ہندوستانی حکمرانوں کا آپس کا اختلاف اور خانہ جنگی تھی --

کرناٹک کا صوبہ جو در حقیقت مدراس کے بڑے حصے پر مشتمل تھا، نواب نظام الملک بہادر کی سلطنت کا ایک جز اور نواب صاحب کی طرف سے ایک گورنر کے ماتحت تھا - سنہ ۱۷۴۳ ع میں کرناٹک کے پہلے گورنر حکمراں کا آخری سلسلہ صفدر علی والی صوبہ کے مارے جانے پر ختم ہو گیا - اس کے بعد نواب نظام الملک

● مخطوطہ دیوان اُردو ورق ۹۶ (الف) --

بہادر کی جانب سے انورالدین خاں یہاں کے گورنر بنا کر بھیجے گئے (سنہ ۱۷۴۳ ع)* ۱۱۵۰ ھ - آمبور کی لڑائی میں انورالدین خاں بھی ہلاک ہو گئے-ان کے فرزند نواب محمد علی نے ترچناپلی (تھرنگر) میں پناہ لی اور انگریزوں کی مدد سے بڑی جان توڑ کوشش کے بعد تخت حاصل کیا - لیکن آخری وقت تک برابر فرانسیسیوں کے خلاف انگریزوں نے ان کو آلۂ کار بنا کر جنگوں میں مصروف رکھا † —

---

* ملاحظہ ہو برٹش انڈیا " مصنفہ آر ڈبلیو فریزر (فرانسیسی اڈیشن) صفحہ ۷۴ تا ۹۹ —

† انورالدین خاں بہادر سے لے کر (سنہ ۱۷۴۳ ع ۱۱۵۰ ھ) نواب محمد غوث خاں بہادر تک یعنی (سنہ ۱۲۷۲ ھ ۱۸۶۴ ع) تک اسی خاندان کے کل چھ حکمراں ہوے جن کا شجرۂ نسب یہ ہے —

انورالدین خاں (سنہ ۱۱۵۰ ھ - ۱۱۵۶ ھ)

محمد علی والا جاہ سنہ ۱۱۵۶ ھ - سنہ ۱۲۱۰ ھ)

علی حسین خاں عمدۃ الامرا (سنہ ۱۲۱۰ - سنہ ۱۲۱۶ ھ)

امیرالامرا (انتقال سنہ ۱۲۰۴ھ) باپ کے سامنے

عبدالعلی عظیم الدولہ (سنہ ۱۲۱۶ - سنہ ۱۲۴۴ ھ)

منور علی اعظم جاہ (سنہ ۱۲۴۴ تا ۱۲۶۱ ھ)

عظیم جاہ سفیدالاولہ (علیم)

محمد غوث خاں (سنہ ۱۲۶۱ تا سنہ ۱۲۷۲ ھ)

مصنف تذکرہ گلزار اعظم

اگرچہ محمد علی ان پریشانیوں میں مبتلا تھے مگر انہوں نے علم و فضل کی ہمیشہ اور ہر حال میں سرپرستی کی۔ عالموں اور فاضلوں کی صحبت سے نواب صاحب کو بڑی دلچسپی تھی، فرصت کا بیشتر وقت وہ انہیں مشاغل میں گزارنا چاہتے تھے جب آگاہ کی شہرت ان کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے نہایت اعتقاد اور احترام کے ساتھ ان کو اپنے پاس بلا لیا —

یہاں نواب کے دونوں فرزندوں نواب امیر الامرا اور نواب عمدۃ الامرا (علی حسین خاں بہادر) کی اتالیقی کی خدمت آگاہ کے تفویض ہوئی۔ اور دوسو روپیہ ماہوار۔ چند دنوں بعد نواب نے التور کی جاگیر بھی عطا کی جس کی آمدنی ایک ہزار دوسو ہون سالانہ تھی۔ اس خدمت سے متعلق ہو جانے کے بعد آگاہ نے کرناٹک ہی کو اپنا مستقر بنایا اور مرتے دم تک یہیں رہے —

یہ زمانہ آگاہ کے لئے بے حد فرصت اور آرام کا تھا چنانچہ ان کی تصنیفات کا بیشتر حصہ اسی وقت تکمیل کو پہنچا —

آخری دنوں میں آگاہ کی قابلیت نے نواب صاحب کی نظروں میں بڑی وقعت پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ دبیری (معتمدی) کا عہدہ بھی انہیں کو عطا ہوا۔ نواب صاحب کی تمام مراسلت خصوصاً جو اہل حجاز کے ساتھ ہوتی انہیں کے ذریعے کی جاتی۔ پہلا نامہ جو آگاہ نے لکھا اس کی بڑی تعریف حجاز سے نواب صاحب کے پاس وصول ہوئی جس کے صلے میں نواب نے ایک زریں گہوارہ تیار کروا کر اپنے دونوں فرزند نواب عمدۃ الامرا اور نواب امیر الامرا کے ساتھ آگاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ اور حکم دیا کہ یہ دونوں استاد کو اس میں بیٹھا کر جھلائیں۔ آگاہ نے بڑی رد و کد کے بعد اس صلے کو تو قبول کر لیا، لیکن ان کی عقل سلیم نے اس کو گوارا نہیں کیا کہ اس میں بیٹھ کر جھولیں —

آگاہ کا انتقال چودھویں ذیحجہ سنہ ۱۲۲۰ ھ شب پنجشنبہ کو ہوا۔ میلاپور میں ان کی زرخرید اراضی تھی، یہیں مدفون ہوئے۔ شرف الملک کرناٹک کے

مدارالمہام * نے جن کو آگاہ سے خاص تعلق تھا ' سنہ وفات " قدمات فرۃالعصر "
سے نکالا ہے —

(۲) تصنیفات

آگاہ بڑے متبحر عالم اور عربی اور فارسی اور اُردو تینوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے ۔ ان تینوں زبانوں میں ان کی تصنیفات موجود ہیں۔ ان زبانوں میں شعر بھی کہتے تھے۔ " احسن النبہٗین " (تصنیف آگاہ) میں لکھا ہے کہ ان کی مجموعی تعداد تین سو تین (۳۰۳) ہے † ۔ اُردو میں تو ان کی نظم و نثر کی بیس کے قریب کتابیں موجود ہیں ۔ عربی شاعری کے نمونے بھی اُردو دیوان سے کچھ مل جاتے ہیں ۔ لیکن خود آگاہ نے عربی میں ایک دیوانؔ کے مرتب کرنے کا حال بیان کیا ہے چنانچہ مخطوطۂ " ریاض الجنان " کے نثری دیباچہ میں لکھتے ہیں —

" بیچ سنہ یک ہزار و یکسو نود اور چہار کی وقت نظم کرنے دیوان عربی

---

* یہ مولوی محمد غوث شرف الملک ہیں ۔ جو نواب امیرالامرا بن نواب والاجاہ محمد علی کی رفاقت میں رہتے اور بعد میں ان کے فرزند عظیم الدولہ کے اتالیق مقرر ہوئے ۔ والد کی وفات کے بعد عدالت کے " داروغہ " (منفذ احکام شریعت) بنے ۔ عمدۃالامرا کی مخلوں مزاجی سے ناراض ہوکر خدمت سے استعفا دے دیا اور سنہ ۱۲۱۳ ھ میں سوجوث ہوتے ہوئے حیدرآباد پہونچے ۔ یہاں سے سید عبدالقادر جاگیر دار (اودگیر) کے پاس حاضر رہے (سنہ ۱۲۱۵ ھ) ۔ ایک سال بعد عظیم الدولہ نے انہیں مدراس طلب کر کے یک سو تیس کے مشاہرے پر مدارالمہامی کا عہدہ ان کے تفویض کیا ۔ سنہ ۱۲۱۹ ھ میں شرف الدولہ شرف الملک کا خطاب اور سنہ ۱۲۲۰ ھ میں مسند علایت کی۔ سنہ ۱۲۳۳ ھ کو پھر خدمت سے مستعفی ہوگئے اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ سنہ ۱۲۳۸ ھ میں انتقال ہوا —

ان کی تصنیفات کل ۳۱ بتلائی گئی ہیں' جن میں سے عربی کی اٹھائیس ' فارسی کی دو اور ہندی کی ایک (موسومہ رسالہ فقہ مذہب حنفی) (ان کے حالات مخطوطۂ تاریخ احمدی ' مولفہ احمد بن صبغۃاللہ ابن شرف الملک سے لئے گئے ہیں) ۔

† ملاحظہ ہو دیباچہ خیر المبین ترجمہ احسن الامکون تصنیف باقر آگاہ ۔ مطبوعہ مفید دکن حیدرآباد دکن سنہ ۱۳۱۱ ھ — صفحہ ۳ ۔

کے تخلص اپنا آگاہ مقرر کیا اس تخلص کو اشعار عربی و فارسی میں لایا اور اکثر موالی اور ریختوں میں بھی اس تخلص کو اختیار کیا *" —

صاحب " گلزار اعظم نے بھی " آگاہ کی عربی شاعری کا ذکر اپنے تذکرہ میں اس طرح کیا ہے " خود را تالیف و تصنیف فنون جداگانہ نظما و نثرا در زبان عربی و فارسی و ہندی مصروف گردانید۔ جملہ تصانیف او درالسنۂ ثلاثہ از روے حسب ابیات زیادہ از پنجاہ ہزار است۔ وہریکی از انہا مشتہر و برگزیدہ روزگار " (صفحہ ۱۰)‡

عربی اشعار کے غالباً دو دیوان تھے۔ مخطوطۂ " گلستانِ نسب " میں ان کے پہلے عربی دیوان کا نام " نفحۃ العنبریہ فی مدحۃ الخیر البریہ " بتلایا ہے۔ یہ دیوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح پر مشتمل ہے †۔ دوسرا دیوان نعت، منقبت، مدح، اور عربی غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں معاصرین میں سے اکثر مشہور لوگوں کی مدح بھی لکھی ہے۔ جن میں ایک میر غلام علی آزاد بھی ہیں۔ فارسی میں بھی ایک مختصر دیوان مگر بلند پایہ کلام پر مشتمل ہے۔ جس کا مخطوطہ مکتبۂ ابراہیمیہ (حیدرآباد دکن) میں دیکھا گیا۔ آگاہ نے فارسی، عربی اور اردو کے جملہ اشعار کی تعداد (۱۰۰۰) بتائی گئی ہے §۔ اور غالباً یہ اس باقی کلام کا حال ہے جو حضرت قربی کے انتقال کے بعد لکھا گیا تھا۔ اس سے پہلے کا جو کلام تھا وہ استاد اور مرشد کے انتقال کے بعد گوشہ نشینی کے خیال سے شاگرد نے انتہائی رنج و محن کی حالت میں " آشنائے آب § " کردیا تھا —

آگاہ کی اردو تصنیفات تیرہ تک معلوم ہوتی ہیں۔ جن کا ذکر آئندہ تفصیل

---

* مخطوطۂ " ریاض الجنان " کا دیباچہ ورق ۷ (کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ) ۲۵۱

† " گلستانِ نسب " مصنفۂ غلام عبدالقادر ناظر —

‡ " گلزار اعظم " صفحہ ۱۰ —

§ " گلزار اعظم " صفحہ ۹ —

، ساتھ آے گا - اس میں اکثر دینیات کے موضوع پر ھیں - غالباً آگاہ ان اولین اُردو مصنفین میں ھیں جنھوں نے اپنی تحریروں کا مخاطب صنف نازک کو بھی بنایا - بعض کتابیں جیسے " تحفۃالنسا " خاص عورتوں کے لئے لکھی گئی - لیکن عموماً ہر تصنیف میں وہ عورتوں کا لحاظ ضرور رکھتے تھے - فرائد در فوائد کے دیباچہ میں وہ اس کی طرف خود اشارہ کرتے ہوں —

" مضمون اس کا بہت عمدہ کتابوں سے لیا ھوں - اور داد ضبط و تحقیق کا دیا ھوں اُسیان اور عورات کے سمجھنے کے واسطے اُسے صاف اور سیدھا لکھا ھوں •" —

ان کی تصنیفات میں اکثر غیر مطبوعہ ھیں ، ذیل میں ان تمام کتابوں کی ایک اجمالی تفصیل پیش کی جاتی ہے جو آگاہ کی ھیں - یا ان سے منسوب کی گئی ھیں —

۱ - ھشت بہشت : یہ آنحضرت صلعم کی سیرت ہے جس کے آٹھ حصے ھیں - ان حصوں کی تفصیل یہ ھے : (۱) من دیپک - نور محمدی کے حالات میں (۲) من ھرن - ولادت با سعادت کے اشارات پر (۳) من سوھن - حالات ولادت میں (۴) جگ سوھن - زندگیء مبارک کے حالات پر مشتمل ھے (۵) آرام دل - اخلاق نبوی (۶) راحت جان - آنحضرت کے خصائل سے (۷) من درپن - اور (۸) من جیون میں معجزات بیان کئے گئے ھیں - اس کی ابتدا سنہ ۱۲۰۶ ھ‡

• مخطوطۂ " فرائد در فوائد " ورق الف - ب کتب خانۂ کلیۂ جامعہ عثمانیہ نمبر ۱۸ (فہرست زیر طبع) —

· اس کا ایک نا مکمل مخطوطہ کتب خانۂ کلیہ جامعہ عثمانیہ میں موجود ھے نمبر ۲ و ۴ - دوسرا مکمل مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی (حیدر آباد دکن) میں ھے (ملاحظہ ھو جلد دوم (سنہ ۱۳۳۳ ھ) صفحہ ۸۸۸ نمبر ۵۳ —

‡ ملاحظہ ھو مخطوطہ " ریاض الجنان " ورق ۷ - الف (کتب خانہ کلیہ) —

میں ہوئی اور اختتام سنہ ● میں ہوا —

٢ – مزائد در فوائد - میں قرآن مجید کے نزول، فضائل کا حال اور سورتوں کی تعداد، ان کے خصائل، ان کا جمع ہونا اور ان کے معنوں کی وسعت پر بحث کی گئی ہے - پوری کتاب ایک نثری دیباچہ کے علاوہ ستائیس فصلوں اور ایک فائدہ پر مشتمل ہے - یہ سنہ ١٢١٠ھ میں تمام ہوئی تھی † —

٣ - ریاض الجنان: یہ مثنوی اہلبیت کے مناقب میں ہے - ولی ویلوری اور شہدائے حیدر آبادی کے بعد مگر ان سے زیادہ مستند ذرائع سے مدد لے کر یہ کتاب لکھی گئی - اس کی تصنیف کا سال سنہ ١٢٠٧ھ ہے ‡ —

٤ - محبوب القلوب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے مناقب میں منظوم رسالہ ہے - ایک دیباچہ کے علاوہ گیارہ فصلوں پر منقسم ہے - دیباچے سے مصنف کی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے اس کی تصنیف کا سال خود مخطوطہ سے سنہ ١١٣٧ھ معلوم ہوتا ہے لیکن "ریاض الجنان" کے دیباچہ میں سنہ ١٢٧ھ لکھا ہوا ہے جو در حقیقت ایک ہزار ایک سو ستائیس ہے -

---

● ملاحظہ ہو مخطوطہ "ریاض الجنان" ورق ٧ - الف کتب خانہ کلیہ -

† اس کا مخطوطہ بھی کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ میں موجود ہے نمبر الف ا - مکتبہ ابراہیمیہ (حیدرآباد دکن) میں ایک مطبوعہ نسخہ موجود ہے - جو "مشمس بہمنی" کا دوسرا ایڈیشن ہے اور مطبع [illegible] میں سنہ ١٢٧٠ھ کو چھپا - یہ کتاب پہلی دفعہ سنہ ١٢٩٢ھ میں مطبع راج کشن میں چھپی تھی (سرورق نسخۂ مکتبہ) -

‡ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ میں موجود ہے نمبر ای ا -

§ یہ سن اختتام "ریاض" میں خود مصنف نے لکھا ہے (جب تھے بارہ سو اور سات برس - تب بنا ہے یہ نسخۂ اقدس)

اگر یہ آخری تاریخ صحیح ہو، اور کاتب کی غلطی سے بجائے ۳ کے ۲ نہ لکھ دیا گیا ہو تو غالباً یہ سنہ ۱۱۲۷ ھ میں شروع ہوا ہوگا اور دس سال بعد ختم ہوا ٭ —

۵ — ریاض السیر † —

۶ — تحفۃ النساء —

۷ — تحفۃ الاحباب فی مناقب الاصحاب —

۸ — روضۂ اسلام —

۹ — گلزار عشق ‡ —

۱۰ — قصہ رضوان شاہ —

۱۱ — روح افزا —

۱۲ — خمسہ متحیرہ —

۱۳ — مثنوی ادب سنگار —

۱۴ — دیوان ہندی § —

۱۵ — کرامات قادریہ —

۱۶ — استیناس رد الناس علی حدیث القرطاس —

۱۷ — دفع الشک فی الفدک —

۱۸ — سوز القرآن —

٭ کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ اور کتب خانہ آصفیہ میں بھی اس کا ایک ایک مخطوطہ موجود ہے ۔ پہلے کے لئے ملاحظہ ہو فہرست ۲ ی ۳ ۔ دوسرے کے لئے فہرست کتب خانہ آصفیہ جلد دوم صفحہ ۱۵۶۲ تا ۵۳ —

† ملاحظہ ہو فہرست کتب خانہ آصفیہ جلد دوم صفحہ ۹۸۹ ۔ نمبر ۲۵ مکتوبہ ۱۲۵۹ھ —

‡ دیباچہ مخطوطہ دیوان ہندی ورق ۳ ب —

§ ان کتابوں کے متعلق یہ معلوم ہے کہ اردو ہیں —

(۱۹) کحل الجواہر شرح جلاء البصائر فی نقض الاکل الناصر (یہ محمد محی الدین کے رسالہ "جلاء البصائر" کی شرح ہے) ●

(۲۰) احسن التبیین •

(۲۱) نفحۃ العبیر فی مدحۃ النبی البریہ عربی دیوان جو نعت نبوی پر مشتمل ہے) ‡

(۲۲) مجموعہ قصائد و غزلیات عربی قصائد اور غزلوں کا مجموعہ ہے ۔ §

(۲۳) دیوان فارسی ۔

(۲۴) نفحۃ الاحسن فی المناقب السیدابی الحسن ؟

(۲۵) سحر الحلال فی ذکر الہلال (فارسی)

(۲۶) مکتوبات آگاہ یعنی وہ عربی خطوط جو کرناٹک کے صوبہ دار نواب محمد علی والاجاہ کی خدمت دبیری کے زمانے میں آگاہ نے حجاز اور عرب کے اکثر سربرآوردہ لوگوں کے نام نواب صاحب کی طرف سے لکھے تھے —

(۲۷) شجرۂ طیبہ جنیدیہ قادریہ ‡

(۲۸) تنویر دربارۂ تقلید فارسی میں فقہ کا ایک رسالہ ہے ‖

● ‖ اور ‡ مخطوطہ اور • کی مطبوعہ کتاب محمد حمید اللہ صاحب بی ۔ اے (ملشابعہ) کے پاس دیکھی گئی —

• اس کا ترجمہ "خیر البیان" کے نام سے مولوی مستکھر صاحب نے کیا ۔ (مطبوعہ مفید عام پریس حیدرآباد دکن) اس کتاب کے ساتھ مترجم کا دیباچہ ہے جس سے بالو آگاہ کی چند کتابوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے —

‡ اس کا مخطوطہ مکتبہ ابراہیمیہ (حیدرآباد دکن) میں موجود ہے —

؟ ملاحظہ ہو تذکرہ "گلزار اعظم" صفحہ ۲۸۶

§ ملاحظہ ہو فہرست کتب خانہ آصفیہ جلد اول صفحہ ۵۱۴ – ۸۶۱

‖ " " " " صفحہ ۱۷۳۰ نمبر ۲۴/۲ (فن مجالس)

(۲۹) دفع وسواس الخناس العارض فی حدیث المیزاب و الفدک و القرطاس •

(۳۰) کشف الغطا - (فارسی زبان میں ' کلام پر ہے) †

(۳) دیوان ہندی

یہاں ہم ' آگاہ ' کے دیوان کے متعلق تفصیلی معلومات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ دیوان کے سرورق پر اور خود اشعار میں بھی کہیں کہیں " ہندی " ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ تا ہم یہ معلوم رہے کہ اس سے مراد ان شاعروں کی " اردو " ہوتی تھی۔کیوں کہ وہ اردو کو ہندی سے کوئی جدا چیز نہیں سمجھتے تھے۔اس بحث کی تفصیل آگے آئے گی —

یہ دیوان (۱۷۹ اوراق پر ختم ہوا ہے اور ہر صفحہ میں ۱۴ سطور ہیں۔ خط نستعلیق شکستہ ہے - عنوانات ' مقطع میں تخلص اور نیز کہیں کہیں کچھ شعر سرخی سے لکھے ہوئے ہیں - کاتب کا نام اور سنہ کتابت کہیں درج نہیں ہے - لیکن ورق الف ۔ب پر یہ عبارت درج ہے —

سفر قبلگاہ بمکہ مکرمہ کوتقریباً ۱۰۲ سال ہوئےہیں۔ ان کی بھیجی صاحبہ دختر آگاہ مرحوم ان کو عنایت فرمائیے " —

مرقوم ۲ - رجب سنہ ۱۳۲۶ ہجری - محمود حبیب اللہ (دستخط)

سنہ اور اوپر کے سال کے ہندسوں میں بعد میں کچھ تغیر کیا گیا ہے خارجی ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ محمود حبیب اللہ صاحب کے والد مرتضیٰ صاحب نے سفر حج سے سنہ ۱۲۲۰ ہجری کے قریب فراغت حاصل کی تھی - اور یہ دیوان ان کو اسی وقت دیا گیا - اس طرح اس کی کتابت یقیناً سنہ ۱۲۴۰ ہجری سے پہلے ہوچکی تھی۔ورق ۲۔ الف کے حاشیہ پر "علاقہ متروک" ذرا نیچے ہٹ کر یہ دوتحریریں ترچھی درج ہیں —

• ملاحظہ ہو فہرست کتب خانہ آصفیہ جلداول صفحہ ۱۳۴۰ نمبر ۷۵۰

† " " " " صفحہ ۱۳۵۴ نمبر ۳۸۳

١- دیوانِ ہندی مولوی باقر آگاہ —

٢- عنایت حضرت پھوپی صاحبہ قبلہ بنت حضرت آگاہ مغفور مالک مرتضیٰ بن صفی الدین کان اللہ لہا —

ذرا اور نیچے دستخط کیا ہے " مالک غلام محمد بن مرتضیٰ " —

ان تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد حبیب اللہ کے والد مرتضیٰ بن صفی الدین کو یہ دیوان ان کی پھوپی نے جو باقر آگاہ کی دختر تھیں، عنایت کیا ہے۔ گویا محمد حبیب اللہ باقر آگاہ کے پر پوتے ہوتے ہیں۔ جن کو یہ دیوان اپنی دادی (باپ کی پھوپی) کے پاس سے ملا تھا —

اس سے بھی اس دیوان کی قدامت پر روشنی پڑتی ہے۔ محمد حبیب اللہ کے پاس دو پشتوں سے گذر کر یہ دیوان پھر پہنچا ہے جس کی مدت ایک سو سال سے کسی طرح کم نہیں ہوسکتی —

دیوان کے غالباً صرف دو نسخے ہیں۔ جن میں سے ایک جو ہمارے پیش نظر ہے ہم کو آگاہ کے ایک موجودہ رشتہ دار مولوی محمد حمید احمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) سے مطالعہ کے لئے ملا ہے۔ دوسرا مخطوطہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن) میں موجود ہے۔ جس میں تاریخ کتابت نہیں ہے۔ آگاہ کا دیوان اس زمانے کی تمام مروجہ اصناف نظم پر مشتمل ہے۔ زبان کے اعتبار سے بھی اس وقت کے روز مرہ کے مطابق ہے جس کی طرف خود آگاہ نے اس طرح اشارہ کیا ہے —

" یہ مجموعہ اگرچہ مختصر ہے، مگر اقسام سخن پر مشتمل ہے اور اسے محاورہ اردو سے مخصوص کردیا۔ جسے تلاش سخن میں پوری رسائی اور تصرف و چاشنی میں جوں چاہے آشنائی ہے ... وغیرہ (دیباچہ دیوان ورق ١١ ب)۔ شمالی ہند میں اردو نثر کی ابتدا بارھویں صدی ہجری کے آغاز سے کچھ پہلے ہوئی۔ تیرھویں صدی میں میر کے معاصر اور مد مقابل مرزا رفیع سودا کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ انہوں نے میر کی مثنوی " شعلۂ عشق " کو نثر میں لکھا تھا اور یہ اردو نثر کا

سب سے پہلا نمونہ تھا۔ یہ ترجمہ اب تک علمی دنیا کو دستیاب نہیں ہوا۔ اگر یہ مل جائے تو یقیناً بڑی کام کی چیز ہوگی کیونکہ اس سے شمال میں اُردو نثر کی ابتدائی حالت معلوم ہونے کے علاوہ میر و سودا کے دکنی معاصرین خصوصاً باقر آگاہ کے نثری نمونوں کو ان کے سامنے رکھہ کر ایک تقابلی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ فی الحال سودا کے اس نثری نمونے کے ملنے تک ان کے دکنی معاصرین کی نثر کا مطالعہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ یہ اردو نثر کے ابتدائی نمونے ہیں بلکہ اس لئے کہ ان سے اس زمانے میں زبان کی ارتقائی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

مربوط اُردو نثر نگاری کی ابتدا دکن میں آٹھویں صدی ہجری سے پہلے ہوچکی تھی۔ قدیم ترین اُردو نثر کے کچھہ نمونے بعض در مندان اُردو خصوصاً مولوی عبدالحق صاحب بی اے۔ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) کے سکریٹری کی مساعی سے منظر عام پر آچکے ہیں ● اور امید ہے کہ آئندہ بہت سی اس قسم کی کتابیں علمی دنیا سے روشناس ہوتی رہیں گی —

آگاہ نے اس دیوان کی ابتدا میں ایک نثر کا دیباچہ ہے جو بارہ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر اور سودا کے معاصرین نے نظم کے ساتھہ ساتھہ نثر کو بھی کس رتبے تک پہونچا دیا تھا۔ اور کن مفید اور علمی مطالب کا اسکو حامل بنایا تھا۔ یہاں مذہبی اور تعلیمی تحریروں سے گذر کر اس وقت زبان کے اہم پہلوؤں پر بھی ناقدانہ طرز سے تحریریں پیش کی جانے لگی تھیں۔ یہ دیباچہ اس وقت کی تمام نثری تحریروں میں ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ جس اجمال اور مفید اختصار کے ساتھہ اصناف نظم پر اس میں بحث کی گئی ہے اس کی مثال اس وقت تک کی تمام دکنی تحریروں میں نہیں ملتی۔ بلکہ

● ملاحظہ ہو رسالہ "تاج" (حیدرآباد دکن) جلد ۲ شمارہ ۴، ۵ و ۶ —

اس کے بعد بھی سید انشاءاللہ خان "انشا" سے پہلے کسی نے اس موضوع پر قلم اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ اور اگر زبان کی قدیم خصوصیات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو موجودہ ستھری علمی نثر میں بھی اس کا رتبہ دوسری تحریروں سے کسی طرح کم نہیں —

اس دیباچہ کی اہمیت کے مدنظر اور قدیم ترین علمی نثر کا نمونہ ہونے کی وجہ سے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کو یہاں بلا کم و کاست پیش کردیں۔ اس سے کئی ایک اہم امور پر معنوی روشنی پڑتی ہے —

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد و ثنا اُس ذات اقدس کو کیونکر کر سکے کہ الفاظ احساس سوزی و کلی و کلمات انواع علوی و سفلی دک کی فرمائے ہیں اُس کی مادۂ اسمائی سے اشتقاق پائے ہیں اور وصف و نعت اُس کی حبیب مقدس کی کوئی کیونکر لکھے کہ جوامع الکلم سے اُس کی زبانی اور اُس افصح و آفاق کی حبیب کبریائی صلے اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ اہل المجد والکرم۔ بعد اس کے آگاہ ہووے یاران نکتہ داں کو کہ دل اُن کا جواہر خانہ عرفان کا گنجینہ دار اور سینہ اُن کا آئینہ خانہ معنی کا تصویر زار ہے۔ معلوم ہووے کہ آدمی چشم عالم کا انسان اور سخن اُس جان جہان کا جانان ہے۔ بعضے مناقب و مراتب اُس کی دیباچہ گلزار عشق میں لکھا ہوں اب اس دیباچہ میں سوائے اُس کی قواعد کے ذکر مذکور کرتا ہوں اور جیب و دامن طالبوں کو (کے ؟) نفایس فواید سے بھرتا ہوں۔ فائدہ اول مخفی نہ رہے کہ ریختہ بجز محاورہ ہندی کے سب امور میں فارسی کا تابع ہے مانند قوانین عروض و قافیہ و صنایع بدیعیہ ہر حال میں قدم پر اُس کی قدم دھرتی اور ہرگز پیروی سے اُس کی عدول نہ کرے یہ صرف محض صواب و عین انصاف اور دور از شائبہ خلاف و اختلاف ہے۔ فائدہ دوم محققان اہل فارسی کہ فکر روشن اُن کی محاسن نظم و نثر کی آرسی ہے

شعر کو کئی پر تقسیم کئے هیں- قسم اول قصیدہ، تعریف اُس کی یوں کر کئے که قصیدہ کیتک ابیات هیں که مطلع رکھیں اور وزن و قافیه میں متحد هویں اور بار ساهیت (غالباً بارہ بیست ؟) سے تجاوز کریں، اکثر کو اُس کی حد نہیں لیکن نزدیک متاخرین کے مستحسن یہ ہے کہ ابیات اُس کی ایک سو بیس سے زیادہ نہوں، وہ اغلب مدح میں هوتا هے اور کبھو مذمت یا فخر و نصیحت میں۔ معنی قصیدہ کے مغز غلیظ یعنی قوی هے، جب قصائد میں معانی و مضامین جلیل و متین مندرج هوتے اور ذایقه طبع سلیم کو لذت دیتے هیں اس نام سے مسمی هو اور آخر قصیدہ مدحیه قطعه د عائیه لانا لازم زوال هی اور سوم تو که قصیدہ کبھو تشبیب سے مقرون هوتا هی اور کبھو بے تشبیب استعمال پاتا هی پس اگر تشبیب هوئی تو واجب هے که آخر تشبیب میں حسن التخلص که اوسی فارسی میں گریز و گریز گاہ کہتے هیں لاوے ایسی طرز لطیف سے که قصیدہ و تشبیب میں پیوند انقطاع نه پاوے۔ قسم دوم تشبیب هی، تعریف اُس کی یہ هے که وہ کیتک ابیات مطلع دار هیں، اول سے آخر تک مشتمل هیں وہ ابیات اوپر ذکر اس چیز کی که شاعر کے دل کو نشاط میں لاوے خواہ وصف جمال محبوب یا صفت حال عاشق مکروب یا تعریف بہار و گلزار یا شکایت اوضاع روز گار وغیرہ اس تشبیب کو نسیب بھی کہتے هیں معنے دونوں کی واحد هی یعنی ذکر ایام جوانی اور غزل خوانی محبوبان جانی سے کرنا اور هر ذکر مسرت آور پر سے دهرنا قسم سوم مسمط هی، تعریف اُس کی یہ که وہ کیتک مصاریع هیں که وزن و قافیه میں متفق هویں سوائے مصرع آخیر کے که وزن میں متفق اور قافیه میں مفترق هے اگر احیانا ابتدا یا وسط میں متفق هویں تو مضائقه نہیں لیکن متاخرین فارسی اور ریختہ کی ابتدا میں مصاریع اول مسمط کو قافیه میں متفق استعمال کرتے هیں۔ اور بوجم تر که مسمط تین مصرع سے دس مصرع تلک هوتا هے اول کو مثلث دوسری کو مربع تیسری کو مخمس چوتھی کو مسدس پانچویں کو مسبع چھٹی کو مثمن ساتویں کو متسع

آٹھویں کو منحصر کہتے ہیں ۔ شعرای فارسی کی آٹھوں قسم میں اشعار کہے ہیں لیـ
شعراء ریختہ کو اکثر مربع اور مخمس اور کبھو مسدس و مثمن نظم کرتے ۔ لا
میں تسمیط ہوتی پروئی کو کہتے ہیں اور مسمط اسم مفعول ہی بعد ازاں ول
ایسی کلام کے مثال نہیں ہیں —

قسم چہارم ترجیع ہے بعض اوسے ترکیب بند بھی کہے ہیں تعریف اس کی یہ ہ
وہ نظم ایک ہو کہ حصہ کیا گیا ہے ایک بیت دو قافیہ دار سے ہر حصہ اس
چاہد ابیات ہیں کہ وہ قافیہ میں اتحاد رکھتی ہیں اور وہ بیت ذو القافیتین
اکثر مکرر ہوتی ہے اور کبھو غیر مکرر آتی اس بیت کو بند ترجیع کہتے ہیں
اور شرط ہے کہ بند ترجیع مکرر ہو یا غیر مکرر ہو بیت سابق سے مناسبت و
ربط اور ... ہر حصے کی ابیات غیر حصے سے زیادہ نہ ہو
ترجیع لغت میں پھیر آنا آواز کا ہے اس معنی لغوی کے واسطے اس قسم کلام کے
لئے ہیں ... مناسبت ... میں ظاہر ہے ۔

قسم پنجم مثنوی تعریف اس کی ... وہ ایسی ابیات ہیں کہ
میں موافق اس قرائن میں ... ہر بیت ایسی دو قافیہ رکھ
ہوں مثنوی منسوب ... ہے یعنی دو ... ہر بیت اس کی دو قافیہ رکھتی
اور ... اغلب اوزان مثنوی کے ... سبک ہوتے ہیں ...
قسم اس ... وزن میں کہی ہیں تفصیل ان اوزان کی بقاعدہ عروض کـ
چھوٹی ہی اگر ... کو شوق ہے تو کتب عروض دیکھے مثنویات نامداران ساتوں
میں بے شمار ہیں مثل هفتو رنگ حضرت مولانا جامی قدس سرہ السامی اور
سیپارہ ملا زلالی وغیرہ ہما جان کی رباعی جاں کہ ایک وزن خوش اسلوب کہ ما
اوس میں نہایت مرغوب واقع ہوتی ہی شیخ بہاوالدین عاملی استخراج کی
اور اس میں یک منظوم شیر و شکر موسوم بنایا یہ وزن عرب میں مطبوع و

اور نام اس کا رکض الخیل وصوت الناقوس ہے قصائد عربی اس میں بہت منظوم ہیں کئی بیتیں مثنوی شیر و شکر سے یہ ہیں :—

اے ساقی بادۂ روحانی زارم ز علایق جسمانی
یک لمحہ ز عالم نورم بخش یک جرعہ ز جام طہورم بخش
عشاق جمالک اخرقوا فی بحر صفاتک قد غرقوا

اور شعراء دکنی بھی اس وزن میں شعر کہے اور نام اس کا برھنی یا درسنی رکھے پانچ مصرع اس کے اوپر یک قافیہ کے بنے اور دو مصرع اوپر قافیہ دیگر کے بنتے ہیں اور اغلب یہ دونو مصرع مکرر ہوتے ہیں مثال اس کا اس نظم سے شاہ اعظم قدس سرہ کی معلوم ہو گا —

رنگ رلی حکت کلفت ہوئی مدماتی سی آشام ہوئی
دل نرگس رنگیں جام ہوئی من جیون کو آرام ہوئی
یک درسن میں کئی کام ہوئی
اس صورت کی بلہارے ہوؤں جس دیکھت بہ بل ہاری ہوؤں

یہ درسنی عجب لطافت و رنگینی اور معرفت اور محبت کی چاشنی رکھتی ہے۔ حضرت مرشد اس حقیر کے جناب سید ابوالحسن قادری قربی قدس سرہ الوہبی اس کی جواب میں یک برھنی اور ایک درسنی کہے بایں اکثر فرماتے تھے کہ جواب اس کا زاید تھا اور اغلب اوقات میں ابیات اس کی خصوصاً مقطع اس کے پڑتے تھے اور گریاں ہوتے۔ یک بیت مکرر حضرت قربی کی درسنی کی یہ ہے:—

میں پیوں میں اپس کو فنا کروں میں مرلی کے اکیچ سور

راقم حروف اسی وزن اور ساتوں وزن مشہور میں آٹ مثنوی سیر شریف پر نوز سین نظم کر کر ہشت بہشت معنوی سے موسوم کیا ہے اب اصل مطلب کی طرف رجوع کرنا اولی ہے۔ قسم ششم غزل ہے۔ تعریف اس کی یہ کہ وہ ابیات با مطلع ہیں اور وزن و قافیہ میں متحد ہوویں اور بارہا بہت سے تجاوز نکریں

فائدہ اس قید کا یہ ہے کہ جو بارہا بیت سے گذر جاوے تو غزل سے مسمی نہ ہوے بلکہ قصیدہ کہلاوے بیشتر غزلیں متقدمین کی اور متاخرین کی میں صایب حد قصاید کو پہنچی ہیں۔ اکثر غزل وصف معشوق پر مشتمل اور کبھو حال عاشق بیدل پر شامل ہوتی ہے اور کبھو اصابع و عمارت و اسرار و دیگر امور بسیار سے خبر دیتی۔ مخفی نہ رہے کہ توصیف معشوق سراپا ناز سے ذکر سوز و گداز عاشق بانیاز بہتر ہے کیا واسطے کہ تعریف محبوب فقط دعوی سے ہمراہ ہے اور ذکر سوز و گداز عاشق کا ادعاء را گواہ۔ طریق مستحسن نزدیک ماہران فن کے یہ ہے کہ سات بیت سے زیادہ اور پانچ بیت سے کم نہ ہو مگر وقتیکہ فکر رسا بر سر اعالت آور و مضمون دل کش و دلکش بطریق آمد ہات اجاوے تو یا گیارہ بیت کہنا مضایقہ نہیں رکھتا۔ وجہ تسمیہ کہ لغت میں غزل زنان کی سات سخن کہنا ہی جس اس نوع کے کلام میں اوصاف محبوباں مذکور ہوتے ہیں نام اس کا غزل رکھے فی الحقیقت جب فارسیان نظم و نثر فارسی میں خوشہ چین عرب کے ہیں اور تغزل اس کا غزل و تشبیب میں عورات کی سات تھا انہو نے بھی اس نظم کو غزل سے مسمی کر دیے۔ کو تغزل امردوں کی سات نفی نفس الامر میں نفی وجہ سے امر بھی تشبیہ زن ہے لہذا نظر در فا ضرب مثرب؟ اس کی ہمراہ ہے۔ قسم ہفتم فرد ہے تعریف اس کی یہ ہے کہ فرد یک بیت ہے خواہ صاحب یک قافیہ ہو یا دو سالند مطلع وجہ تسمیہ ظاہر ہے --

قسم ہشتم رباعی ہے تعریف اس کی یہ کہ رباعی دو بیت ہیں کہ وزن قافیہ میں متحد رہتی ہیں اور بیت اول کی قافیتیں دو تی ہے اور بوزن خاص مخصوص ہو گئی اگر کسی کو عروض میں راہ نہیں تو اس وزن کو یاد رکھے لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ اور کبھو ہر چار مصرع قافیہ میں متفق ہوتے وجہ تسمیہ یہ کہ اس شعر میں چار مصراع ہیں اس واسطے اوسے رباعی کہے اور عجب تمام یہ کہ فارسی میں اس لفظ رباعی نام ہے اور عربی میں دو بیت کہتے ہیں۔ قسم نہم قطعہ ہے تعریف اس کی یہ ہے کہ قطعہ کو

ابیات میں کہ وزن و قافیہ میں متحد ہوتے ہیں اور مطلع نہیں رکھتی اگر مطلع رکھہ کر بارہ
بیت سے زیادہ ہوں تو قصیدہ ہے و اگر کم ہیں تو خلاف قیاس ہے اولی یہ ہے کہ
ابیات قطعہ کی ابیات قصیدہ سے کم ہو ویں. قطعہ قَطَعَ یَقطَعُ قطعاً و قطعہ کا مصدر
ہی اور قطعہ لغت میں اُسے کہتے ہیں کہ یک شی سے پارہ یک ہو اس معنے سے
واسطے اس نوع کلام کی نقل کئے ' مناسبت درمیانی دو معنے کی یہ ہے کہ اس
قسم کا کلام گویا پارہ ایک قصیدہ سے ہے . بعض اہل فن مستزاد معمہ و لغز کو دوں
اقسام اولیہ نظم میں داخل کئے ہوں لیکن ارباب تحقیق کہ کہے کہ یہ تینوں
اقسام اولیہ سے شعر کی نہیں ہوں کیا واسطے کہ اگر اقسام مستقل ہوتے تو اقسام
دیگر میں داخل نہیں ہوتے . حال انکہ یہ تینوں قصیدہ و غزل و رباعی وغیرہ
میں منظوم ہوتے ہیں بہر حال تعریف ان تینوں کی بھی کرنا مناسب ہے - مستزاد
وہ کلام ہی کہ بعد مصرع یا بیت اُس کی فقرہ مختصر ایک نثر سے لاویں. بعضے
شعراء تحقیق اثر کہ متاخر تر ہیں یہاں قیل و قال رکھتے ہیں کہ جمع ہونا نظم
و نثر کا از قبیل اجتماع دو ضد ہی پس صحیح یہ ہی کہ وہ ایک دو لفظ زاید
ہے نظم سے ہیں اور قواعد عروضی سے اُسے وزن و تقطیع بوی بہم پہنچا ی ہیں
تفصیل اس بحث دقیق کے اس محل میں زاید ہے اور تعریف معمی کی یہ ہے کہ
معمی ایسا کلام منظوم ہے کہ بطریق رمز و ایما کوئی نام پر نامونسی دلالت کرتا
ہے اور لغز کلام موزوں ہے کہ دلالت کرتا ہے اوپر یک چیز کے چیز ہا سے اس طور
سے کہ اُس چیز کو غیر سے اُس کی علحدہ کردیتا ہے یعنی بقدر صفات و علامات
کہ اہل فن اونسی طرف اُس چیز کی پی بر ہوتے ہیں . یہ لغز دو قسم پر ہے
قسم اول یہ کہ اغلب ابتدا میں اُس کی لفظ چیست و شبیہ اُس کی لاتے ہیں اسواسطے
اسے فارسی میں چیستان سے بھی موسوم کئے اور قسم ثانی یہ ہے کہ لفظ چیست
وغیرہ نہیں لاتی ریختہ گویونسی ان دونوں قسم میں اشعار کم ہیں بلکہ نہیں
مگر اشعار ہندی میں کہ اشلوک و کبت دوہرہ وغیرہ میں بہت دیکھنے میں آئے

زبان هندی میں اُسے پہیلی کہتے هیں ۔ بعضیں اور تمثیلیں ان سب کی طویل الذیل هیں ۔ اس مختصر میں ذکر اُس کا کہونکر سماوے ۔ فائدہ سیوم ۔ اہل عرب و عجم کے متفق هو کر کہتے هیں کہ شاعر قصیدہ میں چار جگہ اهتمام زیادہ صرف کرے۔ اول مطلع میں کیا واسطے کہ جو پہلے مستمعان کی سمع میں پہنچتا هو مطلع هے اگر وہ جودت و خوبی میں طاق هو سامع دوسرے ابیات کی سننے کا مشتاق هو ۔ دوسرا گریز میں جوں چاہیے بغیر مجبور کرے کیا واسطے کہ اول تشبیب هے آخر تک ایک اسلوب پر تھا اب وضع دیگر کو پہنچا پس اگر گریز بطرز دلاویز کرے سامع کا طرب انگیز هووے ۔ تیسرا اگر شاعر قصیدہ میں تعرض بذکر مدعا یا عرض دعا کرے بالیں کنہدیں و اندازیں نظیر ان کی ادبا اسے حسن الطلب و براعة المطلب کہتے هیں ۔ چوتھا در سنی خاتمہ میں سعی بلیغ کرے کیا واسطے کہ مقطع جید دلنشیں مصرور فور ابیات پیشیں کا [illegible] هوتا اور یہ سخن اُس سب جملوں کو بھولا هے [illegible] اسے براعة الاختتام و حسن المقطع کہتے هیں اور غزل کے اندر فقط مطلع و مقطع میں جد [illegible] میں لاوے اور بیت ثانی میں کہ بعضے اوسے حسن مطلع بولتے هیں کوشش واقعی کرے ۔ فائدہ چہارم ریختہ کہنے والے پر واجب هے کہ قصیدہ و غزل و مثنوی میں الفاظ عرب و لغات غیر مشہور عربی و فارسی کہ هندیوں اس سے چنداں مانوس نہیں هیں نہ لاوے اور ترتیب میں وضع هندی کو ترتیب نہج فارسی پر فائق نہ دیوے اور تا مقدور ترتیب خوش و چست بانداز درست اختیار کرے ۔ اهل صنائع بدیعہ اس کو انسجام کہتے هیں ۔ معنی انسجام کے لغت میں برسنا مینہ کا هے اس طور سے کہ هر قطرہ جدا اُس کا علیحدہ پڑے اور قطرۂ دیگر سے اختلاط نہ کرے اور اصطلاح میں ان کی هونا کلام کا اس بندوبست سے کہ هر کلمہ با وجود فصاحت کے برمحل واقع هوئے اور اصلا اُس میں تکلف نہ پایا جاوے۔ اور ناظم ریختہ پر لازم هے کہ واو عطف کو درمیان دو حرف صحیح کے ایسی نہج سے لاوے کہ حرکت کو اُس کی ظاهر کرنا نہ پڑے اور جو حرف صحیح میں

پیوند اس طرح ندیوے کہ اظہار حرکت سے اُس کی وزن الوداع بولے اگر دو حرف
علت ہوں تو مضائقہ نہیں اور لفظ فارسی یا ہندی کو طرف دوسری کلمۂ ہندی
کی مانند فارسی مضاف نہ کریں کہ بہتر ہے مگر در صورت شدت ضرورت، وہ بھی
بطریق ندرت۔ یہ امر شاید اشعار پہلیں میں کہیں واقع ہو گا نہ اشعار حال میں۔
اور لفظ ہر ایک کا ایسی طور سے نہ لاوے کہ حرف یا تقطیع میں ساقط ہوئے۔
ہر ایک لانا مضائقہ نہیں کیا واسطے کہ اجتماع دو ساکن کا روا ہے اور الف وصل
کا ساقط ہوتا اور واجب ہے کہ اجتماع دو ساکن کا روا ہے اور الف وصل کا ساقط
ہوتا ہے۔ اور واجب ہے شاعر حلات شرع سے کہ بزرگان اسی هفوات شعراء کہیے
ہیں پرہیز دے جیسا مدح میں سلاطین کو انبیا کی برابر کرے یا ائمہ اولیا کو
اُن پر ترجیح دیوے اسواسطے حضرت نظامی قدس سرہ السامی فرماتے ہیں۔
تا نکند شرع ترا نامدار۔ نامزد شعر مشو زینہار۔ اور تا مقدور تلاش مضامین تازہ
و نکات بلند آوازہ کریں۔ مضمون تازہ دل کشا جان قالب سخن رساہے۔ فایدہ پنجم،
ای بھائی تو سابق سن چکا کہ ریختہ فارسی کا تابع ہے پس اُس کے ناظموں پر
واجب ہے کہ انواع سخن میں قوانین قوافی فارسی سے عدول نہ کریں بلکہ تتبع پر
اُس کے بواقعی سن دھریں، عجب و سو عجب ہے کہ اکثر بلکہ سب ریختہ کہنے والے
اس سرشتہ کو چھوڑے اور ایک لغت اُس سے منہ موڑے جیسا کہ کاف فارسی کو
سات کاف عربی کی اور رائے ہندی کو سات رائے عربی کی اور اسہی قبیل کے اور
حرفوں کو سات حروف دے کر کے قافیہ کرتے ہیں تذکرہ نویسان فارسی لکھے ہیں
کہ یک شخص حضرت نظامی پر قدس سرہ السامی اس بیت میں اعتراض کیا —

بدریا گرزدی قہرش پلارک بماہی کا ژکفتی کیف حالک

کاف پلارک فارسی اور کاف حالک عربی ہے اور حرکت ماقبل روی کے مختلف ہے کیا واسطے کہ
لام حالک مضموم اور راء پلارک مفتوح ہے حضرت نظامی دیکھے کہ دونو اعتراض درست ہیں،
لہذا اُس معترض کو جواب ظریفانہ دئیے کہ یہ مصرع مقولہ کا ژ ہے وہ نحو و قواعد شعر نہیں

جاتا ہے ۔ اس حکایت میں غور نظر سے تامل کر کہ حضرت نظامی یادگار و افتخار سخن و سرآمد مثنوی گویاں تو رکھتے ہیں باین اعتراض بجا ویسے جناب والا پڑھے گئے اور انہوں نے اوسے مان لیا ۔ یہ مثل آئینہ صاف ہے کہ انصاف علامت شرافت ہے اور یونہی تکرار قافیہ اور لانا اوس قافیہ کا کہ اوسے ایطاء جلی اور قافیہ شائگان کہتے ہیں جائز نہیں ہے ۔ اس قافیہ کو بھی ریختہ گویاں بہت لاتے ہیں وہ قافیہ یہ ہے کہ قصیدہ الفیہ یا یائیہ میں الفاظ جمع فارسی پے در پے یا فاصلہ یک بیت سے لاویں ۔ اولاً یہ ہے کہ قصیدہ مذکور میں ایسے الفاظ کو قافیہ نہ کریں اور اگر بہ ضرورت لاویں تو تکرار اس کا بعد پانچ چھ بیت کے کریں اور الفاظ ہندی میں جیسا ادھر اور اودھر اور جدھر اور یہاں وہاں جہاں و مانند اس کے ایسے دو لفظ کو قافیہ کرنا ہرگز جائز نہیں فیدہ ششم اکثر ریختہ گو یہاں الفاظ مشہور عربی و فارسی کو زیر و زبر کرتے ہیں اصلاً انضباط و احتیاط پر خیال نہیں دھرتے لطائف اس کے لانا دور و دراز ہے تو آپ انصاف و تامل سے مطالعہ دواوین کر کے یہ بات تجھے معلوم ہوئے اگر شعراء دکھن الفاظ مذکور کو زیر زبر کریں تو چنداں مضایقہ نہیں رکھتا ہے کہ وہ وطن کے اہل تصنیف محاورہ میں اس قدر حد ؟ کہ نہیں کئے بخلاف ساکنان محاورہ اردو کہ اس سبب میں سعی بلیغ کر کے ہر روز مرہ کو محاورہ فارسی کا ہم پہلو کردے ۔ پس یہ افراط و تفریط ان سے نہایت ناریبا بلکہ ناروا ہے خصوصاً الفاظ مشہور تر کو زیر و زبر کرنا پر دشوار ہے جیسا لفظ نشاہ کو کہ سکون شین و ہمزہ وہائے خفی سے ہے بفتح شین پڑھنا اور ہمزہ وہا کو دور کرنا اور لفظ ملہیات کو کہ سکون سے ہے بفتح نون لانا اور لفظ نلہ کو کہ بسکون نون ہے زبر دیف اور لفظ شکل کو کہ بسکون کاف ہے حرکت فتحہ دیکر اوسی قافیہ قصیدہ لامیہ کا کہ ماقبل اوس کے روی کا مفتوح ہے کرنا اور لفظ محل کو کہ کسرہ سے ہے فتحہ دیکر الفاظ مفتوحہ کا قافیہ لانا ناروا تر ہے ۔ اور لفظ زیادہ میں طرفہ تصرف صرف نہانہ کئے کہ یائے متحرک کو ساکن کر کو فتحہ

اس کا ماقبل کو اس کی کہ زائے مکسور ہے دئے بعد اس کے کہ کسرے کو اس کے
جہیں لئے یہ تصرف نہایت ثقیل و پر تکلف ہی - مقصود اس تحریر سے ان پر
طعن نہیں ہے - بلکہ غرض اصل یہ کہ مستعدان حال کے تازہ عرصہ میں آے ہیں اور
طبع رسا کو بمضمار فکر عروج لانی میں لائے اس امر میں ان کا اقتدا نہ کریں۔ " قاعدہ
ہفتم غلطیاں میں بعض الفاظ ضروری کہ " مصاریع جمع مصراع اور اسی صراع یعنی کہتے
ہیں - قوافی جمع قافیہ روی آخر حرف قافیہ کہ بنام قصیدہ یا غزل وغیرہ کا اس پر
ہے جو سا حرف رائے مہملہ قصیدہ اول میں اس مجموعہ کے ' اور حرف زائے منقوطہ
قصیدہ ثانی میں اوس کی- پس جو قصیدہ کہ روی اوسکی یک حرف حروف ہجا سے ہے
او سے - اوس حرف طرف منسوب کرنے ہیں مثل قصیدہ' رائیہ یا زائیہ یا کافیہ یا لامیہ
وغیرہ ادباء کو کہتی ہیں کہ بارہ ۱۲ علم میں مہارت رکھے ہیں- اول علم صرف دوم
علم اشتقاق و لغت سیوم علم نحو چہارم علم معانی پنجم علم بیان ششم علم بدیع
ہفتم علم عروض - ہشتم علم قافیہ نہم علم رسم الخط دہم علم محاضرات اور تاریخ بھی
اسی علم میں داخل ہے- یازدہم علم تقریض کہ اوسے علم قریض و قرض الشعر بھی بولتے
ہیں دوازدہم علم انشاء و خطب و رسایل - اے بھائی جب توان فواید کو مجملا سنا
اب اس حرف کو بھی سن یہ حقیر نارس آ کے تیس بتیس برس کے کیا فارسی اور
کیا ہندی میں سب اقسام شعر میں نظم کیا تھا اور ان سب کر بعد انتقال حضرت
مرشد کے قدس سرہ وھو و الا مکر (کذا) عقاید مسمی ہشت بہشت کیا - پیچھے اوس کے
ریاض الجنان در مناقب اہل بیت عالیشان اور تحفۃ الاحباب در مناقب اصحاب
اور محبوب القلوب در مناقب حضرت محبوب اور فراید در بیان فواید لکھا - بعد
اس کے گلزار عشق کا قصہ رضوانشاہ و روح افزا کا ہی بنایا - یہ مثنوی شاعرانہ اور
تلاش مضمون میں رنگینی و معانی تازہ دلنشینی میں یگانہ ہے - محاورہ اس کا بعینہ
محاورہ اردو ہے مگر کہیں کہیں نا ملائمت و ثقالت دکنی باقی رہی جیسا کہ یہ مضمون
شرح و بسط سے دیباچہ میں اوس کے مرقوم ہے - بعد ازاں بعض دوستاں بمبالغہ

پیکران نظم و غزلیات کی خواہاں ہوئے۔ پاس خاطر اون کے کہتک غزل کہ شورش دل اور جوشش خاطر سے نکل آئے منظوم ہوئے پہنچے میں قصیدہ کہ وارد ہی اور وارد نہ ان کے لطایف کی سخن فہموں پر موقوف ہے خصوصاً قصیدہ کہ نعتیہ کہ حضرت خیر البریہ علیہ الصلوٰۃ و التحیہ کے شمایل تشبیہ یا سلوب کنایت و مجاز کہا گیا ہے اور تصور میں ناظم کی منتہائے لطافت و دقت کو پہنچا و قصیدہ لامیہ ہلالیہ کہ تشبیہات نادرہ سے لبریز اور فضا میں تلاش بلند آوازہ سے شور انگیز ہے صاحبان استعداد ان دونو قصیدہ کو غور سے دیکھیں اور داد دیویں۔ مرقوم ہوئے قصیدہ اول نہ قصیدہ جس میں ضرورت قیود اصل میں ہے عز وجل مشبہ ہی اب تک عربی فارسی ہندی میں قصیدہ مشبہ جد میں اس عاصی کو نظر نہیں آیا اور دو قصیدہ دیگر بہتر انتظام پائے تھے اور محبوب القلوب کے خاتمہ میں داخل ہوئے اور مسمط و ترجیع بند پندرا برس کے آگے مرثیہ جناب سید الشہدا میں علی جدہ و علیہ الصلوات و السلام مکمل استحکام پائے تھے اور ایک مثنوی مختصر شروع ابیات مشتمل ... حضرت عارف بکالہ میں کرم اللہ وجہہ الانوار ان دونو میں بنی یا چند رباعیات مقطعات ... اس مجموعہ میں درج کیا تا یہ مجموعہ اگرچہ مختصر ہے سب اقسام سخن پر مشتمل رہے اور اسے محاورہ اردو سے مخصوص کردیا۔ جسے نفس سخن میں پوری رسائی اور تصرف و عاشق محبت سے جوں چاہے ہے آشنائی ہی انداز اس کا مواقع جیسے کا اور رتبہ اس کا کما ینبغی پہچانتا اور درصورت عدم انصاف اور بغض و حسد دل کا صاف اس حرف کو لائق گذاشت پر حمل کریگا بلکہ صاحب زبان جس مذہب سے ہوئے منظر ہو کے داد سخن دیوے۔ مخفی نہ رہے کہ مدت سے مزاج اس درد مند کی اقسام اسقام سے ہرگز ندر ہتی ہے عجز و ضعف سے انواع کاہش سہتی اور مطالعہ دواوین ہندی کا کر کر تیس برس گذر گئے اس صورت میں احتمال ہے کہ شاید کسی محل میں عدول اس محاورہ سے ہوا ہوا کو

کیھی صاحباں انصاف یوں پاویں خوردہ گیری نہ گیری بلکہ ترکیب دل نشیں و مضامین رنگیں پر سر دھریں —

الحمدللہ اولا و آخرا و الصلوٰۃ
و السلام علی نبیہ و آلہ
و اصحابہ باطنا
و ظاہرا

اس دیباچہ کے مطالعہ کے بعد زبان اُردو کے کئی مسائل ہمارے پیش نظر ہوجاتے ہیں جن میں سب سے اہم اور ضروری یہ کہ میر اور سودا کے زمانے تک اس زبان کو لوگ کیا سمجھتے تھے آیا وہ اس کو "بازار کی زبان" سمجھتے تھے یا "برج بھاشا کی بیٹی" —

دیباچہ اس پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے ۔ ہندی یا ہندوی اس کا قدیم ترین نام تھا ۔ اُردو اور دکنی کے لئے بھی یہ لفظ بلا تکلف استعمال ہوتا تھا گویا ' اُردو' ہندی ' اور دکھنی ایک ہی زبان کے مختلف نام تھے ۔ ہندی وہ زبان تھی جو مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے اور یہاں کی قوموں سے میل جول پیدا ہونے کے بعد لسانی اصول کے تحت اہل ہند کی بین الاقومی زبان کے طور پر پیدا ہوئی اور ہند و مسلمانوں کی کوششوں سے اس کا نشو و نما ہوا ' اس زبان کی شاعری ریختہ کہلاتی تھی ۔ ایکی سر زمین ہند کی وسعت ایک بر اعظم کی وسعت کے برابر ہونے کی وجہ سے اس زبان میں مقامی خصوصیات کے اعتبار سے فروعی تبدیلیاں پیدا ہوگئیں اسی لئے جب مختلف صوبوں کی ہندی میں امتیاز مقصود ہوتا تو اس کے ساتھ "اُردو" اور "دکھنی" کے الفاظ بھی استعمال کئے جاتے تھے ۔ آگاہ ان میں صرف اس طرح امتیاز کرتے ہیں کہ وہی ہندی جو شمالی ہند کے مرکزوں میں چند ضروری مقامی خصوصیات کے بعد "اُردو" کہلائی ' دکن میں اسی بنا پر اس کو

یہاں کے باشندے دکھنی کہنے لگے ۔ اس امتیاز کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہوئی کہ دکن میں ہندی نظم کے سوا نثر بھی اس وقت تک ارتقا کے کئی مدارج طے کرچکی تھی ۔ اس کے بر خلاف اس کے عرصہ دراز بعد تک شمالی ہندی صرف "ریختہ" پر محدود رہی ۔ اس طرح دکھنی ہندی سے ایک اور شاخ گجراتی کی شکل میں ٹھیک اسی طرح علحدہ ہوگئی تھی جس طرح شمالی ہندی سے پنجابی ہندی —

دوسری چیز جس سے اس دیباچے کے ذریعہ ہم روشناس ہوتے ہیں ' یہ ہے کہ یہ زبان خصوصاً نظم میں غیر شعوری طور پر انہیں اصول اور قوانین کی پابند ہوگئی تھی جو فارسی شاعری سے مخصوص ہیں ۔ چنانچہ بحور ' ردیف و قافیہ اور دیگر عروضی قوانین سے اس کا پتہ چلتا ہے ۔ لیکن اس خیال میں جامعیت ہے مانعیت نہیں کیونکہ یہ کہنا کہ نو پیداوار زبان فارسی کی تقلید پر منحصر تھی ' اس کو خلاف واقعہ محدود کردینا ہے ۔ اس نے خاص ہندی کے اصناف کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی چنانچہ غزل ' قصیدہ ' مثنوی اور رباعی اور دیگر فارسی اصناف نظم کے ساتھ ساتھ دوہا ' دوہرہ ' کبت بھی اس وقت ایسے ہی عام تھے —

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اردو کو فارسی عربی اور سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ سے بچانے کا موجودہ رجحان بھی انہیں قدمائے زبان کا وضع کردہ اصول ہے ۔ اسی طرح ان کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ سوائے شدید ضرورت کے فارسی یا ہندی کلمے کو ہندی یا فارسی کلمے کی طرف مضاف نہ کرنا مناسب ہے —

یہی وہ امور ہیں جن کی وجہ سے آگاہ کے دیوان کا دیباچہ نہایت وقعت کی نظروں سے دیکھا جانے کا مستحق ہے ۔ دیباچے کے ان چند ضروری امور کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ہم اصل دیوان کی طرف رجوع ہوتے ہیں —

دیوان کی ابتدا قصائد سے ہوتی ہے ۔ سب سے پہلا قصیدہ حمد میں ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے —

رات کو جو خواب غفلت سے ہوا میں ہوشیار　　صفحہ آفاق میں عبرت سے دیکھا بار بار

جملہ قصیدوں کی تعداد دس ہے جن کی تفصیل یہ ہے - حمد (۱) نعت (۵) منقبت حضرت فاطمہ زہرا (۱) منقبت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ (۲)

اردو شاعری کی رسمی حالت پر نظر کرتے شاید یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ حالی سے پہلے تک مختلف شعرا کے دیوانوں اور کلیات میں بہت کم اصولی اور مابہ الامتیاز خصوصیات پائی جاتی ہیں - اس لئے آگاہ کی شاعری کو بھی مضامین اور خیالات کی ممتاز خصوصیات کے لحاظ سے جانچنا یا ان کے خاص نقطہ نظر اور پیغام کا پتہ چلانے کی کوشش ' اردو زبان کے ذخیرہ میں کچھ اضافہ نہیں کرسکتی تاہم چلند خصوصیات کا ذکر آگاہ کی انفرادیت کو قایم رکھنے اور طرز شاعری پر روشنی ڈالنے کے لئے ضروری ہے —

قصیدوں میں آگاہ فارسی قصیدوں کے متبع ہیں اور اس خصوص میں سودا کا رنگ ان سے کچھ زیادہ جدا نہیں ہے - لیکن ایک خاص چیز یہ ہے کہ سودا کی طرح آگاہ نے قصائد کو کسی مقصد کا ذریعہ نہیں بنایا - بلکہ وہ صرف اسی کو مقصد سمجھتے تھے - یہی وجہ ہے کہ باوجود نواب محمد علی والاجاہ کی عنایتوں کے ایک قصیدہ بھی ان کی مدح میں نہیں لکھا - یہ یقیناً آگاہ کی عالی حوصلگی کی دلیل ہے - مثال کے لئے ذیل کے نمونے ملاحظہ ہوں —

اے ترے قامت دلکش پہ قیامت انداز بادہ مستانہ خرامی کا تری پا انداز
ہے عیاں عارض تاباں سے ترے جاوہ طور کیوں نہو سرمہ ساشہ تی میری سوزاور گداز

دیدہ دل کو لگا فکر و نظر کی عینک دیکھتا تھا میں یہ شب غور سے در ملک و ملک

اس کے رہوار سبک رو کی لکھوں جب توصیف
تیز ہو نال قلم جوں سمندر جاوے ہے اچھل

سودا اور آگاہ کے کلام کی یکرنگی کے قدر کے ضمن میں اس امر کا جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس وقت بھی شمالی ہند اور دکن ایک دوسرے سے بہت بعید اور بے تعلق نہیں تھے۔ چنانچہ آگاہ اور سودا ایک دوسرے سے واقف تھے۔ آگاہ کے کلام میں جا بجا سودا سے معاصرانہ چشمک کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اسی دور کے ایک اہم شاعر میر تقی میر کے متعلق آگاہ کا دیوان بالکل ساکت ہے حالانکہ یہ نا ممکن ہے کہ میر کی شاعری سے دکن نا واقف ہو۔ خود میر نے اپنی غزلوں میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں

کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک

ہے میرے ریختوں کا دیوانہ دکن تمام

اس کا سبب شاید سودا کی شاعری کی اُن خصوصیات میں ملتا ہے جن کی وجہ سے میر سے زیادہ سودا کا کلام هر دلعزیز ہو رہا تھا —

آگاہ اپنی تلمیح کے سامنے سودا کو خاطر میں نہیں لاتے اور ان کی غلطیاں نکال کر دکھاتے ہیں۔ قصائد ہی کے ضمن میں ایک منقبت میں فرماتے ہیں —

اس بند میں سودا کی ظاہر ہے پریشانی اپنے کو یزیدی کہ بیٹھا ہے نہ فدائی اور لے چلا اپنے پر الزام یہ نصرانی کہتا ہے فرس یارو اس طرح بہ نادانی میں ایک نصاری سے یوں از رہ نادانی پوچھا نہ مسلماں ہو بولا کہ یہ ہے نصرانی

مخطوطۂ دیوان ورق ۵۵ و

اسی طرح غزلیات میں بھی بعض جگہ اس معاصرانہ چشمک کا ثبوت ملتا ہے —

سر سودا پہ ترے شعر رسا سے آگاہ سلسلہ حشر کا بر پا نہ ہوا تھا سو ہوا

(ورق ۹۴ الف)

آگاہ کر سکے نمکیں لفظ یہ تری سودا کہے کہ شعر سے میرے نمک کہا

(ورق ۷۰ ب) وغیرہ

قطعات میں بھی ایک قطعہ سودا سے متعلق ہے۔ جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے —

ہیں ایک قطعہ میں سودا کے یہ دو بیت غریب
کہ معنی ان کے ز انصاف رو براہ نہیں
دیار ہند میں دو چار ایسے ہو گذرے
جنھوں نے باز رکھا مضحکہ سے اپنے تئیں
چنانچہ خسرو و فیضی و آرزو و ظہیر
سخن انھوں کا مغز ہے ہے قابل تحسیں
کہا میں سن کے عجیب ہیکا یہ دو چار کا قید
کوئی ایسا حرف تعجب فزا سنا ہی نہیں
بہت ہے گل کہ ہے ایران جن سے داغستاں
یہ گلز میں ہیں گلفروش خندہ شیریں
یہ سر خوشاں معانی کا اوج سوچ خیال
سنے اگر سنی شیراز ہوئے سر کہ جبیں
چنانچہ طوطی شکر شکن امیر حسن
جو ہم صفیر ہے خسرو کا اور قرب آگیں

اس کے بعد مسعود، شہر یار علی، قدیم بیجا پور، مرزا بیدل، غیثا، غنی، وغیرہ کے نام ان کی شاعری کی خوبیوں کے ساتھ گنوا کر اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ ورق ۵۶ ب سے غزلیں شروع ہوتی ہیں۔ غزلوں میں بھی آگاہ کا رنگ سودا سے ملتا جلتا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ سودا کا سا بلند تخیل آگاہ کے پاس نہیں —

پہلی غزل کا مطلع یہ ہے :—

اے حسن و عشق کو ترے جلوے سے ابتدا
ہر عین کو ہے تیری تجلی سے ابتدا

غزلیں ردیف وار ترتیب دی گئی ہیں۔ بعض غزلیں مسلسل بھی ہیں۔

غزلوں سے بھی چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں —

ہر اشک مرا تھا رشک یاقوت — ایسے کو تو خاک میں ملایا
کہتا تھا تمہیں آبا ترے اے عشق ستمگر — جو ایسے جلے دلکو تو اس طرح جلایا
ناکارہ و بیچارہ و آوارہ دل آگاہ — المنة لله پھر سے دلدار کو بھایا
نادر ہے ترا تماشہ اے دل — اپنے کو تو کیا ترا شا اے دل
شہر ہے کس نے آلے کی یہ گلشن — بڑی ہے جو طرف غل شہر مقدم
تکلیف سفر سے مجھکو نہ ہے ہرگز اے صبا — افسوس مجھے ہے سفر نت وطن کے بیچ
نشہ میں تیرے جو سو گئے ہم — بے ہوش دو جگ سے ہو گئے ہم
میں ایک جیلی سے اٹھ کے تلک ہوں آگاہ — جہاں میں دیکھئے جس کو تو ہے حیات لذیذ

میں تیری زلف کی پیچوں میں دل کا جویا ہوں
کہ اس اندھیرے میں وہ شب چراغ کھویا ہوں
خواب شیریں سے نہ شیریں کو جگا یا افسوس
ہر ذرہ ہوا ہے عبث نالہ فرہاد ہنوز
ہے اندنوں لب جاں بخش یار پر سر لطف
بچارہ ہے اے دل بیمار اب جیا تو کیا
قیامت لے خرام ناز تیرا دیکھ کر پیارے
کھڑی قد کی بلا آتی ہے تیرے بار بار آرے
پیری میں کٹ گئی سب افسوس زندگانی
دیکھی کبھی نہ ہم نے ہوتی ہے کیا جوانی

طوالت کے خوف سے انہیں اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ جیسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ہماری شاعری میں کسی خاص شاعر کے کلام سے اس کی زندگی اور خیالات کے متعلق، بہت کم مواد دستیاب ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ شاعری رسمی اور تقلیدی

ہے۔ اور اس منزل سے عموماً ہر زبان کی شاعری کو گذرنا پڑتا ہے —

ہم کو معلوم ہے کہ آگاہ بڑے جید عالم اور ارشاد و ہدایت کے بھی مرکز تھے ان خصوصیات کی جھلک ان کے کلام میں کہیں کہیں نظر آ جاتی ہے چنانچہ دیوان میں ہم کو بہت سے اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں آگاہ نے معرفت اور تصوف کا اظہار کیا ہے۔ ذیل کی چند مثالیں خاص نقطہ نظر سے ملاحظے کے قابل ہیں :—

ہر گز وجود میں تو شریک آپ کو نجان
تقصیر یہ تری نہ کبھی ہوے گی معاف

دنیا ہے گندہ پھر کہ صحبت ہی اس کی زہر
نا بالغوں کی نگیں نظر آتی ہے نو عروس

ہے یار کا میرے سینہ میں بود و باش ہنوز
عجب ہے پھر مجھے اس کی ہے کیوں تلاش ہنوز

جلوہ اس کا نہ رکھا کوئی تعین باقی
وہم باطل کا مگر ہم کو ہے پندار ہنوز

غزلوں میں ارشاد و ہدایات کا فطری رنگ بھی کہیں کہیں نمایاں ہو گیا ہے۔ کہیں کہیں اپنی قوت شاعری سے متاثر ہو کر شعرائے پیشین سے بھی اپنا مقابلہ کیا ہے —

اگرچہ یہ سخن ہندی ہے آگاہ
نہ کر سکتا ہے ہر فہم اس کو ادراک

ہر مصرعہ رسا میرا طوبی سے ہے قریں
کافعے پہ ہی دھر فلک کے علم مرا

قطعات کے بعد اصناف سخن سے دیوان کو مکمل کرنے کے لئے مختلف

صنایع و بدایع کے نمونے پیش کئے گئے ہیں ۔ یہاں نظم کا عنوان یہ ہے ۔ "دوارتھی بر طریق صنعت ابو قلموں دور عربی آفر استخدام مظہر گویند" اس کا نمونہ یہ ہے ۔ —

تن سے روح سے کیوں منتقل ہے　　　　یعنی ہمارا
من وحشت سے کیوں بیکل ہے　　　　جواب ۔ نار نہیں

دوارتھیوں کے ختم پر میر شمس الدین فقیرؔ نے تتبع میں فارسی کہت ، پھر سو یہ بھی لکھے ہیں ، ریختے میں بھی کئی کہت لکھے ہیں ۔ نمونۃً یہاں ایک درج کیا جاتا ہے :—

کیوں دیکھ سکے کوئی اس کو جو سوم کرے پھرا من سے
تب بر میں آ سکتا ہو جو تک نہ ملے مرے تن سے
دامن کو ہر اس کے منہ سے وہ گل کو اس کے تن سے
کچھ بھی تو نہیں آگہ اوس سے جو کہا ہوں میں ہے سب فن سے

———

کہت بھی کئی طرح کے ہیں ، جن میں سے قابل ذکر یہ ہیں —

(۱) "کبت در زبان ریختہ بر چہارپایہ بیت ریسی کبیر کہ در صنعت طاق و جفت پلچھہ گفتہ و این صنعت در عربی و ہندی مشترک است" —

(۲) "کبت در تعریف سکیا نائکہ کہ ترجمہ اش چنانچہ شرمگیں باشد" —

(۳) "کبت از زبان با سکسجیا نائکہ یعنی قدوم محبوب" —

(۴) کبت از زبان دھیرا نائکہ —

حسب ذیل سرخیں بھی قابل توجہ ہیں

(۱) ست آبھسار کانایکہ یعنی کسیکہ در شب ماہ سوئے محبوب رود

(۲) سیام آبھسار کانایکہ یعنی کسیکہ در شب تار سوئے محبوب رود

فردوس سی ہو گیا ہے دم دل کشا ترا
آگاہ تری طبع کو ہے فیض روش طوس

شعر کی گرچہ قلمرو کو میں چھوڑا آ کاہ
عرب و ہند و عجم میں ہے سرا داب ہنوزہ
گرچہ نہیں کچھہ سخن ہمارا
کیا تجھہ سے بھی اے ولی گئے ہم

لام کی ردیف میں ایک شعر حیدرآباد دکن کے متعلق بھی موجود ہے - یہ عجیب با معنی شعر ہے ' ہمارے لئے اس کی حیثیت ایک تاریخی ہے —

اُلفت اہل بہت سے آ کاہ حیدر آباد ہو گیا ہے دل

غزلیں ورق ۱۲۷ ب پر ختم ہوتی ہیں - آخری غزل کا مطلع اور مقطع یہ ہے —

زلف سیاہ کی نوے ہے کیا بکتا کہانی
دشوار جس سے ہوتی ہے دن رات نیند آنی
جب قدر داں سخن کا تیرے ہے عشق آ کاہ
کیا غم ہے گر نہیں ہے کوئی اس کی قدر دانی

غزلوں کے بعد " افراد " شروع ہوتے ہیں - پہلا فرد یہ ہے —

دل اپنا ہو گیا پھر آیا شکوہ کروں کس کا اب خدایا

آخری فرد کے ختم ہونے پر رباعیاں شروع ہوتی ہیں رباعیوں کی تعداد (۵۴۱) ہے جن میں متفرق (۴۲) نعت میں (۲۱۹) اور منقبت میں (۱۰۹) ہیں - رباعیات ہی میں ایک دوسری قسم رباعیات مستزاد کی ہے ' جس کا نمونہ یہ ہے —

کس مہر کے جلوے سے سری چشم اوپر حیرت کی ہے دھوم
آنسو کے عوض آنکھہ سے تاحد نظر جھڑتی ہے نجوم

---

* غالباً یہ اس زمانے کا شعر ہے جبکہ آکاہ اپنے استاد ابوالحسن قربی کے انتقال سے منفعل ہو کر شاعری ترک کر کے اپنے کلام کو سپرد آب کردیا تھا —

دل آتش عشق ہوا کس رخ سے کہ یوں جلتا ہے سدا
انداز سے اس قد کے مہری پر محشر کرتی ہے ہجوم

ایسی کل رباعیات صرف پانچ ہیں جن میں سے ایک " طرز بیدل " میں لکھی گئی ہے - رباعیات کے اختتام پر قطعات شروع ہوتے ہیں ' ان کی مجموعی تعداد گیارہ ہے' پہلے قطعے کا پہلا اور آخری قطعے کا آخری شعر یہ ہے —

کہیں میں چاند سے یک رات یہ بات   کہ اے مرات شب تجھسے مصقل

(۳) دو اشعار کا نا یکہ یعنی کسیکہ بروز جانب محبوب " —

نہیں ہی میں ایک ایسی رباعی ہے جو تلنگی زبان میں لکھی گئی ہے اور شاید یہ چیزیں آگاہ ہی کی جدت طبع کے نتائج ہیں ۔ اس سے پہلے اس قسم کی نظموں کا حال نہیں سنا یہ رباعی بذات خود دلچسپ ہے اس لئے یہاں نقل کی جاتی ہے —

یاداو سوتا نیلقکو پویلدی   نادھیا تم نا پرانہ اکڑا اوندی
ی واکتہ کہنتہ پوی کوسی دوسی   مبارک اروایم پور کوسندی

ایک فرد بھی نئی طرح کا ہے جو زبان اروی میں لکھا گیا ہے —

رن آشی پدوپولی سلی ارکد واہری   نیانکو و جاں تم سینی ردویارم

دیوان دھروں پر ختم ہوتا ہے جو کئی مضامین پر مشتمل ہے - آخری دھرہ یہ ہے۔

چشم لال کی جگلیے سے نہیں ہوتے ہیں لال   عکس آنسو کا میرے وہاں کی ہے اپلی چال

معصومیت

از

(جناب اختر شیرانی صاحب ایڈیٹر "بہارستان" لاہور)

لیلیٔ شب کے پریشاں ہیں گیسوے سیاہ
شورش آباد جہاں ' تیرہ و تار
فتنہ برساتی ہے مخمور ستاروں کی نگاہ
نیند میں غرق ہے سارا کہسار
چارسو ' چھاگئی خاموشی و ظلمت کی سپاہ
نور و آہنگ نے لی راہ فرار
لیلہ کی سیج سے جاگ اٹھا ہے خوابیدہ گناہ
شہر خونخوار ہو جیسے بیدار

رات کے پردوں میں آباد ' سیہ خانے ہیں
تیرہ و تار ' مہیب اور خونریز
ذوق عصیاں کے بھبھکتے ہوئے میخانے ہیں
تہ ظلمات میں شورش انگیز
معصیت کاری کے بپھرے ہوئے مستانے ہیں
روح دوشیزگی سے گرم ستیز

اس کے فولاد کوں پنجوں میں جو پیمانے ہیں
خون عصمت سے ہیں یکسر لبریز

چار سو سوزش [illegible] حشر سیہ کاری ہے
تند و ہنگامہ [illegible] فتن [illegible] طوفانی
ہر [illegible] انسانی پہ [illegible] کنہ طاری ہے
[illegible] کوں [illegible] [illegible] ہیجانی
ہر [illegible] [illegible] سیل بلا جاری ہے
سورش [illegible] انگیز [illegible] طغیانی
[illegible] سامان سیہ [illegible] و [illegible] سازی ہے
[illegible] [illegible] کہ [illegible] انسانی

یہ جہاں [illegible] [illegible] وہاں [illegible] ہے
[illegible] رنجوں [illegible] گھبرائے ہوئے
اور [illegible] ستم ایجاد پہ دوڑاتی ہے
فرط [illegible] سے گھبرائے ہوئے
عالم سوگ میں مبہوت سی رہ جاتی ہے
اشک غم آنکھوں میں چھلکائے ہوئے
چاندنی سی [illegible] نور سا برساتی ہے
سینۂ [illegible] پہ لہرائے ہوئے

فلک حسن کا گم گشتہ ستارہ کہئے
جس سے روشن ہے فضائے [illegible]

جنت قدس کا آوارہ نظارہ کہیئے
جس سے رنگیں ہے ہوائے صحرا
بحر رعنائی فطرت کا کنارہ کہیئے
جس سے ہے مست ادائے صحرا
جذب موسیقی کا اک نقش دلارا کہیئے
نغمۂ روح فزائے صحرا

اک فرشتوں کے سے لہجے میں وہ کرتی ہے خطاب
آہ وہ لہجہ حزیں و غمناک
کہ تم اے راہزن عفت و آوارہ شباب
سر خوش و بیہودہ و مست و ناپاک
تم جو عصمت کا لٹاتے ہو یہ در نایاب
کر کے دامان تقدس کو چاک
یہ وہ جوہر ہے جسے مہر و نجوم و مہتاب
رشک سے دیکھتے ہیں اور افلاک

ہاں یہ اک جاذبۂ فطرت ربانی ہے
اور دنیا کی مثالوں سے بری
عالم قدس کا اک جوہر نورانی ہے
روشن از جلوۂ نجم سحری
اس گنہ زار میں بہر دل انسانی ہے
بہ تراز مریمئی حور و پری
روح قدرت کا یہ اک جلوۂ عرفانی ہے
یا الٰہیت ذوق بشری

یہ وہ نشہ ہے کہ ایسا کسی صہبا میں نہیں
روح نکہت صہبا کی قسم
یہ وہ موتی ہے کہ ایسا کسی دریا میں نہیں
قعر تاریکیء دریا کی قسم
یہ وہ تابش ہے کہ جو حسن ثریا میں نہیں
نور رخسار ثریا کی قسم
یہ وہ لذت ہے کہ جو الفت سلمیٰ میں نہیں
جذبۂ الفت سلمیٰ کی قسم

ذرے ذرے میں ہے اک روحِ حقیقت مستور
اور ہر ذرے کی قسمت ہے وہی
سینۂ شمع میں ہے سوز محبت مستور
شمع پر سوز کی فطرت ہے وہی
غنچے کے دل میں ہے اک جذبۂ نکہت مستور
غنچے کی سرمدی صورت ہے وہی
ہے جوانی میں یونہی جلوۂ عصمت مستور
اور جوانی کی حقیقت ہے وہی

مہ تابندہ جو محروم لطافت ہو جائے
نام اس کا مہ تاباں نہ رہے
روشنی صبح درخشاں کی جو غارت ہو جائے
صبح پھر صبح درخشاں نہ رہے

شام سے دور اگر شام کی رنگت ہو جائے
شام، شام شفق افشاں نہ رہے
گر جوانی یونہی بیگانۂ عفت ہو جائے
لائق پیکر انساں نہ رہے

ساز کے پردے میں بیتاب، گر آواز نہ ہو
ساز، پھر ساز نہ کہلائے کبھی
دل نکہت میں اگر جذبۂ پرواز نہ ہو
صحن گلشن کو نہ مہکائے کبھی
گل میں گر ذوق نمو پردہ برانداز نہ ہو
گل، گلا ہوں تو نہ کھلائے کبھی
گر جوانی میں بھی تقدیس کا انداز نہ ہو
وہ جوانی نہ نظر آئے کبھی

مئے رنگیں سے اگر نشۂ و لذت چھن جائے
سادہ پانی ہے وہ یا موج شراب؟
ماہ تاباں سے اگر نور و لطافت چھن جائے
تودۂ خاک ہے وہ یا مہتاب؟
گل رعنا سے جو رنگینی و نکہت چھن جائے
سوکھی پتی ہے وہ یا برگ گلاب؟
جس جوانی سے کہ رنگینی عفت چھن جائے
اک پھوڑی ہے وہ یا حسن شباب

غرض شاعستۂ ذوق جوانی یہ ہے
نہ ہوا ہی نہ تقاضی جائے
نئی بہاریں ہی ہوں کی نشانی یہ ہے
مدتوں تک وہ چھپائی جائے
عصمت اور اس کے مظاہر کی کہانی یہ ہے
جا دو ہوں و ہ سنائی جائے
مذہب سحر کی اوہام فشانی یہ ہے
عصمت خوب بڑھائی جائے

سب تک لائے کمر ہو! یہ عالم غفلت کب تک؟
اور یہ نفس پرستی تا چند؟
دو جہانوں میں یہ دورۂ وحشت کب تک؟
دل میں یہ جذبۂ پستی تا چند؟
روح اور دل تاریکئ ذات کب تک؟
اور یہ جذبات کی مستی تا چند؟
یہ شہوات اور یہ بربادئ عفت کب تک؟
ہاں گناہوں کی یہ بستی تا چند؟

روح کے گل کدے ویراں ہوئے جاتے ہیں!
عظمت کاری کے سہلے مسکن!
دل کے شورش کدے سنساں ہوئے جاتے ہیں!
اور جذبات صفا کے مدفن!

ذوق بیگانۂ عرفاں ہوئے جاتے ہیں!
اور ملزن کہ صدا اور یہی!
جو تھے انساں وہ حیواں ہوئے جاتے ہیں!
آہ! او سفلگئی چرخ کہن!

آئے گا ایک دن آئے گا کہ شرماؤ گے تم
اور میں ہاتھوں سے نکل جاؤں گی
عالم ہجر میں میرے لئے گھبراؤ گے تم
اور میں بھی صورت نہ دکھلاؤں گی
پچھلی بد ذوقیوں کو ذہن میں جب لاؤ گے تم
شرم بن کر تمہیں شرماؤں گی
یاد کر کے مجھے پھر روؤ گے پچھتاؤ گے تم
میں مگر ہاتھ نہیں آؤں گی!

ترچھی نگاہیں

از

(جناب محمد یٰسین صاحب تسکین سرونجی)

(۱)

رگوں میں ہوش کروٹ لے رہا ہے بجلیاں بن کر
عجب اک بیخودیٔ شوق مجھ پر چھائی جاتی ہے
کھنچی آتی ہے گویا روح بھی اب جسم سے باہر
تری مستی بھری ہستی پہ غالب آئی جاتی ہے
ارے ترچھی نگاہوں سے نہ دیکھو او دیکھنے والے!

(۲)

یہ آنکھیں ایسی نشیلی اور پھر اتنی حسین آنکھیں!
کہ جن پر جلوہ ہائے صبح بھی صدقے اترتے ہیں
زہے جذب و کشش! ہیں کس قدر نور آفریں آنکھیں
ستارے جن کے آگے آسماں پر سجدہ کرتے ہیں
ارے ترچھی نگاہوں سے نہ دیکھو او دیکھنے والے

(۳)

یہاں کم ظرف ہائے یہ طرز خلش ریزی!
نہ ہوتی ہوں تمنائیں تو اب دشوار ہو جائیں

تبصرے

ادب

تاریخ

متفرق

اُردو کے جدید رسالے

ادب

پیام روح

(مجموعۂ کلام جناب حامد اللہ صاحب "افسر" - مطبوعۂ انڈین پریس الہ‌آباد - قیمت تین روپیے -)

یہ حامداللہ صاحب افسر کے کلام کا مجموعہ ہے جس کا نام "پیام روح" رکھا ہے - اس میں ان کا پورا کلام ہے - کچھ تو لڑکپن کے زمانے کی نظمیں ہیں اور بعد کی - نظمیں مختلف مضامین پر ہیں اور ان سے شاعر کے تخیل اور درد دل کی کیفیت معلوم ہوتی ہے - بعض نظمیں جو حب وطن کے جوش میں لکھی ہیں خوب ہیں، ایسی نظموں میں وہ ہندی الفاظ بڑے سلیقے سے لکھ جاتے ہیں۔ تھوڑی سی غزلیں بھی ہیں لیکن ان کا رنگ بھی جدا ہے - غزل میں مولانا حالی نے قدیم رنگ سے کسی قدر الگ ہو کر خاص بات پیدا کی تھی، اس کا تتبع جناب افسر نے بھی کیا ہے—

یہ مجموعہ ہماری جدید شاعری کا بہت اچھا نمونہ ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تعلیم کا اثر رائگاں نہیں گیا - افسر صاحب ہمارے نوجوان شاعروں میں بہت قابل قدر ہیں اور امید ہے کہ ان کا کلام شوق سے پڑھا جائے گا - کتاب کے چھاپنے میں خاص اہتمام کیا گیا ہے - کاغذ بھی اعلیٰ درجے کا لگایا گیا ہے، کاش خط بھی ایسا ہی اچھا ہوتا - -

---

آنند مٹھ

(مصنفہ بنکم چندر چٹرجی ' مترجمہ ڈاکٹر گوکل چند نارنگ ایم - اے - پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا ، پرکاش مندر - یوسف سرجورہ - ضلع سورتھ - صفحات ٢١٥ '
قیمت ایک روپیہ — ١

—

یہ کتاب بنگالی کے مشہور ناول نویس اور ادیب بابو بنکم چندر چٹرجی کی تصنیف ہے [illegible] انیسویں صدی میں [illegible] بنگال میں سنیاسیوں کے گروہ کے باغی ہونے [illegible] مصنف نے حب وطن کا رنگ دے کر یہ ناول لکھا ہے - یہ وہی مشہور ناول ہے جس میں بندے ماترم کا گیت ہے جو آج ہندوستان کا [illegible] اس میں [illegible] مسلمانوں اور مسلمانوں کی راج کی خوب مذمت [illegible] کی ہے اور انگریزوں کی حکومت کو سراہا ہے - سنیاسیوں کی لڑائی کا اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت [illegible] انگریزی راج قائم کریں - ذیل کے جملوں سے کتاب کی اصل غایت پر روشنی پڑتی ہے —

ہم تمہارا مقصد [illegible] ہم صرف مسلمانوں کی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں [illegible] کے دشمن ہیں " —

" انگریز ہندوستان کی حفاظت کے لئے آئے ہیں " —

" شعر ہے [illegible] رادھا مادھو [illegible] مندر میں جائیں گے " —

" جب تک ہندو [illegible] ہو گئے ، انگریز کا [illegible] کتنی [illegible] اور ہر ایک آزادی [illegible] اپنے مذہب کو پورا کرے گا "

" دشمن کون ہیں ؟ دشمن [illegible] انگریز دوست ہیں " —

دوسری [illegible] ملک کی نجات [illegible] ہیں —

ناول پر جوش ہے ، ہندو حب وطن سے لبریز ہے لیکن جس گروہ کے ذریعہ حب وطنی کا اظہار کیا گیا ہے [illegible] ناول سے مصنف کا کمال ظاہر ہوتا ہے - بعض [illegible] بھی خراب دکھائی ہے - ترجمہ اچھا اور صاف ہے لیکن زبان کے محاورے پر پنجابی رنگ غالب ہے - ناول دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے —

سازِ نو

(مجموعهٔ نظم تصنیف پروفیسر محمد اظہر صاحب مظہر ایم - اے
کتب‌خانهٔ مقبول عام ، ریلوے روڈ ، لاہور)

پروفیسر مظہر صاحب کو ابتدا سے فارسی زبان سے طبعی ذوق تھا ، ایران کے سفر نے اس میں چار چاند لگادئے - یہ مجموعہ فارسی نظموں کا اُن کی فکر لطیف کا نتیجہ ہے - فارسی زبان پر اُنھیں پوری قدرت ہے اور ان کے اشعار کی فصاحت اور خوبی اس کی شاہد ہے - جو صاحب فارسی کا ذوق رکھتے ہیں اُن کے لئے مظہر کا کلام بہت لطف انگیز ہوگا - آخر میں ایک اُردو نظم بھی ہے جو قاآنی کی طرز میں کہی ہے —

محاورات اُردو

(مرتبهٔ اندرجیت شرما صاحب مینیجر اسکول بک ڈپو ، ماچھیواڑہ -
صفحات ۱۰۰ ، قیمت آٹھ آنے)

یہ چھوٹی سی کتاب مؤلف نے طالب علموں کے لئے لکھی ہے - اس میں ضروری اور عام محاورے موجود ہیں اور ہر محاورے کے لئے کسی نہ کسی استاد کے کلام سے سند بھی دی ہے —

محاورے کے معاملے میں اکثر یہ غلطی ہوتی ہے کہ معمولی الفاظ یا جملوں کو اور بعض اوقات ایسے جملوں کو جو استعارۃً استعمال ہوئے ہیں ، محاورہ قرار دیکر لکھ دیا جاتا ہے - چنانچہ اس کتاب میں بھی بعض بعض مقامات پر یہ غلطی پائی جاتی ہے - مثلاً آرزو ہونا ، پارہ پارہ ہونا ، تلک طرف ، دن گئے ، وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہیں ہم ، عرش سے فرش تلک ، قرض ادا کرنا -

یہ تمام مرکبات لغوی اور معمولی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں ، انھیں محاورہ قرار دینا صحیح نہیں - " دن گئے " کوئی محاورہ نہیں ، غالب کے مصرعے سے یہ دو لفظ اٹھا کے جوں کے توں رکھ دئے ہیں -

اسی طرح بعض محاوروں کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے - مثلاً " آنکھوں میں

بھی جاتا"۔ اس کے معنی لکھے ہیں ضبط کرنا، خاموش ہو رہنا۔ کسی مرغوب شے کو آنکھوں سے چپ چاپ دیکھتے رہنا۔ اصلی محاورہ "پی جانا" ہے۔ اور اس کے معنی ضبط کرنا ہے دوسرے معنی جو اس میں لکھے ہیں وہ مولف نے آتش کے اس شعر سے پیدا کئے ہیں؛

تجھ کو دیکھا ہوں تو لیتے ہیں یہ مفلس
آنکھوں میں مضمون رخ کو پیے جاتے ہیں مست

آتش کے یہاں بعض یہ جملہ استعارۃً استعمال کیا ہے؛ یہ کوئی محاورہ نہیں ہے۔ "آگ جیسی بات ہونا" محاورہ نہیں بلکہ "آگ کی سی بات ہونا" محاورہ ہے۔ یہ غلطی انہوں نے ... ہوئی ہے۔ ... کوئی ... کے ... بھی ہوا محاورہ نہیں ہوا۔

"پھونک پھونک پاؤں دھرنا یا قدم رکھنا" "پھونک پھونک کر ..." ہونا چاہئے —

"پھر کے رہ جانا" محاورہ نہیں "پی جانا" "ہونا چاہئے" "خشک دماغ" کوئی محاورہ نہیں اور نہ اس کے معنی ... کے ہیں ... اس ... یہ معنی نکالے ہیں ... میں لکھا گیا ہے —

"مالک ہونا" محاورہ نہیں ہے بلکہ "... وغیرہ ... ہونا" امید ہے کہ آئندہ طبع کے وقت اس قسم کی غلطیوں کی اصلاح کر دی جائے گی۔

کلیات وفا

(کلام حکیم محمد ہادی خاں صاحب وفا رامپوری قیمت دو روپے۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی)

وفا مرحوم قادر الکلام شاعر تھے اردو ... کی طرز پر خوب لکھتے تھے۔ اس مجموعہ میں ان کا اردو اور فارسی کلام جمع کیا گیا ہے۔ شروع میں چند اصلاحات بھی ہیں جن سے ان کی اور جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے قدیم طرز کے لکھنے والوں میں وفا کا کلام بہت غنیمت اور قدر کے قابل ہے —

قتالی کا جوگ

(جناب حامداللہ صاحب افسر بی۔ اے۔ انڈین پریس۔ الہ آباد)۔

یہ کتاب مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جو اس سے قبل مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ بعض افسانے بہت دلچسپ ہیں —

واقعات عالم

(از تصنیف الحاج خطیب نادر بادشاہ صاحب
متخلص بہ "بادشاہ" مرحوم۔ قیمت چار آنے)۔

کتاب کے نام سے دھوکا ہوتا ہے۔ یہ دراصل خطیب صاحب مرحوم کے قطعات تاریخی کا مجموعہ ہے۔ تاریخی مادے اچھے اچھے ہیں۔ خطیب صاحب مدراس کے مشہور شاعروں میں تھے اور ہر قسم کی نظمیں اُن سے یادگار ہیں —

تاریخ

سفیر اودھ

(خود نوشتہ حالات مولوی محمد مسیح الدین علوی خاں بہادر مرحوم مطبوعہ النّاظر پریس لکھنؤ۔ قیمت ایک روپیہ۔ انجمن ترقی اُردو سے بھی مل سکتی ہے)

مولوی مسیح الدین علوی کاکوری کے رہنے والے تھے۔ صاحب علم و فضل تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں معزز عہدوں پر رہے اور اس زمانے میں خطاب خانی و بہادری سے سرفراز ہوئے۔ اس زمانے میں یہ خطاب بہت ہی کم لوگوں کو ملتا تھا۔ انتزاع سلطنت اودھ پر بادشاہ کی طرف سے سفیر ہو کر انگلستان گئے اور وہاں اُن

کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ انگلستان پہنچ کر انہوں نے بادشاہ کے لئے بہت کچھ کوشش کی مگر اسی وقت ہندوستان میں شورش برپا ہوگئی جو عام طور سے غدر سنہ ۵۷ ع کے نام سے مشہور ہے۔ ... سارا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا اور وہاں انہیں بڑی بڑی تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھانی پڑیں پھر لندن انگلستان سے حج کو گئے اور حج سے فارغ ہو کر ... پہنچے مولوی صاحب مرحوم بہت باوضع صاحب استقلال اور صاحب علم شخص تھے اور اپنی لیاقت اور ذہانت کے باعث ہمیشہ مورد عزت و حرمت رہے انہوں نے ... اپنی تصنیف ... اور انگلستان میں سفارت کا ذکر ہے تمام ... عبارت میں نہیں قدیم رنگ پایا جاتا ہے ۔

جمال الدین افغانی

(مجلۂ اسلامیہ، دکنی، فہرست ۸ آیہ)

سید جمال الدین افغانی کے نام سے بہت سے لوگ واقف ہیں مگر ان کے حالات سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ چنانچہ مجلۂ اسلامیہ دکن نے یہ رسالہ شائع کر کے بڑا کام کیا ہے۔ سید صاحب اپنے زمانے کے بہت بڑے مجدد اور مصلح ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے اسلامی سلطنتوں کی ابتری اور انحطاط اور یورپی اقوام کی تیاریوں کو سمجھا اور اپنی سی پوری کوشش ممالک اسلام کے اتحاد اور مدافعت کے خطرہ سے بچانے میں صرف کی ... تھے نہایت بہادر اور نڈر عالی حوصلہ، صاف گو اور بہادر شخص تھے۔ استبداد کے سخت دشمن اور آزادی و جمہوریت کے قائل تھے۔ ان کی تقریر میں جادو کا سا اثر تھا اور اسی طرح ان کی تحریر بہت ... اور پر اثر ہوتی تھی۔ ایران، مصر اور ترکی کے بیدار کرنے میں انہوں نے بڑی جد و جہد کی۔ اگرچہ وہ پوری کامیاب نہ ہوئے مگر جو بیج انہوں نے بویا وہ رائگاں نہ گیا۔ پروفیسر براؤن نے ان کی سیرت کے متعلق کس قدر سچ لکھا ہے کہ "یہ بزرگ شخص ایک زبردست سیاح اور عالم تھا اور باوجود اس کے کہ دولت دنیا میں سے قدیم زبان و قلم، وسیع علم، سیاسی فہم و فراست، معلومات متعلقہ اور اسلام کے لئے (جس کے انحطاط کو وہ دل میں محسوس کرتے تھے) سچے عشق کے سوا اس کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ ہم یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے اور حرف بحرف صحیح ہے کہ انہوں نے بادشاہوں کے تخت و تاج ہلا دیے تھے، اور مدبرین

یورپ کی بعض معتقدہ تجاویز کو درہم برہم کردیا تھا ۔ انہوں نے اُن غیر معمولی قوتوں کو استعمال کیا جن کی جانب مشرق و مغرب کے سیاست دانوں میں سے کوی شخص بھی ملتفت نہ ہوا تھا اور نہ کبھی ان سے فائدہ اٹھانے کا خیال کسی کے ذہن میں آیا "۔

اگرچہ اس سے قبل اُردو میں بعض مضامین مختلف رسالوں میں سید جمال الدین مرحوم کے متعلق شائع ہوے لیکن ان کے حالات میں اس سے بہتر کوی کتاب نہیں لکھی گئی ۔ ہر محب وطن کو نیز ہر شخص کو جو اس زمانے کے حالات سے با خبر رہنا چاہتا ہے یہ کتاب پڑھنی چاہئے —

عربوں کا تمدن

(مصنفہ ڈاکٹر جوزیف ہیل مترجمہ سید نذیر نیازی صاحب بی ۔ اے (جامعۂ ملیہ ؛ صفحات ۱۹۳ ۔ قیمت دو روپے مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی) —

یہ کتاب بہت دلچسپ اور مفید ہے ۔ سید نذیر نیازی صاحب نے ڈاکٹر صلاح الدین خدا بخش کے انگریزی ترجمے سے اس کا اُردو ترجمہ کیا اور دوران ترجمہ میں اصلی کتاب بھی پیش نظر رہی ہے ۔ اس مبحث پر اُردو میں بہت کم کتابیں ہیں ۔ جرمن فاضل نے جس نظر سے اس مضمون پر بحث کی ہے وہ قابل داد ہے ۔ گو یہ کتاب مکمل اور مفصل نہ ہو لیکن پڑھنے والا اس سے بہت کچھ مستفید ہوسکتا ہے اور اس کی نظر میں عربی تمدن کا پورا خاکہ آجاتا ہے ۔ اس قسم کی کتابیں اس لئے بھی مفید ہیں کہ وہ اس قسم کے مضامین پر لکھنے کے لئے رہنمائی کا کام دیتی ہیں اور ان سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ۔ فاضل مترجم نے آخر میں ایک ضمیمہ بھی شامل کردیا ہے جس میں کتاب کے بعض مضامین پر حواشی درج ہیں ۔ ترجمہ بھی اچھا ہے —

ذکریٰ

(از خواجہ محمد عبدالحی فاروقی صاحب استاد تفسیر و ناظم دینیات جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی صفحات ۲۷۲ قیمت تین روپے) —

خواجہ محمد عبدالحی صاحب کی تفسیر قرآن کے کئی حصے شائع ہوچکے ہیں - یہ پارۂ عم کی تفسیر ہے - مولانا نے جو اصول اپنی تفسیر کا رکھا ہے اس سے عالم و عامی سب مستفید ہوسکتے ہیں - اس میں بہت سے حقائق پر بھی بحث آگئی ہے - اس زمانے کے لئے یہ تفسیر بہت قابل قدر ہے —

یورپ کا دستور حکومت حصۂ اول

(تالیف مولوی سید محمد شفیع بی - اے ' بی ایل
قیمت ۸ آنے - دارالاشاعت امرت ... پٹنہ بہار و اڑیسہ) —

اس کتاب میں فاضل مؤلف نے بیسویں صدی کی دستوری تبدیلیوں اور جرمنی ' فرانس ' اٹلی اور روس وغیرہ کے دستور حکومت کا حال بیان کیا ہے - اگرچہ کتاب مختصر ہے لیکن مفید ہے -

---

سلاطین معبر

مولفہ جناب حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب صفحات
۳۴ مطبع آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ) —

یہ کتاب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی فرمائش سے حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب نے عربی ' فارسی انگریزی کی مستند اور معتبر ماخذوں سے تالیف کی ہے - اس میں ساحل کارومنڈل کی فرمانروا رہی ہے اس اسلامی سلطنت کا تاریخی حال ہے - اگرچہ کتاب مختصر ہے مگر معلومات سے پر ہے اور بہت سی تاریخی کتابوں کا عطر ہے —

قوم پرست طالب علم

(مولفہ محمد عبدالغفار صاحب مدہولوی مدرس مدرسہ جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی قیمت ۴ آنے)—

یہ چھوٹا سا ڈراما طالب علموں کے لئے اچھا ہے۔ محمد عبدالغفار صاحب میں ڈراما لکھنے کی صلاحیت معلوم ہوتی ہے اور امید ہے کہ آئندہ ایسے ڈرامے لکھیں گے جو مطول بھی ہوں اور موجب اصلاح بھی ہوں۔ اس ڈرامے میں انہوں نے آج کل کی سیاسی اصلاح اور کش مکش کا ایک پہلو دکھایا ہے جو فرصت کے وقت پڑھنے کے لئے اچھا خاصا ہے—

القابلہ

(مولفہ جناب حکیم محمد یوسف صاحب نیر۔ صفحات ۴۲۴ قیمت دو روپئے۔ دفتر المسیح، قرول باغ۔ دہلی)

حکیم محمد یوسف صاحب عالم و شاعر ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کے طبیب بھی ہیں۔ اس سے قبل فن طب پر اُن کی کئی کتابیں شایع ہوچکی ہیں۔ یہ کتاب "القابلہ" حال ہی میں دفتر المسیح سے چھپ کر شایع ہوئی ہے۔ اس مضمون پر اُردو زبان میں اس سے جامع اور بہتر کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ علاوہ فن کے بڑی خوبی حسن زبان کی ہے۔ تمام مضامین عاقلہ اور قابلہ کے باہم گفتگو میں ایسے موثر اور دلچسپ پیرایے میں بیان کردئے ہیں کہ فن سے ناواقف شخص بھی اسے شوق سے پڑھ سکتا ہے۔ حکیم صاحب نے طبقۂ نسواں پر بڑا احسان کیا ہے۔ معمولی پڑھی لکھی عورتیں بھی اسے پڑھ کر فائدہ حاصل کرسکتی ہیں اور بہت سی آفتوں سے بچ سکتی اور دوسروں کو بچاسکتی ہیں۔ غالباً اس خیال سے اس ضخیم کتاب کی قیمت بھی کم رکھی گئی ہے—

جدید انگلش ٹیچر

(از جناب صدیق الحسن خاں صاحب۔ صفحات ۲۷۹
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ملنے کا پتہ: ... شملہ)

عموماً بچوں کو انگریزی صرف و نحو کا حصہ رٹایا جاتا ہے جس کی وجہ سے طالب علم کا یہ صرف ونحو قائم ہوتا ہے کہ ... ذہنی قوت دماغی کو بھی نقصان پہنچتا ہے ... کے قواعد سے کسی قسم کا عملی فائدہ نہیں اٹھا سکتا اس کی تعلیم نے انگریزی زبان میں اظہار خیالات کی قوت بھی پیدا نہیں کی صرف ... حافظہ پر بار ڈالا جاتا ہے

ان حالات کو مدنظر رکھ کر مولوی صدیق الحسن خاں صاحب نے جو طلبہ کی مشکلات اور ضروریات سے بخوبی واقف ہیں اپنی ذاتی معلومات و تجربہ کی خاطر یہ کتاب تیار کی ہے جس کی حقیقتاً بڑی ضرورت تھی۔ اس میں آسان و دل آویز پیرایہ میں طلبہ کو انگریزی قواعد سے واقف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ فاضل مصنف انگریزی قواعد کو اصول فطرت کے مطابق سکھانا چاہتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس مقصد میں انہیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے—

ایک امر جو مصنف صاحب کی توجہ کا محتاج ہے یہ ہے کہ اگر ہر بیان کے خاتمہ پر تعریف بھی آسان الفاظ میں لکھ دی جاتی تو طلبہ سبق کے خلاصہ سے پوری طرح واقف ہوجاتے۔ اس طرح سے طالب علم نہ صرف مثالوں اور مشقوں سے واقف ہوتا بلکہ تعریف بھی اس کے ذہن نشین ہوجاتی۔ امید ہے کہ فاضل مصنف کی یہ پہلی کوشش بار آور ہوگی اور اس کی قدردانی ان کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوگی—

لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے اور کتاب املا اور عام غلطیوں سے مبرا ہے—

متفرق

کوہستان کانگڑہ کی دلفریب وادی۔

یہ خوبصورت رسالہ نارتھ ویسٹرن ریلوے کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ خوشی کی بات

ہے کہ ریلوے کی طرف سے اردو میں ایسی خوش‌نما اور پاکیزہ کتاب شایع کی گئی ہے - اس میں وادی کانگڑہ کے جغرافی ' معاشیاتی اور دیگر حالات ایسی اچھی اور ستھری زبان میں لکھے ہیں کہ دل خواہ مخواہ وہاں کی سیر پر راغب ہونے لگتا ہے - کانگڑہ ویلی ریلوے حال ہی میں کھلی ہے اور امید ہے کہ مقامات کی دلفریبی کی وجہ سے یہ لائن آیندہ چل کر بہت مقبول ہوگی - کاغذ ' چھپائی اور خط نہایت عمدہ ہے اور کتاب کئی خوبصورت تصویروں سے آراستہ ہے - نارتھ ویسٹرن ریلوے کے ایجنٹ صاحب اور منتظمین قابل مبارک باد ہیں —

اردو کے جدید رسالے

اردو کے رسالوں میں بڑا بڑ ترقی ہو رہی ہے ' اگر ایک بند ہو تا ہے تو اس کی جگہ دو نئے آ جاتے ہیں - اس سے معلوم ہو تا ہے کہ پڑھنے والوں کی تعداد اور ان کا شوق بھی ترقی پر ہے - اس سہ ماہی میں ہمارے پاس یہ جدید رسالے پہنچے ہیں —

تاریخ

تاریخ اور آثار قدیمہ کا سہ ماہی رسالہ ہے - اس کے ایڈیٹر جناب حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری ہیں جو تاریخ اور آثار قدیمہ کے بڑے ماہر ہیں اور ان

مباحث پر اس کی نکتہ نگاہیں اور متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ہمارے ناظرین اس سے خوب واقف ہوں گے اس سے وہ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ رسالہ کس پایہ کا ہے؟ [illegible] پرچہ جو ہمارے سامنے ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لائق ایڈیٹر اور اس کے معاونین نے رسالہ کی [illegible] قابلیت سے مرتب کیا ہے اور بہت کا موجب اور [illegible] اس کے [illegible] کئے گئے ہیں [illegible] نے شائقین کے لئے بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ سالانہ چندہ پانچ روپیہ۔

نوشیرواں

یوں تو [illegible] ہر طرف سے اردو اخبارات اور رسالے جاری ہو رہے ہیں لیکن اس رسالہ پر [illegible] کا [illegible] دیکھ کر تعجب ہوا اور خوشی بھی ہوئی۔ [illegible] بلند پایہ [illegible] صحافی [illegible] اردو کے بہت دلدادہ اور [illegible] نام [illegible] یہ اس کی [illegible] اور [illegible] ہے اور [illegible] کی [illegible] ان کے شامل حال [illegible] مستقل [illegible] ادارہ [illegible] تھا [illegible] سے رسالہ کا یہ نام رکھا گیا ہے۔ پہلا پرچہ دیکھ کر ہمیں خوشی نہیں ہوا تھا مگر دوسرے [illegible] اس کی [illegible] امید کہ [illegible] صاحب [illegible] اور [illegible] اور [illegible] ایک اردو کا ایک اچھا رسالہ [illegible] اس [illegible] اس سے بہتر کوئی رسالہ نہیں قابل [illegible] اور [illegible] کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ دوسرے ہی نمبر میں انہوں نے [illegible] کے قابل اہل ادب اور شاعروں کا [illegible] کر لیا ہے۔ [illegible] بھی [illegible] ہے۔ تصویریں بھی ہیں مضمون بھی اچھے ہیں امید ہے کہ چھپائی بھی آئندہ اس سے بہتر ہو جائے گی۔ سالانہ چندہ چار روپیہ۔

میسر

یہ بھی نیا رسالہ ہے۔ لکھنؤ سے نکلا ہے۔ لکھنؤ کی سرزمین خاص رسالوں کے لئے

کچھ راس نہیں ہے - یا تو ایسے رسالے بند ہوجاتے ہیں یا اگر چلتے ہیں تو روتے جھینکتے اور سسکتے ہوئے - یہ رسالہ حضرت ابوالعلاء الناطق مصر اور حکیم اشفتہ معاون کے زیر ادارت انجمن معراج الادب کی جانب سے شایع ہونا شروع ہوا ہے - اس رسالے کا تعلق زیادہ تر اردو شعر و سخن سے ہوگا اور اس میں صرف وہی کلام شایع ہوگا جو اصلی شاعری کا نمونہ ہوگا - رسالے کے مدیر صاحب کو اس زمانے کی شاعری اور مذاق سخن پر سخت اعتراض ہے اور اس لئے اس رسالے کا ایک مقصد اصلاح ذوق بھی ہوگا - خدا کرے وہ اس نیک مقصد میں کامیاب ہوں - سالانہ چندہ چار روپئے —

جام جہاں نما

یہ ماہانہ رسالہ بھی لکھنؤ سے نکلتا ہے اور غالباً اسے یہ تیسرا سال ہے - خاصا ہے ، عام اہل لکھنؤ کے مذاق کے موافق ہے ، کوئی خاص یا امتیازی بات نہیں - شعر و سخن کی چاٹ اس میں بھی ہے - سید افتخر موہانی وارثی صاحب اس کے اڈیٹر ہیں - سالانہ چندہ تین روپے ۸ آنے ہیں —

مقنن

یہ ہفتہ وار قانونی رسالہ ہے جس کے اڈیٹر سید احمد احسن صاحب بی - اے ، ال ال - بی ، میر حسن الدین صاحب بی - اے ، ال ال - بی اور محمد عبدالرحمن صاحب رئیس ہیں اور حیدرآباد دکن سے شائع ہوتا ہے - اس کے پہلے حصے میں ایسے مضامین ہوتے ہیں جن کا تعلق علم قانون سے ہے ، دوسرے حصے میں حیدرآباد دکن کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) اور جوڈیشل کمیٹی کے

حالات اور [illegible] حصے میں عدالت ہائے عالیہ ہند کے نظائر دیوانی و فوجداری [illegible] ہیں —

رسالہ [illegible] مصنف سے مرتب کیا جاتا ہے اور انڈین پریس اور [illegible] چھپتا [illegible] سالانہ چندہ پندرہ روپیہ علاوہ محصول ڈاک ہے

مشاعرہ

یہ ماہوار رسالہ بھی لکھنؤ [illegible] ۱۹۱۹ء [illegible] محمد [illegible] کے اہتمام سے جاری ہوا [illegible] تصحیح [illegible] غزلیات اور [illegible] علاوہ [illegible] مضامین بھی ہوتے ہیں [illegible] شعر و شاعری [illegible] ہوتے ہیں [illegible] حالات [illegible] ہوتے ہیں اور [illegible] شریک ہوتے ہیں [illegible] رسالہ [illegible] کافی [illegible] نکلتا ہے سالانہ چندہ چار روپے ہے [illegible] علوم [illegible] اور [illegible] سالانہ [illegible]

نوٹ: [illegible] قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

انجمن کے مطبوعات

—— (مخزن نکات) ——

یہ اُردو شعرا کا نایاب تذکرہ ہے - مصنفہ شیخ محمد قیام الدین 'قائم' چاندپوری - شروع میں مولوی عبدالحق صاحب بی - اے آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو کا ایک مقدمہ ہے جس میں اس تذکرے پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور آخر میں قائم کے کلام کا انتخاب بھی دیدیا ہے - قیمت فی جلد مجلد ڈیڑھ روپیہ —

—— (ذکر میر) ——

ہندوستان میں کون ایسا صاحب ذوق ہوگا جو اُردو کے خدائے سخن حضرت 'میر' کے نام اور کلام سے نا آشنا ہو ان کے کلام کا پاکیزہ انتخاب عرصہ ہوا کہ انجمن نے شائع کیا تھا جو ملک میں بہت مقبول ہوا - اور کئی بار چھپ چکا ہے - اب خاص اہتمام سے میر صاحب کی یہ نادرۂ روزگار سوانح عمری طبع کی گئی ہے - جو خود انہوں کے پر سوز و گداز قلم کی تراوش ہے - جس میں انہوں نے اپنے حالات زندگی اور اس وقت کی فضا نیز آخری دور مغلیہ کی تصویر نہایت دل کش انداز سے کھینچی ہے - اور انجمن نے اپنے مخصوص و خوش نما ٹائپ میں چھاپی ہے - شروع میں جناب مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ معتمد انجمن کا مقدمہ بجائے خود قابل دید اور کتاب کی جان ہے - جلد خوب صورت حجم ۱۸۰ صفحے قیمت دو روپے —

—— (بزم مشاعرہ) ——

گذشتہ سال ماہ تیر (مئی وجون) میں عالی جناب مہاراجہ کشن پرشاد 'شاد' یمین السلطنت المعالی صدر اعظم [illegible] آصفیہ دکن نے اورنگ آباد میں شرف ورود فرمایا تھا - چنانچہ معتمد کی تشریف آوری پر اور دل چسپ ہنگاموں کے علاوہ ایک نہایت

المشتہر

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل کتابیں سکہ انگریزی میں ہیں —

یہ گلدستہ [illegible] حضرت موصوف کی صدارت میں بمقام [illegible] ہوا - اس مشاعرے کا گلدستہ [illegible] نظم [illegible] دو رنگوں میں طبع کیا گیا ہے - شروع میں جناب [illegible] کی پاکیزہ تصویر اور جناب [illegible] صدیقی کے قلم کا دل پذیر دیباچہ بھی ہے - [illegible] خوب صورت اور شاندار ہے - آخر میں وہ قصائد بھی شامل کردیے گئے ہیں جو اورنگ آباد [illegible] میں پڑھے گئے تھے - [illegible] پسند ارباب ذوق کے لیے [illegible] تعداد میں یہ گلدستہ طبع ہوا ہے - جلد منگوائیے قیمت آٹھ آنے —

—— (تاریخ اخلاق یورپ) ——

اس کتاب کے اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم و تبحر - تحقیق و صداقت کا [illegible] ہے یہ کتاب [illegible] تمدن - اصول اخلاق - مذاہب و خیالات کا مرقع ہے [illegible] - جلد اول مجلد ۳ روپے جلد دوم مجلد دو روپے ۸ آنے —

—— (ہماری شاعری) ——

مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم - اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی نے رسالہ اردو میں شاعری پر ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جو عام طور پر بہت پسند کیا گیا تو اب رضوی صاحب نے اس میں بہت کچھ اضافہ کرکے کتابی صورت میں کردیا ہے - اور انجمن ترقی اردو نے نہایت عمدہ طور پر پوری کتاب دو رنگوں میں (لکھنؤ میں) طبع کرائی ہے [illegible] کپڑے کی خوشنما جلد ہے - حجم دو سو صفحے ' قیمت دو روپے —

—— (کلیات ولی) ——

ولی دکنی کے نام سے کون اردو داں واقف نہ ہوگا - اسے اردو شاعری کا باوا آدم کہتے ہیں اور یہی گویا ہماری شاعری کا قدیم اور مستند ترین علم بردار ہے - اس کا کلام اس زمانے کی زبان اور شاعری کا بہترین اور کامل مرقع ہے --

یہ کلیات جناب ' احسن ' مارہروی نے نہایت محنت اور قابلیت سے مرتب کیا ہے - اور انجمن ترقی اردو کے جدید ترین مطبوعات میں ہے - اب تک ولی کے جو دیوان کہیں کہیں چھپے اور ملتے ہیں - اکثر غلط اور نامکمل ہیں - یہ کلیات ۱۷—۱۸ [illegible] ——— قیمت

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکہ انگریزی میں ہیں)

قدیم، قلمی، نایاب نسخوں سے مقابلہ اور تصحیح کرکے کئی سال کی لگاتار محنت و کاوش سے مرتب کیا گیا ہے —

اس ملک الکلام استاد کا کلیات تقریباً تمام اصناف سخن پر حاوی اور چار سو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ شروع میں مرتب صاحب کا ایک بسیط اور قابل قدر مقدمہ ہے جس میں موصوف نے صاحب دیوان کے حالات و سوانح نہایت تحقیق اور کمال محنت سے فراہم کر کے جمع کئے ہیں اور کلام پر تبصرہ بھی فرمایا ہے —

کلیات کے آخر میں ایک بسیط فرہنگ ہے جس میں ان تمام قدیم، متروک، گجراتی، ہندی، دکنی الفاظ کا حل ہے جو کلام ولی میں جا بجا آئے ہیں۔ آخر میں پونے سو صفحے کا ایک ضمیمہ اختلاف نسخ ہے جو نہایت محنت و عرق ریزی سے مرتب کیا گیا ہے اس میں تمام نسخوں سے مقابلہ کرنے پر جو جو اختلاف نظر آیا ہے، دیوان کی ہر غزل کے نمبر کا حوالہ دے کر بتا دیا ہے۔ یہ ضمیمہ ارباب فن و تحقیق کے لئے خاص طور سے قدر کی چیز ہے۔ اور کئی ماہ کی مسلسل محنت سے تیار ہوا ہے۔ ان تمام خوبیوں کے علاوہ انجمن نے اسے مشہور عمدہ ٹائپ میں مضبوط سفید چکنے کاغذ پر طبع کیا ہے، قابل دید اور اس لائق ہے کہ ہر انگریزی اور قدر دانان اردو کے ہر کتب خانے میں اس کا ایک ایک نسخہ موجود رہے۔ حجم تقریباً آٹھ سو صفحات، قیمت مجلد ۵ روپے غیر مجلد ۴ روپے —

—— (مثنوی خواب و خیال) ——

حضرت میر درد دہلوی (رح) کے چھوٹے بھائی میر اثر کی یہ لاجواب مثنوی نایاب تھی، بہت کوشش کے بعد بھی پتہ نہ چلتا تھا، اردو کی خوش نصیبی سے انجمن ترقی اردو کو دستیاب ہو گئی، اور اسے خاص اہتمام کے ساتھ عمدہ ٹائپ میں اعلیٰ درجے کے کاغذ پر، طبع کی گئی ہے، جس پر انجمن کے فاضل معتمد جناب مولوی عبدالحق صاحب نے ایک زبردست ناقدانہ مقدمہ تحریر فرما کر اس مثنوی کے خصوصیات اور محاسن کو نمایاں کیا ہے۔ یہ نادر مثنوی آج تک ناپید تھی، تذکروں میں کہیں کہیں اس کا ذکر آ جاتا ہے، حضرت میر درد کے اشعار اور کلام کے علاوہ اس میں مصنف کی غزلیں بھی جا بجا آئی ہیں، جو قابل دید اور نہایت لطیف و چٹکیلی ہیں۔ یہ مثنوی اردو میں ایک قابل قدر اضافہ اور انجمن کی طرف سے

اشـــــــــــتہار

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) ان کی قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

قدردانانِ اُردو کی خدمت میں اس سال کا جدید علمی ہدیہ ہے، جلد بھی مضبوط عمدہ اور جدید طرز کی تیار کی گئی ہے ۔ حجم دو سو صفحے سے زائد، قیمت مجلد [illegible] روپیہ

—— (انتخابِ کلامِ میر) ——

ملک الشعرا میر تقی میر کے نام اور کلام سے کون قدردانِ اُردو واقف نہیں؟ یہ انہوں کے کلام کا بہترین انتخاب ہے ۔ جو جناب مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو نے کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ [illegible] کا حق ادا کر دیا ہے، یہ انتخاب ملک میں بہت مقبول ہو چکا ہے اور اکثر یونیورسٹیوں نے اسے نصابِ تعلیم میں شامل کر لیا ہے —

مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اب تیسری بار انجمن ترقی اُردو پریس کے اہتمام سے نہایت عمدہ ٹائپ میں چھاپ کر شائع کیا ہے ۔ کاغذ چکنا، بہت عمدہ، حجم دو سو صفحات سے زیادہ، جلد نفیس اور مضبوط ۔ شروع میں فاضل مرتب کا زبردست و دلچسپ مقدمہ ہے، قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے —

—— (قواعدِ اُردو) ——

یہ کتاب جناب معتمد صاحب انجمن ترقی اُردو کی بڑی بھاری تالیف ہے، اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ زبانِ اُردو کے قواعد پر اب تک اس سے بہتر، سہل، جامع کتاب تصنیف نہیں ہوئی ۔ ملک میں بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی اور نہایت مقبول ہوئی ۔ جامعۂ عثمانیہ کے نصاب میں داخل ہے ۔ اب جناب مؤلف و مرتب نے بہت کاوش اور غور سے [illegible] ترمیم و اضافہ کے بعد دوبارہ چھاپی گئی ہے ۔ شروع میں اُردو زبان کی [illegible] پر ایک نہایت بسیط مقدمہ بجائے خود قابل دید ہے ۔ انجمن کے اپنے پریس میں عمدہ ٹائپ میں چھپوائی ہے، کاغذ بہت عمدہ جلد نہایت نفیس اور مضبوط، قیمت مجلد دو روپے ۸ آنے —

—— (جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق) ——

سرکار نظام نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ممالک محروسۂ سرکار عالی کو جاپان کے تعلیمی نظام کے مطالعے اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا ۔ نواب صاحب موصوف نے وہاں رہ کر اس عجیب و غریب ملک کے حالات اور خاص کر تعلیمی نظم و نسق کو لکھ——

مشتہر

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

نہایت غور اور تحقیق سے مطالعہ فرمایا - کتاب کے ابتدائی حصے میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فاضلانہ بحث کی ہے جو ہمارے اہل وطن کے لئے سبق آموز ہے - اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ہے - ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے جو علاوہ دلچسپ ہونے کے پر از معلومات بھی ہے - خاص کر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے جو ملک کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں - حجم ۴۸۲ صفحے - قیمت فی جلد مجلد تین روپے —

—— (سرگذشت حیات (یا) آپ بیتی) ——

اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نشو و نما کی داستان نہایت دلچسپ طور پر بہت ہی سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے - حیات کی ابتدائی حالت سے لیکر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ہے اور تمام تاریخی مدارج کو اس سہل طریقے سے بتایا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سمجھ سکے اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آگئی ہے مگر بیان کی سلاست میں فرق نہیں آیا - یہ کتاب جدید معلومات سے لبریز ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا لازم ہے (حجم ۳۰۰ صفحے) قیمت فی جلد مجلد ۲ روپے ۸ آنے —

—— (تذکرۂ شعرائے اردو)

مولفۂ میر حسن دہلوی - میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں - ان کی مثنوی " بدر منیر " کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو- یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ہے - یہ کتاب بالکل نایاب تھی ' بڑی کوشش سے بہم پہنچا کر طبع کی گئی ہے - میر صاحب کا نام اس تذکرے کی کافی شہادت ہے - اس پر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے جو قابل پڑھنے کے ہے - قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۴ آنے غیر مجلد ایک روپیہ ۶ آنے —

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

—— (تاریخ تمدن) ——

سر ٹامس بکل کی مشہور آفاق کتاب کا ترجمہ ہے - الف سے (ی) تک تمدن کے ہر مسئلے پر اعلیٰ پیمانے سے بحث کی گئی ہے اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے - اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے حصہ اول غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنے - مجلد دو روپے - حصہ دوم مجلد دو روپے -

—— (مکالمات الطبیعات) ——

یہ ترجمہ ہے مشہور انگلستان کے مشہور سائنس داں حکیم ہکسلے کی کتاب کا جس کا نام کتاب دی آف فسانسی ہے - اس میں بظاہر فطرت کی بحث درج ہے لیکن کتاب علم و فضل کا سرمایہ ہے - قیمت غیر مجلد ۲ روپے - مجلد ۲ روپے ۸ آنے —

—— (القول الاظہر) ——

امام ابن مسکویہ کی مشہور تالیف (فوز الاصغر) کا اُردو ترجمہ ہے - یہ کتاب فلسفۂ الٰہیات کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انہیں اصول کو منطبق کیا گیا ہے - قیمت غیر مجلد ۸ آنے - مجلد ایک روپیہ —

—— (القمر) ——

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوئے ہیں ' ان سب کو جمع کردیا ہے - طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے - قیمت غیر مجلد ۱۰ آنے مجلد ایک روپیہ —

—— (فلسفۂ تعلیم) ——

ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلۂ تعلیم کی آخری کتاب ہے - غور و فکر کا بہترین کارنامہ - والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت - تربیت کے قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے - اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے - قیمت مجلد ۲ روپے غیر مجلد ایک روپیہ ۱۲ آنے —

المشتہر

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں) —

—— (دریائے لطافت) ——

ہندوستان کے مشہور سخنور سید میر انشاءاللہ خاں کی تصنیف ہے ۔ اُردو صرف و نحو اور محاورات اور الفاظ کی پہلی کتاب ہے ' اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں ۔ قیمت مجلد ۲ روپے غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنے —

—— (طبقات الارض) ——

اس فن کی پہلی کتاب ہے ۔ (۳۰۰) صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند کئے ہیں ۔ کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی فہرست بھی ملحق ہے ۔ قیمت غیر مجلد ۲ روپے ۔ مجلد دو روپے ۸ آنے —

—— (مشاہیر یونان و روما) ——

ترجمہ ہے ۔ سیرت نگاری اور انشا پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلّم الثبوت چلا آتا ہے ۔ ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمے سے فیض حاصل کیا ہے ۔ وطن پرستی اور بے نفسی عزم و جواں مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے ۔ قیمت جلد اول غیر مجلد ۳ روپے ۔ مجلد ۴ روپے جلد دوم مجلد ۲ روپے ۸ آنے —

—— (اسباق النحو) ——

ملک کے ادیب کامل مولانا حمیدالدین صاحب بی ۔ اے کی تالیف ہے ۔ اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے ۔ قیمت حصۂ اول غیر مجلد ۶ آنے ۔ حصۂ دوم ۴ آنے —

—— (علم المعیشت) ——

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم ۔ اے نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے ۔ معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے ۔ مبہم و مشکل مسائل کو پانی کردیا ہے ' اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں ۔ اشتراکیت کا باب قابل دید ہے ' حجم ۸۸۵ صفحے ' قیمت مجلد ۵ روپے آٹھ آنے —

المشتہر —— مہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ: کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں) —

—— (تاریخ یونان) ——

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ۔ اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے۔ ایف اے کلاس کے طلبا جو یونانی تمدن کی تاریخ سے گھبراتے ہیں، اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے۔ قیمت مجلد ۲ روپے —

—— (رسالۂ نباتات) ——

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے۔ علمی اصطلاحات سے مبرا۔ طلبائے نباتات جو مسائل کو انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اس رسالے میں مطالعہ کریں۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے —

—— (دیباچۂ صحت) ——

اس کتاب میں معاملات صحت پر مثلاً (ہوا، پانی، غذا، لباس، مکان وغیرہ) مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دلپذیر ہے، ملک کی بہترین تصنیف ہے۔ اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا۔ حجم ایک ہزار صفحے۔ قیمت مجلد چار روپے —

—— (نکات الشعراء) ——

یہ اُردو کا تذکرہ استادالشعراء میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہے۔ اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں۔ نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں۔ مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدرالصدور امور مذہبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے —

—— (فلسفۂ جذبات) ——

کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور فلسفی ہے۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ متعلمان نفسیات

المشتہر

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں) —

اس صفحے پانسو کے - قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے - غیر مجلد دو روپے —

—— (وضع اصطلاحات) ——

یہ کتاب ملک کے نامور انشا پرداز اور عالم مولوی وحیدالدین ' سلیم ' مرحوم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور فکر اور مطالعے کے بعد تالیف کی ہے بقول فاضل مؤلف " یہ بالکل نیا موضوع ہے - ہمارے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی زبان میں " - اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں - مخالف و موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی ' مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے سابقوں اور لاحقوں - اردو مصادر اور ان کے مشتقات - غرض سیکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آ گئی ہیں - اردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں- لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کردی ہیں- اور ہمارے حوصلے بلند کردیے ہیں - اس سے پہلے ہم اردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اس کی آئندہ ترقی کے متعلق دعوی کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے - مگر اس کتاب کے بعد یہ اندیشہ نہیں رہا - اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے - تعداد صفحات : (۳۰۵) قیمت مجلد تین روپے ۱۲ آنے —

—— (محاسن کلام غالب) ——

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا معرکۃ الآرا مضمون ہے - اردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے - جو اس شان کی لکھی گئی ہے - یہ مضمون اردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا - صاحب نظر قدر دانوں کے اصرار سے الگ بھی طبع کیا گیا ہے- قیمت مجلد ایک روپیہ

—— (ملل قدیمہ) ——

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے - اس میں بعض قدیم اقوام ' سلطنت کلدانی ' آشوری ' بابل - بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت - عقائد - او صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھ دیے ہیں- اردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس

ایضاً —————————— قیمت

(نوٹ) ڈاک [illegible] الگ دینی ہوں گی) —

ہے کہ قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہوسکیں اس لئے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے ۔ حالات کی وضاحت کے لئے جا بجا تصویریں دی گئی ہیں ۔ صفحے ۲۸۴ قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے —

—— (بجلی کے کرشمے) ——

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی ۔ اے ۔ نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعے کے بعد لکھی ہے ۔ برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی گئی ہے ۔ ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے ، کہاں سے آتی ہے ، کیا کام آسکتی ہے ۔ یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے ۔ اور لڑکوں لڑکیوں کے لئے بہت مفید ہے ۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے —

—— (البیرونی) ——

مصنفہ مولوی سید حسن برنی صاحب بی اے ۔ اس کتاب میں علامہ ابوریحان البیرونی کے سوانحی حالات ہیں اور ان کی مشہور و معروف تصنیف کتاب الہند اور دیگر تصانیف پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے ۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو میں پہلے بھی چھپی تھی اب دوسرا ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی اور اضافہ مضامین کے ساتھ نہایت عمدہ کاغذ پر چھپ کے تیار ہوا ہے ۔ قیمت مع جلد مجلد دو روپے ۔ غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ —

—— (تاریخ ہند) ——

ہندوستان کی یہ تاریخ مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے محکمہ تعلیمات سرکار نظام کی فرمایش پر لکھی ہے اور مڈل اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے ۔ اس وقت تک کوئی اور مختصر تاریخ ہند اس نقطۂ نظر اور ایسی خوبی سے نہیں لکھی گئی ہے ۔ تعلیمی حلقوں کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اسے بہت پسند کیا ہے ۔ چھوٹی سائز کے ۲۸۴ صفحے ۔ قیمت ایک روپیہ ایک آنہ —

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

آنر' ایم' اے' بی ایل' ایف' آر' ایس' چیف سکریٹری گورنمنٹ نظام و مدارالمہام پیشی کی مشہور تصنیف نوٹس آن اسلام کا با محاورہ اور سلیس ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھ موجودہ خیالات سائنس سے اسلام کی تطبیق اور اس کی مطابقت کا پہلو لیا ہے۔ فاضل مصنف نے ان تمام مشکل مسائل کی حقیقت کو جس میں اکثر تعلیم یافتہ جوان یا غیر مسلموں کو شبہات واقع ہوتے ہیں' زمانہ حال کے ترقی یافتہ خیالات کی روشنی میں نہایت دلاویز طریقے اور حکیمانہ استدلال سے بیان کیا ہے جس سے مصنف ممدوح کے وسیع مطالعہ' فلسفیانہ طبیعت اور غور و خوض کا پتہ ملتا ہے —

کتاب بہت عمدہ کاغذ پر چھپی ہے۔ مجلد بارہ آنے میں مل سکتی ہے —

—(تاریخ زوال روما)—

یہ گبن کی مشہور تاریخ کے ابتدائی (۷) ابواب کا ترجمہ ہے۔ اصل کتاب اپنی خوبیوں کے اعتبار سے محتاج تعریف نہیں۔ قیمت فی جلد غیر مجلد سوا روپیہ —

—(تاریخ عرب)—

مصنفہ موسیو سدیو فرانسیسی۔ عربوں کے متعلق یہ کتاب ان تمام تاریخوں کا نچوڑ ہے جو یورپ و ایشیا کے [illegible] کی زبانوں میں مسلمانوں کی ترقیوں اور عربوں کے احسانات کا آئینہ ہے۔ ساتھ ہی یورپ کے کذب و افترا کا بہترین جواب۔ قیمت مجلد چار روپے آٹھ آنے —

—(یادگار غالب)—

یعنی مرزا اسد اللہ غالب دہلوی کے مفصل حالات زندگی اور ان کے کلام نظم و نثر' اردو فارسی پر تفصیلی ریویو اور انتخاب۔ مولفہ شمس العلما مولانا الطاف حسین صاحب 'حالی' مرحوم۔ قیمت مجلد ۳ روپے —

—(شعر و شاعری)—

شمس العلما خواجہ الطاف حسین 'حالی' مرحوم کے اردو دیوان کا لاجواب مقدمہ جس میں شعر و شاعری پر عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ تنقیدی حیثیت سے اردو زبان میں اب تک ایسا مضمون نہیں لکھا گیا ہے قیمت مجلد ۲ روپے غیر مجلد سوا روپیہ —

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

—(موازنۂ انیس و دبیر)—

میر انیس کی شاعری پر تفصیلی ریویو اور میر انیس و مرزا دبیر کا موازنہ - مولفہ مولانا شبلی نعمانی، قیمت فی جلد مجلد چار روپے - غیر مجلد تین روپے —

—(وکرم اُروسی)—

کالیداس کے مشہور ناٹک کا اُردو ترجمہ مع ایک بسیط مقدمے کے جس میں ہندو ڈرامے کی تاریخ اور نوعیت پر مفصل بحث کی گئی ہے - مترجمۂ مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی - اے مرحوم - قیمت مجلد دو روپے - غیر مجلد ڈیڑھ —

—(خطوط شبلی)—

علامۂ شبلی مرحوم کے یہ وہ لاجواب اور نادر خطوط ہیں جو موصوف نے بمبئی کی مشہور تعلیم یافتہ خواتین عطیہ بیگم صاحبہ فیضی اور زہرا بیگم صاحبہ فیضی کے نام وقتاً فوقتاً کمال اخلاص و محبت اور انداز خاص کے ساتھ لکھے ہیں - یہ جواہر پارے اردو میں مولانا کے کمال انشا پردازی کی نایاب یادگار ہیں - طرز نگارش اس قدر لطیف اور پاکیزہ ہے کہ شروع کرکے ختم کئے بغیر کتاب کو چھوڑنا دشوار ہے - شروع میں جناب مولوی عبدالحق صاحب بی - اے معتمد انجمن ترقی اردو کا ایک نہایت لطیف و سلیس شگفتہ مقدمہ بھی شامل ہے، جس نے ان خطوط کے جذبات اخلاص و محبت اور نکات ادبی کو بے نقاب کردیا ہے - مرتبۂ مولوی محمد امین صاحب مارہروی و جناب قیصر بھوپالی - قیمت ایک روپیہ —

—(دیوان غالب مطبوعۂ جرمنی)—

غالب کے کلام کی قدر اور جو مانگ ہے ہر صاحب ذوق جانتا ہے، ان کے دیوان کا ایک نہایت نفاست پسند طبائع کے لئے جرمنی کے مشہور کاویانی پریس میں جامعہ ملیہ نے چھپوایا تھا جو ہاتھوں ہاتھ نکل گیا - دوسری بار پھر اسی اہتمام و نفاست سے طبع ہوا ہے - کتابت، کاغذ، چھپائی، جلد، سائز ہر چیز دیدہ زیب و دلفریب ہے - قیمت چار روپیہ —

—(محشر خیال)—

یہ سید سجاد انصاری مرحوم وکیل بارہ بنکی کے چند ملکی ادبی و اصلاحی

المشتہر

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

(نوٹ) دال ٹھیکری سکہ انگریزی میں ہیں —

مضامین اور نظموں کا مجموعہ ہے جو شرکت ادبیہ دہلی نے خاص اہتمام سے چھپوایا ہے - سجاد انصاری صاحب خوش فکر و خوش گفتار ادیب تھے ' ان کے مضامین میں خاص لذت و ادبیت اور [illegible] میں خاص کیف اور بلند خیالی و جذبات نگاری ہوتی ہے - یہ مجموعہ مرحوم کی [illegible] - ان کی یادگار ہے ' جس کو سید منظور حسنی صاحب نے مرتب کیا ہے - لکھائی چھپائی بہت پاکیزہ ' سائز مختصر ' جلد نہایت نفیس' اور سنہری حروف میں ٹائٹل کا نام بھی لکھا ہے - قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ —

—— (چمن) ——

یہ نہایت خوبصورت مستحسن و جمیل مجموعہ اساتذہ اردو کے پاکیزہ کلام کا انتخاب ہے کارڈ سائز پر نہایت اعلیٰ طباعت و کتابت کے ساتھ عید کے موقعہ پر دوست احباب کو پیش کرنے کے لئے بہترین ادبی تحفہ ہے - قیمت ۵ آنے —

—— (دیوان حالی) ——

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی مرحوم کے قطعات غزلیات ' قصیدے ' مرثیے ' ترکیب بند ' رباعیاں ' تاریخیں اور متفرق اشعار قیمت ڈیڑھ روپیہ —

—— (مٹریکولیشن کا نصاب اردو) ——

مجلس نصاب اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی ہدایت کے مطابق مولانا مولوی عبدالحق صاحب بی - اے (علیگ) آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو نے مرتب کیا - قیمت دو روپے —

—— (معراج العاشقین) ——

حضرت مخدوم ابوالفتح صدرالدین سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز (رح) کی تصنیف ہے - اس میں حضرت کے بعض مواعظ و ارشادات قدیم اردو یعنی دکنی اردو میں لکھے ہیں - مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کی تصحیح و ترتیب اور مقدمہ کے ساتھ چھپی ہے - قیمت ۹ آنے —

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

(وقائع عالمگیر)

حضرت اورنگ زیب سلطان عالمگیر کے وقائع زندگی جو خود ان کے معاصر اور مستند مورخوں کی روایات پر مبنی ہیں۔ اور جن سے ان کے حقیقی کیریکٹر رواداری، عدل پروری اور تصحیح مذہبی کا کافی ثبوت ملتا ہے - مرتبہ چودھری نبی احمد صاحب سندیلوی مجلد ۲ روپے —

(افغان بادشاہ)

اعلیٰ حضرت غازی امان اللہ خاں کی عظیم الشان چشم دید داستان حیات اس کتاب الجواب کو محمد حسین خاں بی۔ اے (علیگ) ڈائرکٹر جنرل پبلک انسٹرکشن افغانستان نے بڑی عرق ریزی سے مرتب کیا ہے، شائقین سیر و تاریخ کے لئے خصوصاً اور کافۂ مسلمین کو عموماً لازم ہے کہ اس کتاب کو غور سے مطالعہ فرماکر استفادہ کریں۔ قیمت فی جلد دو روپے آٹھ آنے —

(پریم پچیسی)

ملک کے مشہور انشا پرداز منشی پریم چند صاحب کے نہایت دلچسپ افسانوں کا مجموعہ۔ حصۂ اول ڈیڑھ روپیہ حصۂ دوم ڈیڑھ روپیہ —

(عروس ادب)

مولوی سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی کے اخلاقی ادبی تاریخی اور سیاسی مضامین کا مجموعہ - حجم ۲۲۴ صفحہ۔ سائز ۲۹ × ۲۰ کاغذ عمدہ سفید، لکھائی چھپائی بہت خوشنما - قیمت فی جلد دو روپے —

(خیالات ارونگ)

مشہور امریکی مصنف واشنگٹن ارونگ کے بعض دلچسپ مضامین کا با محاورہ اردو ترجمہ از مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا وکیل غازی آباد ضلع میرٹھ قیمت ۸ آنے —

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

——(سیر المصنفین)——

جس میں مصنفین اردو کے حالات زندگی اور اردو زبان کی عہد بعہد کی ترقی و تبدیلی کا ذکر کیا گیا ہے مصنفہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔اے (علیگ) قیمت ۵ روپے —

——(مظلوم بیوی)——

مشہور و دلچسپ مغربی ناولسٹ آر۔ ایچ۔ اول کے ایک نہایت دلچسپ انگریزی ناول "ہز سکنڈ لیو وائف" کا اردو ترجمہ از مولوی عباس حسینی صاحب "الطافی" قیمت ۱۲ آنے —

——(خواتین انگورہ)——

مولانا ملا توحیدی صاحب۔ ترکی کی مشہور و معروف خواتین کے کارنامے۔ اس کتاب سے آپ کو معلوم ہوگا کہ موجودہ جد و جہد میں ترکی خواتین نے کس جوش اور قابلیت سے حصہ لیا ہے۔ قیمت ۱ روپیہ —

——(جہاں آرا بیگم)——

جہاں آرا بیگم بنت شاہجہاں کی سوانح عمری جو نہایت مستند تاریخوں سے لکھی گئی ہے۔ مولانا مولوی ضیاء الدین احمد برنی صاحب بی اے قیمت ۸ آنے —

(دار المصنفین اعظم گڑھ)

		سیرۃ النبی حصہ سوم	۹ روپیہ
تاریخ فقہ	۳ روپیہ	شعر العجم مکمل ۵ حصے	۱۳ روپیہ
خلفائے راشدین	۳ روپیہ ۸ آنہ	الکلام	۲ روپیہ
مہاجرین	۴ روپیہ	اسوۂ صحابہ مکمل دو حصے	۸ روپیہ
سیرۃ النبی حصہ اول	۳ روپیہ	انقلاب الامم	۲ روپیہ
سیرۃ النبی حصہ دوم	۳ روپیہ ۸ آنہ	مکالمات برکلے	[illegible] روپیہ

المشتہر ———————— مہتمم

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں ۔

سیر الصحابیات	۲ روپیہ ۳ آنہ	تاریخ ہند قدیم	۱ روپیہ
روح الاجتماع	۲ روپیہ	(الناظر پریس ۔ لکھنؤ)	
ابن رشد	۲ روپیہ	افسانۂ جوش	۱ روپیہ
گل رعنا	۵ روپیہ	مجموعۂ قصائد مومن	۱۲ آنہ
سیر الانصار حصہ اول	۳ روپیہ ۸ آنہ	گوتم بدھ	۳ آنہ
سیر الانصار حصہ دوم	۳ روپیہ ۸ آنہ	مسالک الناظر فی الموت	
شعر العجم حصہ اول	۴ روپیہ	سود المعشر	۴ آنہ
شعر العجم حصہ دوم	۳ روپیہ	حکایۂ لیلیٰ مجنوں	۴ آنہ
(جامعۂ ملیہ دہلی)		مقتل ابو مخنف مترجمہ محمد خالد	۶ آنہ
تاریخ نجد	۱ روپیہ	وکرم اروسی	۱ روپیہ ۸ آنہ
عرب کا تمدن	۲ روپیہ ۸ آنہ	فلسفیانہ مضامین عبدالماجد صاحب	
تاریخ فلسفۂ اسلام	۲ روپیہ		۱ روپیہ ۸ آنہ
تاریخ اندلس	۲ روپیہ	تاریخ عرب مجلد	۷ روپیہ ۸ آنہ
سیرۃ الرسول	ڈیڑھ روپیہ	موازنۂ انیس و دبیر	۳ روپیہ
خلافت راشدہ	۲ روپیہ	مقدمۂ شعر و شاعری	۱ روپیہ ۴ آنہ
خلافت بنی امیہ	ڈیڑھ روپیہ	اصول الفسخ	۹ آنہ
خلافت عباسیہ	۲ روپیہ	مسلمانان اندلس	۱ روپیہ
خلافت عباسیۂ بغداد	۲ روپیہ	اسرار رنگون	۱ روپیہ
خلافت عباسیہ مصر	۲ روپیہ	خوان دعوت	۱ روپیہ
مبادی معاشیات	۱ روپیہ	مصنوعی شوہر	۲ آنہ
دنیا کے تسلی والے	۴ آنہ	الاحسان	۸ آنہ
قواعد عربی	۲ روپیہ	ارض نیوریں	۴ آنہ
اسلامی تہذیب و طرز تعلیم	۴ آنہ	حواس نظامی	۴ آنہ
ترکوں کی کہانیاں	۴ آنہ	خطاب	۴ آنہ

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۔ دکن

نوٹ: کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

مقالۂ تنقید	۴ آنہ	انتخاب زریں مجلد	۲ روپیہ
قواعد اسمی	۳ آنہ	قصائد ذوق	۲ روپیہ
(نظامی پریس بدایوں)		مراثی انیس جلد اول مجلد	۱۰ روپیہ
قاموس المشاہیر جلد اول	۶ روپیہ	مراثی انیس جلد دوم قسم دوم	۸ روپیہ
قاموس المشاہیر جلد دوم	۶ روپیہ	(تصانیف نورالہی و محمد عمر صاحبان)	
نقش غالب مجلد	[illegible] روپیہ	موجودہ لندن کے اسرار	۱ روپیہ ۴ آنہ
دیوان غالب مترجم مجلد	۲ روپیہ ۸ آنہ	ناٹک ساگر (یعنی دنیا کے ڈراما کی تاریخ)	
دیوان حالی صاحب مجلد	ڈیڑھ روپیہ	مجلد ۳ روپیہ غیر مجلد	۲ روپیہ ۸ آنے
دیوان درد	۱ روپیہ ۴ آنہ	[illegible]	۸ آنہ
دیوان غالب (قاموسی ایڈیشن) ڈیڑھ روپیہ		[illegible] کی موت	۴ آنہ
خطوط سر سید قسم اول	۳ روپیہ	قزاق	۸ آنہ
خطوط سر سید قسم دوم	۲ روپیہ	بگڑے دل	۸ آنہ
[illegible] مجلد	۱ روپیہ ۸ آنہ		

ال——————مشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

تاریخ

تاریخ و تراجم اور آثار و حقائق کا سہ ماہی رسالہ

(ایڈیٹر)

[حکیم سید شمس اللہ قادری]

(۱) رسالے کے حسب ذیل مقاصد ہوں گے۔ (۱) تاریخ و تراجم اور آثار و حقائق پر تحقیقی مضامین شائع کرنا (۲) تاریخ کے تاریک پہلو پر روشنی ڈالنا۔ (۳) اسلاف کے آثار و حقائق سے اہل ملک کو واقف کرانا (۴) تبصروں کے ذریعے بلند پایہ تصنیفات سے اردو خواں طبقے کو روشناس کرانا —

(۲) اُن مباحث کی جانب زیادہ توجہ کی جائیگی جن کا تعلق اسلام اور ہندوستان و دکن سے ہو گا —

(۳) غیر زبانوں سے بہترین مضامین کے ترجمے یا ان کے اقتباس بھی شائع کئے جائیں گے —

(۴) رسالہ سال میں چار بار ' جنوری - اپریل - جولائی - اور اکتوبر میں شائع ہو گا۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک —

مضامین اور خریداری کی درخواستیں ایڈیٹر کے نام ذیل کے پتے پر آنا چاہئے۔

حکیم سید شمس اللہ قادری - ایڈیٹر رسالہ تاریخ - کوٹلہ اکبر جاہ - حیدرآباد دکن

رسالہ اردو کے خریداروں کے ساتھہ خاص رعایت

رسالۂ اردو کے خریداروں کو انجمن ترقی اردو کی شائع کی ہوئی کتابیں فی روپیہ چار آنے کمی قیمت کے ساتھہ دی جائیں گی - امید ہے کہ ناظرین اس رعایت سے فائدہ اٹھائیں گے -

دیگر مقامات کی کتابیں جو بطور ایجنسی انجمن میں فروخت ہوتی ہیں ان کی قیمتوں میں کوئی کمی نہیں کی جا سکتی -

---

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

انجمن ان مہربان معاونین کی فہرست مرتب کر رہی ہے جو اس بات کی عام اجازت دیدیں کہ آئندہ جو کتاب انجمن سے شائع ہو ' وہ بغیر ان سے دوبارہ دریافت کئے ' تیار ہوتے ہی ان کی خدمت میں بذریعہ وی پی روانہ کردی جایا کرے - امید ہے کہ قدردانان زبان اردو ہمیں عام طور پر اس قسم کی اجازت دیدیں گے کہ ان کے اسماے گرامی اس فہرست میں درج کر لئے جائیں اور انجمن سے جو نئی کتاب شائع ہو ' فوراً بغیر دریافت کئے روانہ کردی جایا کرے - یہ انجمن کی بہت بڑی مدد ہوگی اور آئندہ اسے نئی نئی کتابوں کے طبع کرنے میں بڑی سہولت ہوجاے گی - امید ہے کہ ہمارے وہ معاونین جو اردو کی ترقی کے دل سے بہی خواہ ہیں ' اس اعانت کے دینے میں دریغ نہ فرمائیں گے -

ان معاونین کی خدمت میں کل کتابیں جو آئندہ شائع ہوں گی وقتاً فوقتاً چوتھائی قیمت کم کر کے روانہ ہوں گی -

المشتہر

معتمد انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد (دکن)